تحقیقِ بہاولپور

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر

فارمر ہیڈ آف ڈیپاٹمنٹ ہسٹری

ایس ای کالج بہاولپور

پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حُسین گیلانی

ڈین فیکلٹی آف لاء

چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف پاکستان سٹڈیز

تحقیقِ بہاولپور

پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حُسین گیلانی
ڈین فیکلٹی آف لاء
چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف پاکستان سٹڈیز

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر
فارمر ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہسٹری
ایس ای کالج بہاولپور

فہرست مقالات جات

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
4	انتساب	1
6	پیش لفظ	2
8	تحقیق بہاول پور	3
11	تبصرہ	4
13	تبصرہ	5
15	ریاست بہاول پور ایک فلاحی ریاست	6
29	ریاست بہاول پور کے نظمِ مملکت کا جائزہ	7
68	ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست بہاولپور کے باہمی تعلقات کا جائزہ	8
89	ریاست بہاول پور کے حکومت پاکستان سے طے پائے جانے والے معاہدات کا جائزہ	9
106	ریاست بہاول پور کے علی گڑھ سے تعلقات کا جائزہ	10
128	نواب صادق محمد خان خامس اور قائداعظم کے باہمی تعلقات کا جائزہ	11
163	درگاہ چاچڑاں شریف اور دربار بہاول پور کے باہمی تعلقات کا جائزہ	12
167	ریاست بہاولپور کی علمی خدمات کا جائزہ	13
190	ریاست بہاول پور میں اُردو بطور سرکاری زبان	14
218	خطہ بہاولپور کی تہذیبی اور ثقافتی روایات	15
223	ریاست بہاول پور کے شاہی کتب خانے	16
229	ضلع رحیم یار خان کی کہانی، ماخذات کی زبانی	17
254	تحریک پاکستان کا ایک خاموش کارکن	18
257	تاریخ ریاست بہاول پور کی ابتدائی اردو کتب کا جائزہ	19

انتساب

جناب انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب صاحب
وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے نام،
جن کی خطہ بہاول پور کی علمی ترقی سے متعلق
کاوشیں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب: تحقیق بہاول پور

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر

پبلشر: البدر کتاب گھر یونیورسٹی چوک بہاول پور

سن اشاعت: فروری 2023

تعداد کتب: 500

قیمت: 500روپے

کمپوزنگ: محمد اصفہان

سرورق: حافظ عبد الرشید

پرنٹر: یونیورسٹی پرنٹنگ پریس

پیش لفظ

جب میں نے بطور وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور کا چارج لیا تو مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ریاست بہاولپور کے حکمرانوں کا بہاولپور پہ بالعموم اور اسلامیہ یونیورسٹی پہ بالخصوص بہت حق ہے کیونکہ ان کے احسانات ان گنت ہیں۔ اسی وجہ سے صادق چیئر جو شعبہ مطالعہ پاکستان کا ایک دیرینہ مطالبہ تھا اسے عملی جامہ پہنایا۔ اور اس چیئر میں بہاول پور سے منسلک مورخین اور دانشورین کو شامل کیا۔ اور وہ تمام لوگ ہیں جنھوں نے براہ راست اس کے قیام سے لے کر اب تک نہ صرف نواب صاحب کی خدمات کا احاطہ سیمینارز کی صورت میں انکی سالگرہ اور برسی کے موقع پر کیا بلکہ ان کی خدمات کو ضبط قلم میں بھی لائے۔ اسی حوالے سے اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ تعلقات عامہ اور پرنٹنگ پریس کے اشتراک سے پہلے ایک کتاب آچکی ہے جس میں بہاول پور سے متعلق مختلف مورخین کے مضامین ہیں۔ اب ایک اور کتاب " تحقیق بہاول پور" پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی چیئرمین شعبہ پاکستان اسٹڈیز، ڈین فیکلٹی آف لاء اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر سابق صدر شعبہ تاریخ گورنمنٹ ایس ای کالج بہاول پور کی مشترکہ کاوش کو عملی جامہ دینے کے لیے اسے بھی شعبہ تعلقات عامہ اور پرنٹنگ پریس کے اشتراک سے شائع کیا جارہا ہے۔ دونوں مورخین ریاست بہاول پور سے متعلق ایک مستند نام رکھتے ہیں۔ دونوں کی ڈاکٹریٹ بھی ریاست بہاول پور کے موضوعات پر ہے۔ اور اس کتاب " تحقیق بہاول پور" میں بھی ان کے پہلے سے شائع شدہ مختلف مضامین کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دی گئی ہے جس میں تاریخ، تعلیم، صحت، رفاہ عامہ، عدل وانصاف، پولیس اور دیگر موضوعات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ میری نظر میں یہ کتاب تمام طلباء وطالبات اور دیگر متلاشیان علم کے لیئے ایک بہت مفید اضافہ ثابت ہو گی اور ان دونوں مصنفین کے یہ مشترکہ مضامین جو پہلے ہی (HEC) کے منظور شدہ جرنلز میں شائع ہو چکے ہیں۔ کتابی شکل میں

محفوظ ہو جائینگے اور اس سے بہاولپور پر تحقیق کے لیے تمام محققین کے لیے آسانی پید اہو جائیگی۔ اس کتاب میں کم و بیش تمام موضاعات جس میں عدل وانصاف، علم و صحت رفاہ عامہ، تہذیب و ثقافت اور ریاست کا پاکستان سے الحاق تمام شامل ہے جن کا احاط کیا گیا ہے دونوں مصنیفین مورخین کی بہاولپور کی تاریخ پر خاص دسترس ہے اور میں ان کی کامیابی کے لیئے دعا گو ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی یہ تحقیق و تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں گے، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔

پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب، وائس چانسلر

تحقیق بہاول پور

سر زمین بہاول پور کو پاکستان میں جو اہمیت حاصل ہے۔ اسے کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ اہمیت جغرافیائی لحاظ سے بھی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی ہے سیاسی اور معاشرتی نقطہ نظر سے بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بر صغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے موقع پر اس کی حدود میں واقع تمام چھوٹی بڑی 562 ریاستوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں شمولیت اختیار کر سکتی ہیں اور اگر چاہیں تو اس کی بجائے اپنی علیحدہ حثیت بر قرار رکھ سکتی ہیں۔ اس دور میں ریاست بہاول پور اس لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھی کہ جغرافیائی طور پر وہ ہندوستان کے اس حصے میں واقع تھی کہ وہ دونوں مملکتوں میں سے کسی کے ساتھ بھی شمولیت اختیار کر سکتی تھی اور اس مقصد کے لیے بھارتی رہنماؤں اور کانگریس پارٹی کے لیڈروں نے بہاولپور ریاست کے حکمران پر دباؤ بھی ڈالا۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ اس وقت یہاں کے حکمران عباسی خاندان کے چشم وچراغ نواب صادق عباسی (پنجم) تھے جو صیح معنوں میں حکمران تھے جنھوں نے اپنے آباؤ اجداد کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھا ہوا تھا اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بے شمار کام کیے اور یہ کام نہ صرف ریاست بہاول پور کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ بر صغیر کے تمام مسلمانوں کے مفاد کے لیے تھے جس کا احساس علامہ اقبال کو ہمیشہ رہا اور اس کو انھوں نے اپنی شاعری میں سراہا بھی ہے۔ قائد اعظم ہمیشہ معترف رہے کہ ریاست اور ان کے حکمران نے قیام پاکستان کے موقع پر لازاوال کردار ادا کیا یہی وجہ ہے کہ بہاول پور ان اولین ریاستوں میں شامل ہے جنھوں نے سب سے پہلے پاکستان مین شمولیت کا فیصلہ کیا اور بعد میں وحدت مغربی پاکستان کے قیام کے موقع پر ریاست کو مکمل طور پر ضم بھی کر دیا گیا تھا۔ اس خطے کے عوام سابقہ حیثیت کی بحالی کے لیے مسلسل کوشاں رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کی تاریخ، سیاست معشیت اور تہذیب وثقافت کے تذکرے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے اور اس

خطے کے مسائل کو صیح انداز میں سمجھا جائے۔ اس ریاست کا وجود تقریباً ڈھائی سو سال رہا اس عرصے میں یہاں کے حکمرانوں نے اس خطے اور برصغیر کے مسلمانوں کے مفاد میں بہت اہم خدمات انجام دیں اور لوگوں کی فلاح و بہود کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے اس ریاست کی ہر دور میں اپنی انفرادیت برقرار رہی۔ ان تمام معاملات پر تحقیق کرنے اور ان کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں بہت سے اہل علم نے کام کیا ہے۔ تاہم پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر کی تحقیقی خدمات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ جس طرح میر تقی میر نے دہلی سے تعلق پر فخر کرتے ہوئے اسے دلی جو ایک شہر تھا۔ یہی حیثیت ریاست بہاول پور ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی اور ڈاکٹر محمد طاہر ریاست بہاول پور کی تاریخ، معاشی سیاسی، تہذیبی، مذہبی اور علمی ادبی دور کے تحفظ اور تحقیقی نتائج کو عام کرنے اور ہمیشہ کے لیئے محفوظ کرنے کے سلسلے میں انتہائی دقیع اور قابل قدر کام کیا ہے اور آئندہ کا کوئی مؤرخ یا محقق ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان دونوں اصحاب و دانش نے اپنے آپ کو خطہ بہاول پور سے متعلق تحقیق کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ ذاتی طور پر ان کے پی ایچ ڈی سطح کے مقالات اور تحقیقی مضامین بہاول پور کی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین بہاول پور کی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالات اور مضامین پاکستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ امر انتہائی خوش آئند اور قابل ستائش ہے کہ ان سب مضامین کو یکجا کر کے زیر نظر کتاب کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس طرح بہاول پور سے متعلق ایک مبسوط اور مستند دستاویز سامنے آگئی ہے۔ جس میں اس خطے کی تاریخ، معاشرت، سیاست، تہذیب و ثقافت، رسم و رواج، آئین و قانون، اصلاحات اور یہاں کے لوگوں کو درپیش مسائل پر بھی بطریق احسن روشنی ڈالی گئی ہے۔ یقیناً پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اور بہاول پور سے متعلق عام معلومات اور تحقیقی معاملات

میں ایک انتہائی مستند اور معتبر دستاویز اور ماخذ سمجھا جائے گا۔ اس ضمن میں پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر صاحب کو میں مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے انتہائی محنت اور عرق ریزی سے لکھے گئے اپنے تحقیقی مضامین اور مقالات کو نظر ثانی کے بعد یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ بلاشبہ ان کی اس کاوش کو عوامی اور علمی حلقوں میں بہت پزیرائی حاصل ہو گئی اور مستقبل کے محققین کے لیے رہنما ہو گی۔

پروفیسر ڈاکٹر حمید رضا صدیقی

تبصرہ

ریاست بہاول پور بر صغیر کی 562 ریاستوں میں وہ پہلی ریاست تھی جو قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں شامل ہوئی۔ نہ صرف اس ریاست نے پاکستان کے ساتھ انضمام کا اعلان کیا بلکہ عملاً پاکستان کی مالی امداد بھی کی۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ سب سے اہم ریاست تھی اگر خدانخواستہ یہ پاکستان کا حصہ نہ بنتی تو پاکستان کے چاروں صوبوں کا ملاپ ممکن نہ تھا۔ اس 200 سال تاریخی ریاست کے نوابین کا دور زریں دور تھا خاص طور پر آخری تین نوابین کا دور ریاست کی خوشحالی کا ضامن دور تھا۔ نواب صادق محمد خاں کا دور میں صادق ایجرٹن کالج 1886ء میں بنا جبکہ نواب بہاول خاں خامس کے دور میں 1906ء میں بہاول وکٹوریہ ہسپتال بنا۔ مگر سب سے اچھا دور آخری نواب صادق محمد خاں خامس کا 1924ء تا 1947ء کا ہے جس میں ستلج ویلی پراجیکٹ مکمل ہوا پھر 1924ء میں ہی صادق ریڈنگ لائبریری بنی۔ ان کے ہی دور میں 1925ء جامعہ الازہر کی طرز پر جامعہ عباسیہ بنی۔ ان نوابین کی خدمات اور ریاست کی تاریخ وثقافت نیز تعلیم اور عدل وانصاف کے لیے کیے گئے اقدامات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بہاول پور کے دو مورخین پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر سابق صدر شعبہ تاریخ گورنمنٹ ایس ای کالج بہاول پور اور پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی چیئرمین شعبہ مطالعہ پاکستان اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور نے اپنے ہی کچھ پہلے سے شائع شدہ مضامین کو کتابی شکل دے کر چھپوانے کا منصوبہ بنایا ہے۔

یہ دونوں مؤرخین بہاول پور کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور محبان ریاست بہاول پور ہیں۔ ان کی دو کتابیں پہلے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ دونوں نے بہاول پور سے متعلق موضوعات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر رکھی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر نے بہاؤالدین زکریا ملتان یونیورسٹی سے ریاست بہاول پور کے نظم مملکت پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ جبکہ پروفیسر ڈاکٹر آفتاب

حسین گیلانی نے اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور سے ریاست بہاول پور کا نظام عدل پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر نے اپنی ذاتی لائبریری سے سینکڑوں لوگوں کو مواد کی فراہمی کر کے ریاست بہاول پور سے متعلق تحقیق کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ جبکہ پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی کا یہ کریڈٹ ہے کہ انہوں نے بطور صدر شعبہ مطالعہ پاکستان میں بی ایس، ایم اے اور ایم فل لیول پروگرامز تک ریاست بہاول پور سے متعلق پیپرز سلیبس میں شامل کر کے نوجوان نسل کو اس ریاست کی تاریخ اور ان کے حکمرانوں کی نمایاں خدمات فراہم کی ہیں۔ میں ان دونوں کی مزید کامیابی کے لیے دُعا گو ہوں۔

سید تابش الوری

صادق چیئر اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور

تبصرہ

خطہ بہاول پور کا تہذیبی روایات کا تعین ڈاکٹر محمد طاہر اور پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی مصنفین کی تحقیق کی روشنی میں خطہ بہاول پور اپنا ایک الگ تہذیبی و تاریخ تشخص رکھتا ہے۔ صدیوں کی تہذیبی وارثت کا امین محبتوں کے خمیر سے گندھا ہوا اور عظمتوں کا گھوارہ ہے۔ خطہ امن و آشتی کا قریہ قریہ علم و ادب کا سنگ میل رہا ہے اس میں صدیوں کی تاریخ سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ پتن سارا، سوئی وہار اور گنویری والہ کے دامن میں زمانہ کروٹیں لے رہا ہے۔ جو کہ ریاست کا وجود اور نوابین اس دھرتی کی آبیاری میں نمایاں رہے ہیں۔ لوک گیتوں، اساطیری خوشبوؤں سے معطر اور سر سبز شاداب فصلوں دریاؤں اور صحراؤں سے مزین یہ دھرتی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ علمی، تعلیمی اور ادب کی فضاؤں میں پیش پیش رہنے والا بہاول پور برصغیر کے تمام علاقوں میں انفرادیت کا حامل رہا ہے۔ ریاست بہاول پور کے انسان دوست، علم دوست رہنماؤں نے جہاں فلاحی کاموں میں بیش بہا خدمات سر انجام دی ہیں وہاں عالیشان محلات کی تعمیر سے اس سرزمین کو جنت نظیر بنایا بلکہ یہاں کی تعلیمی پسماندگی کو بھی ختم کر کے برصغیر میں ایس ای کالج، طبیہ کالج، جامعہ اسلامیہ اور دیگر اداروں کی بنیاد رکھی۔ علاج معالجے کے لئے بہاول وکٹوریہ ہسپتال اور ریاست میں سفری سہولتوں کے لئے ریلوے مربوط جال بچھایا۔ یوں یہ ریاست پورے خطے میں خوشحالی کی ضامن سمجھی جاتی رہی بہاول پور کی تاریخ، عدل، حکمرانی تہذیب وثقافت اور ادب کے حوالے سے قابل ذکر تحقیق کام ہو چکا ہے۔ اس تحقیقی کام میں دو معتبر ہستیوں کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان میں ایک پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر ہیں جو گورنمنٹ ایس ای کالج میں شعبہ تاریخ سے وابستہ رہے ہیں اور حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں اور دوسرے پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی ہیں جنہوں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں شعبہ پاکستان سٹڈیز میں تاریخ بہاولپور کو سلیبس میں شامل کیا بلکہ ریاستی

امور حکومت کے حوالے سے تحقیق کر کے خود کو اپنی تحقیق کا اعتبار دیا ہے۔ ان دونوں محققین نے اپنے اپنے شعبوں میں اپنی خدمات کے سبب تابندہ ہیں۔ بہاول پور کی تاریخ، عمارات مدرسے، محلات اور یہاں کے شب روز پر پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر کا کام مستند ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے بہاول پور سے متعلق مضامین تحریر کیئے ہیں جو نہ صرف تاریخ سمجھنے والوں کے لئے بلکہ طالب علموں کے لیئے بھی مفید ثابت ہوں گے۔ اپنے مضامین میں انہوں نے ایسے ایسے گوشوں کو روشناس کرایا ہے جو اب تک سامنے نہیں آئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں ان کی یہ سعی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اس سر زمین کے دریا جنہیں، ہاکڑہ، سرسوتی یا ستلج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کی قدامت کا ذکر رگ وید میں درج ہے جو چار ہزار سال پہلے کے واقعات پر مشتمل ہے یوں اس خطے کی شادابی، خوشحالی اور زندگی کے متحرک ہونے کا ثبوت ہے۔ ان تمام حقائق اور تحقیق کی روشنی میں بہاول پور کی تاریخی تہذیب کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے ان کے بہاول پور سے متعلق مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت چھان بین سے اپنے موضوت کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ صحرا ریگ زار کے چھپے ہوئے گوشوں کو اپنے دلکش انداز میں احاطہ تحریر میں لانے کا ہنر جانتے ہیں۔ عدل و انصاف، حکومتی امور اور ریاستی حکمرانی کے امور کو انہوں نے طویل عرصے کی دستاویزات سے کشید کر کے عام لوگوں تک رسائی دے دی ہے۔ اس سے یہاں کی سماجی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور انسانی رویوں سے بھی آگہی حاصل ہوتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر اور پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حسین گیلانی کی اس مشترکہ کاوش پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کتاب کی اشاعت سے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو بہت فائدہ ہو گا۔ اللہ کرے ان کا زور قلم اور زیادہ ہو۔

پروفیسر ڈاکٹر نواز کاوش، صدر شعبہ اردو

ریاست بہاول پور ایک فلاحی ریاست

ایسی ریاست جس میں عوام و خواص کے جان و مال اور عزت و احترام کی ذمہ داری ریاست کی ہو فلاحی ریاست کہلاتی ہے۔ دنیا میں حقیقی فلاحی ریاست کا تصور سب سے پہلے نبی کریم ﷺ نے دیا۔ پہلی اسلامی فلاحی ریاست کو مثال بنا کر رسول پاک ﷺ کے جانشینوں نے نیکی اور فلاح کے تصور کو آگے بڑھایا۔ ریاست بہاول پور انہی اسلامی اور فلاحی ریاستوں میں سے ایک تھی جو تقسیم ہندوستان تک آزاد اور خود مختار رہیں۔

ریاست کے حکمرانوں کا نصب العین عوام کی خدمت تھا جس سے رعایا کو معاشی و معاشرتی انصاف ملا۔ کیونکہ ریاست کے حکمران ہمیشہ اسلام سے لگاؤ رکھنے والے اور روادار تھے۔ خود ریاست کا بانی نواب صادق محمد خان اول اسلام دوست اور بزرگان دین سے گہری عقیدت و محبت رکھنے والا تھا۔ ریاست بہاول پور کی مزہبی، ثقافتی اور فلاحی اقدار کو بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بھی قائم رکھا جس سے ریاست کے باشندوں کے عادات واطوار اور طرز زیست میں نمایاں تبدیلی آئی۔ نوابین ریاست نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیم ، صحت، آبپاشی، معاشرتی اور معاشی انصاف کی فراہمی کے لیے بھی قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ خصوصاً مساجد و مدارس کی تعمیر و ترقی میں اس قدر حصہ لیا کہ ریاست بہاول پور کے لوگوں کی روزمرہ زندگی میں شائستگی کا عنصر داخل ہو گیا۔ عام گفتگو میں لوگوں کا پسندیدہ محاورہ "غریب نواز" تھا یوں بھی ریاستی حکومت ہمیشہ غریب نواز اور علم برور رہی اور اسی کو دیکھتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے تحریر کیا ہے کہ "اگر ریاست بہاول پور کی اعانت حاصل نہ ہوتی تو بر صغیر پاک وہند کا عظیم ادارہ ندوۃ العلماء خواب سے کبھی حقیقت نہ بن سکتا۔ "ریاست بہاول پور علمی میدان میں انتہائی پس ماندہ تھی۔ تعلیم عامہ کے لیے سرکاری سطح پر کو ئی ادارہ یا محکمہ نہ تھا اور نہ کبھی اس کی ضرورت محسوس کی گئی ریاست کا مغربی حصہ سندھ سے ملحق تھا

۔ ٹھٹھ جیسا علمہ وتہذیب کا مرکز شہر بھی آباد تھا۔ ریاست میں اوچ شریف ہی ایک ایسا شہر تھا جسے "مدتوں برصغیر پاک وہند میں قدیم تاریخ ساز دانش گاہ کی حیثیت حاصل رہی۔ اس خطے میں جہاں ایک جانب سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستانیں رقم ہوئیں وہاں علم و عرفان کے سوتے پھوٹتے رہے جن سے تشنگان علم فیضیاب ہوے رہے اور جس نے اس خطہ کو علم کی رہوشنی سے منور کر دیا۔ ۱۸۶۶ء سے قبل بہاول پور میں تعلیم وتربیت کے باقاعدہ اداروں یا کسی وزارت تعلیم کو وجود نظر نہیں آتا البتہ جب سی سی منچن کو ریاست میں سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا اور مسٹر فورڈ ملتان میں کمشنر مقرر کیے گئے تو دینیات، عربی قواعد اور فارسی کی تعلیم دینے والے مدارس کی حوصلہ افزائی شروع ہوئی۔ ۱۸۵۸ء میں میجر منچن نے اٹھارہ پرائمری سکول قائم کیے۔ ۱۸۷۱ء میں اساتذہ کی تربیت کے لیے ایک نارمل اسکول کھولا گیا۔ جس کا نام مدرستہ المعلمین رکھا گیا۔ اور سید چراغ شاہ اس کے پہلے صدر مدرس تھے۔ ان ابتدائی تعلیمی اداروں کا مقصد یہ تھا کہ ریاستی عوام کے اندر تعلیم کا شوق اور شعور اجاگر کیا جائے۔ لہٰذا عوام کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے اور ریاست میں نئے مدرسوں کے قیام کے سلسلے میں ۱۸۸۲ء میں ریاست میں پہلی مرتبہ ایک ایجوکیشنل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی کی تجاویز پر چار ابتدائی مدارس کو جو بہاول پور، احمد پور شرقیہ، منچن آباد اور خان پور میں تھے انگریزی مڈل سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ ۲ مڈل اسکول خیر پور اور نوشہرہ میں قائم کیے گئے اور ایک پرائیوٹ اسکول صادق آباد میں کھولا جو کہ امراء کے بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرح مغربی تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ۱۸۷۹ء میں ریاست بہاول پور میں ایک دینی درسگاہ قائم کی گئی جسے سرکار کی زیر سرپرستی مدرسہ صدر دینیات کا نام دیا گیا اور مولانا خلیل احمد سہارنپوی کو اس درسگاہ کا سربراہ بنایا گیا۔ یکم اگست ۱۸۹۱ء میں بہاول پور میں ایک زنانہ گورمکھی مدرسہ جاری ہوا۔ پہلے دن افتتاحی تقریب کے ساتھ گیارہ لڑکیاں اس مدرسہ میں داخل

ہوئیں۔ ۱۸۸۶ء میں ایجرٹن ہائی اسکول کو صادق ایجرٹن کالج میں تبدیل کر دیا گیا اور اس میں ایف اے کی کلاسیں شروع کی گئیں۔

مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم پر بھی توجہ دی گئی اور ان کے لئے پہلی مرتبہ ۱۸۸۴ء میں بہاول پور میں مدرسہ نسواں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ایک مدرسہ صادق آباد میں قائم کیا گیا۔ یہ مدرسہ خواتین کی گھریلو صنعتی تعلیم کے لیے تھا۔ اس میں سلائی اور بنائی کی تعلیم دی جاتی تھی اور ساتھ ہی درسی کتب بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ اسی دور میں ایک اور مدرسہ نسواں بہاول پور میں خصوصی طور پر ہندو لڑکیوں کے لیے کھولا گیا۔ اس کے علاوہ عام تعلیم کے ساتھ ساتھ محدود پیمانے پر پیشہ ورانہ اور جسمانی تعلیم کا آغاز بھی کیا گیا اور ۱۸۹۸ء میں ایک مدرسہ پٹوار ریاست میں کھولا گیا۔ نوابین کی تعلیم میں دلچسپی کی بدولت عوام میں تعلیم کا رجحان بڑھتا گیا اور اسی دور میں نواب بہاول پور خاں خامس نے بہاول پور کے انتظامی ڈھانچے کو مزید مستحکم کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ وہ ریاست کے طول و عرض کا دورہ کرتے رہے۔ ریاست کے مختلف امور میں اپنی ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنے مختصر دور حکومت میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ ان کی خواہش تھی کہ بہاول پور کا شمار برصغیر کی ترقی یافتہ ریاستوں میں ہو۔ چنانچہ انہوں نے یتیم خانوں، کالجوں اور ہسپتالوں کی عمارات تعمیر کروائیں۔ اس کے علاوہ نہریں بھی کھدوائیں۔ انہوں نے برصغیر کے تمام مسلم اداروں کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ وہ پہلے حکمران تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں ریاست کی خوشحالی کی اسکیموں پر کما حقہ توجہ دی۔ عوام میں تعلیمی شعور عام کرنے کے لئے ۱۹۲۴ء میں آخری نواب صادق محمد خان خامس کی رسم تاج پوشی کے موقع پر ایک پبلک لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کا نام صادق ریڈنگ لائبریری تجویز ہوا۔ نواب صادق محمد خان خامس نے لائبریری کے لیے ۸۸ کنال ۱۳ مرلے قطعہ اراضی بطور عطیہ عنایت فرمایا۔

نواب صادق محمد خان خامس کو ۱۹۲۴ء میں مکمل اختیار ملے چونکہ وہ ایچی سن کالج کے تعلیم یافتہ تھے اس لیے جدید تعلیم کی اہمیت و افادیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے دور میں تعلیمی ترقی کے لیے نمایاں کوششیں ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں مڈل اسکول احمد پور شرقیہ کو ترقی دے کر ہائی اسکول کا درجہ دے دیا گیا۔ اسی سال جامعہ الازہر کے معیار کیا ایک چینی درسگاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ۱۹۲۵ء میں جامعہ عباسیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ جامع عباسیہ کے نام سے قائم کیا گیا یہ تعلیمی ادارہ پہلی یونیورسٹی تھی جس میں علوم اسلامی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ یہی نہیں یہ جامعہ پاکستان کی پہلی یونیورسٹی تھی۔ اگست ۱۹۲۶ء میں جامعہ عباسیہ بہاول پور میں شعبہ طب کا اجراء ہوا۔ اسی طرح اصلاح شدہ درسی نظامی میں اس نئے مضمون کا اضافہ ریاست کے عوام کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ نواب صادق محمد خان خامس کی تعلیم اور مسلمانوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسہ تقسیم اسناد کی صعارت کرتے ہوئے ایک لاکھ روپیہ عطیہ یونیورسٹی کے لیے دیا۔ نواب صادق محمد خان خامس کے دور میں ہی وزیر تعلیم مولوی غلام حسین کی تحریک پر پہلی بار ۳۵ ریاستی طلبہ اعلیٰ فنی تعلیم کے واسطے انگلستان بھیجے گئے۔ یوں انفرادی طعر پر عوام وخواص میں تعلیم کی ایمیت کا احساس ہوا اور عوامی سطح پر متعدد انجمنیں بنیں۔ ریاست میں ثانوی و اعلیٰ تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے متعدد مڈل اسکولوں کو ہائی اسکولوں کا درجہ دیا گیا۔

نواب صادق محمد خان خامس نے اپنے عوام کو جدید اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے صادق ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی جس نے ریاستی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دینے شروع کیے۔ اسی طرح ۱۹۳۴ء میں انجمن رفیق طلبہ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد حکومت اور ریاست اہل کاروں کی کوششوں سے مقامی باشندوں میں تعلیم کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ ۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء کی انتظامی رپورٹ سے ہوتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ریاست بہاول پور کی کل

آبادی ۱۵ لاکھ کے قریب تھی۔ جس میں ایک لاکھ ۱۴ ہزار بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پرائمری اسکولوں کی تعداد ۳۳۹ تھی اور ان میں طلبہ کی تعداد ۱۶۱۷۷ تھی۔ مڈل اسکولوں میں طلبہ کی تعداد ۲۳۱۳ تھی اور ۲ ہزار سے زائد طلبہ کے لیے دس ہائی اسکول ریاست میں موجود تھے۔ تعلیم نسواں کے لیے ریاست میں انیس سکول قائم تھے۔ جن میں ۸۴۴ طالبات تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ بغدادالجدید میں قائم صادق گرلز ہائی اسکول کے ساتھ انٹرمیڈیٹ کی کلاسوں کے لئے بلاک بنایا گیا۔ سرکاری اسکولوں کے علاوہ تعلیم نسواں کے لیے انیس پرائیویٹ اسکول قائم تھے۔ جن میں ۶۱۴ طالبات حصول تعلیم میں مصروف تھیں۔ حکومت نے عوام کو عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ وارانہ تعلیم دلانے کا بندوبست کیا اور ریاست میں مختلف ٹیکنیکل ادارے قائم کیے گئے جن میں مقامی لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۰ء میں بہاول پور میں سب انجینئر کلاسز شروع کی گئیں۔ ۱۹۴۲ء میں انڈسٹریل اسکول کے نام سے ایک ٹیکنیکل ادارہ قائم ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں کمرشل تعلیم کے لئے صادق اسکول برائے کامرس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے ساتھ ریاست میں سپیشل ایجوکیشن اور تعلیم بالغاں کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں بہاول پور نابینا طلبہ کے The Blind School کے نام سے ادارہ قائم کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک ریاست میں تعلیم بالغاں کے کئی مراکز قائم ہو چکے تھے جہاں شبینہ کلاسوں میں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

نواب صادق محمد خان خامس کے دور میں ایک ڈگری کالج، دو انٹرمیڈیٹ کالج، ایک انٹرمیڈیٹ کالج برائے نسواں، نو ہائی اسکول، سولہ مڈل اسکول اور متعدد پرائمری اسکولوں کا اجراء ہوا۔ مسجدوں میں کتب اسکول قائم تھے۔ کالجوں اور اسکولوں میں فیس برائے نام تھی۔ پرائمری تک تعلیم مفت تھی۔ اعلیٰ مذہبی تعلیم کے لئے جامعہ عباسیہ بہاول پور علامہ تک کی ڈگری لے کر طلبہ فارغ ہوتے تھے اور اس کے ماتحت رفیق العلماء مؤدب اور مدارس تعلیم القرآن قائم تھے۔ ایک

انڈسٹریل اسکول صدر بہاول پور میں قائم تھا۔ ٹریننگ اسکول برائے معلمین، اوور سیز ٹریننگ سنٹرز، کمرشل اسکول اور بلائنڈ اسکول ریاست میں موجود تھے۔ ریاست میں ۱۹۵۱ء میں ٹاؤن اور میونسپل کمیٹیوں کے تحت تمام شہروں میں پرائمری تعلمی لازمی قرار دی گئی۔ ریاست بہاول پور میں ۱۹۵۳ء میں تنظیم مکاتب اسکیم شروع کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ابتدائی پرائمری کی کم از کم تین کلاسیں ایسے گاؤں کی مساجد میں کھولی جائیں جہاں پہلے سے کوئی پرائمری اسکول موجود نہ ہو اسی طرح عورتوں کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے زیادہ پرائمری اسکول قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ جو طلبہ بیرون از ریاست درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے ان کے لیے معقول وظائف کا انتظام کیا گیا۔ ریاست سے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کے وظائف کے لیے۔ ۳۱۰۰۰روپے کی رقم مختص کی گئی۔ ریاست کے منتخب امیدواروں کو ہر سال لاہور، کراچی، علی گڑھ اور لائل پور (فیصل آباد) کی درسگاہوں میں بغرض ٹریننگ بھیجا جاتا تھا۔ ریاست بہاول پور نے بیرون ریاست جس علم پروری کا ثبوت دیا اس کا اندازہ مختلف تعلیمی اور فلاحی اداروں کو دی جانے والی امداد سے بخوبی ہوتا ہے۔ یہ سب معاشرتی فلاح و بہبود اور فراہمی انصاف کے اقدامات تھے جن کے بغیر عوام کو حقیقی حقوق مہیا کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم کے بعد زیادہ اہمیت کا حامل شعبہ صحت کا ہے۔ فلاحی ریاستوں ہمیشہ ان دو امور کی طرف پوری توجہ کرتی ہیں۔

ریاست بہاول پور میں ۱۸۶۶ء سے قبل آبادی کم تھی اور لوگوں کے علاج معالجے کی ضرورتیں دیسی حکیم وغیرہ کرتے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں پہلی مرتبہ ریاست میں سرکاری طور پر شعبہ صحت عامہ کا انتظام کیا گیا۔ شہروں میں شفاخانہ اور دیہات میں حکیمان دیسی تجویز ہوئے جس میں بندگان خدا کو بیماری ہا مہلک سے صورت نجات رہی۔ اس شعبہ کے تحت دو مردانہ شفاخانے بہاول پور اور احمد پور شرقیہ میں کھولے گئے۔ عہد ایجنسی کے بعد نواب صادق خان رابع کے دور میں تین نئے ہسپتال خیر پور

ٹامیوالی، نوشہرہ اور شہر فرید بنائے گئے۔ ریاست کے ڈاکٹر اور دیسی حکیم جو انگریز ڈاکٹر ڈین کی ماتحتی میں مریضوں کی خبر گیری میں مصروف رہتے تھے۔ مریضوں کو وقت پر ٹیکہ لگایا جاتا۔ لوگوں کی صحت کی بہتری کے لئے ہسپتالوں کو ترقی دی گئی۔ خصوصاً بہاول پور اور منچن آباد میں راجہ فتح خاں سپر نٹنڈنٹ نے لوگوں کی دیکھ بھال میں خصوصی جانفشانی دکھائی۔ ان ہسپتالوں کے قیام سے ریاست میں صحت عامہ کا معیار قدرے بہتر ہوا۔ تاہم ان سرکاری ہسپتالوں سے علاج کرنے والے مریضوں کی تعداد میں ریاست آبادی کی تعداد بہت کم تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ریاستی آبادی کا زیادہ حصہ دیہی علاقوں میں آباد تھا۔ یہاں صحت عامہ کی سہولتیں بھی پوری دستیاب نہ تھیں۔ لیکن شہروں میں صحت عامہ کا شعبہ کافی فعال تھا جس کی نگرانی میں بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگانے کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۷ء تک ریاست بھر میں تقریباً ۸۰۳۱ بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے گئے۔ نواب صادق محمد خاں رابع کو اپنی ریاست کے انتظام اور اس کی فلاح و بہبود کا بہت خیال تھا۔ انہوں نے ہر شعبہ میں نہایت شستگی پیدا کر دی تھی اور رعایا کے آرام و آسائش کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ اب تک مستورات کے علاج معالجے کا کوئی انتظام بھی نہ تھا۔ اس کمی کے پیش نظر نواب صاحب بہادر نے ایک زنانہ ہسپتال بہاول پور شہر میں امراض نسواں کے علاج کے لئے قائم کیا۔

نواب محمد بہاول خاں خامس کے عہد میں جہاں ریاست کے یتیم بچوں کی تعلیم اور پرورش کے لیے یتیم خانہ تیار ہوا وہاں کالج اور ہسپتال کے لئے بہت بڑی عمارتیں تجویز ہوئیں بعد ازاں صحت عامہ کی سہولیات کے پیش نظر ریاستی حکومت نے دائرہ کار کو وسیع کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی ابتدائی طبی امداد کی ڈسپنسریاں قائم کیں۔ مختلف اوقات میں ان ڈسپنسریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ عوام کو مزید طبی سہولتیں پہنچانے کے لئے بہاول پور وکٹوریہ ہسپتال کی عالی شان عمارت کا سنگ بنیاد ۱۶ جولائی ۱۹۰۶ء کو رکھا گیا۔ جس کے لئے ۶۴۰۰۰ ہزار روپے کی منظوری دی گئی

۔ اس ہسپتال میں ۲۰۰ بستروں کی گنجائش تھی اور تقریباً تمام جدید طبی سہولتیں دستیاب تھیں۔ مریضوں کو مفت دوائی، لباس اور خوراک فراہم کی جاتی تھیں۔ آپریشن کے دوران کسی قسم کے اخراجات نہیں ہوتے تھے۔ ریاست بہاولپور کا کیونکہ ایک بڑا حصہ صحرا پر مشتمل تھا۔ اور آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس دیہاتوں میں طبی سہولتیں بہم پہنچانے میں مشکلات در پیش آئیں۔ ۱۹۳۰ء تک جب ریاست کی آبادی دس لاکھ نفوس سے تجاوز کر چکی تھی تو ۲۶۲۰۸ کو بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے ۔ سہولت حاصل کرنے والے بچوں کی یہ تعداد اگرچہ حوصلہ افزاء نہیں تھی مگر ریاست کے جغرافیائی حالات کے پیش نظر دیکھا جائے تو ریاستی حکمران کی عوام کو طبی سہولتیں پہنچانے کی خواہشوار کوشش قابل قدر ہے۔ ویول صادق ہسپتال اور لیڈی ویول زنانہ ہسپتال کا افتتاح احمد پور شرقیہ میں ۲ دسمبر ۱۹۴۵ء کو ہوا۔ ۱۹۴۳ء۔ ۱۹۴۴ء کی رپورٹ کے مطابق محکمہ صحت کا سربراہ چیف میڈیکل آفیسر ہوتا تھا۔ جس کی معاونت ۳سول سرجن، ۱۹ اسسٹنٹ سرجن اور ۲۸ سب اسسٹنٹ سرجن کرتے تھے۔ اس سال دو نئی ڈسپنسریاں بھونگ اور ماچھکہ میں کھولی گئیں۔ اس طرح سال کے اختتام پر ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد ۳۲ ہو گئیں۔ ۱۹۴۳ء۔ ۱۹۴۴ء میں مارچ اور اکتوبر کے مہینوں میں صادق آباد میں آئی کیمپ لگائے گئے جہاں اندھے پن کی انسداد کے لیے قائم کی گئی کمیٹی نے آئی کیمپسوں کے لیے عارضی جھونپڑیاں کھڑی کر دیں تھیں۔ بھونگ میں بھی کیمپ لگائے گئے ۔ نومبر میں بہاول پور میں کیمپ لگایا گیا اور فروری میں احمد پور شرقیہ میں سینٹ جان ایمبولینسز گیڈ اور اوورسیز کے چیف کمشنر نے ریاست بہاول پور کے لیئے یہ اہتمام کیا کہ دو سینٹ جان سسٹرز مریضوں کی دیکھ بھال کے لیئے کیمپسوں میں آیا کریں گی۔

آئی کیمپسوں کو مقامی طور پر بہت مقبولیت حاصل رہی حتیٰ کہ ریاست کے باہر سے بھی لوگ ان میں علاج کے لیے آتے رہے ہیں۔ علاج کے نتائج بہت تسلی بخش تھے۔ صادق آباد میں مستقل کیمپ

قائم کر دیئے گئے۔ اسی طرح ایک مستقل کیمپ چشتیاں میں بھی لگانے کی تجویز دی گئی۔ احمد پور شرقیہ کے کیمپ کا نواب صادق محمد خان خامس نے خود دورہ کیا۔ لیڈی ویول نے بھی ایک کیمپ کا دورہ کیا اور کیمپسوں میں آپریشن کرانے والوں میں عینکیں بھی تقسیم کیں۔ اسی سال کے دوران میں بی وی ایچ میں دس بستروں کا ٹی بی وارڈ کھولا گیا۔ یہاں علاج کے بعد موزوں افراد کو مری کے ساملی سینٹیوریم بہاول پور وارڈ میں بھیجا گیا۔

حکومت کے ان اقدامات سے ریاست کے لوگوں کو صحت کی بہتر سہولتیں ملیں۔ علاوہ ازیں لوگوں کو علاج کی بہتر سہولتیں مہیا کرنے کے لئیے اسلامی طب کو متعارف کر رایا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں ایک رہائشی نرسنگ ٹریننگ اسکول بغداد الجدید میں مکمل ہونے کے قریب تھا۔ جس میں بیک وقت ۱۰۰ طالبات کی رہائش اور تربیت کا انتظام تھا۔ ۱۹۵۳ء میں نرسوں کی تربیت کے لیے بی وی ہسپتال میں کلاسز شروع ہو چکی تھیں تاکہ تربیت یافتہ میڈیکل افراد کی کمی کو پورا کیا جا سکے۔ اس طرح سے ۷ لاکھ کی لاگت سے ۱۲۸ بیڈ بستر کا ہسپتال بہاول پور گورنمنٹ نے ٹی بی کے مریضوں کیلئے تعمیر کیا۔ ۱۹۴۹ء۔ ۱۹۵۰ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق ریاست میں صحت کے محکمے کا سربراہ چیف میڈیکل آفیسر ہوتا تھا۔ اس کی آپتھالوجک سپیشلسٹ، سرجیکل سپیشلسٹ، فزیشن اور ریڈیالوجسٹ، چیف میڈیکل آفیسر معاونت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ۱۹۴۹ء۔ ۱۹۵۰ تک دو سول سرجن، تین لیڈی ڈاکٹرز اور ۲۵ میڈیکل آفیسر محکمہ صحت میں ملازم ہو چکے تھے۔ بہاول پور وکٹوریہ ہسپتال جو ۱۹۰۶ء میں قائم کیا گیا۔ ۱۹۴۹ء۔ ۱۹۵۰ء تک اس میں بیرونی مریضوں کے شعبہ جات، آپریشن اور معائنے کے کمرے، ایکسرے بلاک، آئی کلینک اور ٹی بی وارڈ بن چکے تھے۔ بعد میں اس میں جدید آپریشن تھیٹر، سرجیکل وارڈ، پرائیوٹ فیملی وارڈ اور زچہ وارڈ کی تعمیر اسی سال شروع کی گئی۔ ۱۹۴۹ء۔ ۱۹۵۰ء

کے بجٹ میں اس ہسپتال کے لئیے اڑھائی لاکھ روپے رکھے گئے تاکہ وارڈوں اورآپریشن تھیٹرز میں ایئر کنڈیشنر لگائے جا سکیں۔

اسی سال زنانہ جوبلی ہسپتال کو ناکافی سمجھتے ہوئے اسے سول ہسپتال قرار دیتے ہوئے اس کی نئی بلڈنگ کا کام شروع کر دیا گیا۔ ۱۹۴۹ء۔ ۱۹۵۰ء میں دیہی علاقوں میں ۳۲ نئ ڈسپنسریاں کھولی گئیں جہاں مقامی تجربہ کار کمپاؤنڈ تعنیات کئیے گئے ساتھ ہی طبعی تربیت یافتہ افراد کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کمپاؤنڈز اور دائیوں کی ٹریننگ کا اہتمام کیا گیا۔ ایک میڈیکل اسکول سب انسپکٹر سرجنوں کی ٹریننگ کے لئے کھولنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اسی سال میڈیکل آفیسر اور اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر کی تنخواہوں میں کافی اضافہ کیا گیا تاکہ جوہر قابل دستیاب ہو سکیں۔ کامیاب اور مؤثر نظام آبپاشی نے بہاول پور کو ایک خوشحال فلاحی مملکت میں بدل دیا۔ عوام کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ نتیجاً ریاست کی خوشحالی کو دیکھتے ہوئے دوسرے علاقوں سے لوگ ریاست میں رہائش پزیر ہونے لگے۔ ریاست کے حکمرانوں نے تعلیم، صحت شہروں کی آبادکاری اور زمینوں کی سیرابی کے ساتھ ساتھ عوام کی بلا تخصیص مذہب و ملت خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ بنیادی ضروریات کی اشیاء نہایت ارزاں نرخوں پر لوگوں کو مہیا تھیں۔ ایک سیاح نے ریاست کے بارے مین لکھا ایشیاء میں بہت کم ملک ایسے ہیں جہاں کی پیداوار اور چیزیں اتنی وافر اور سستی جتنی بہاول پور میں ہیں۔

نواب صادق خان خامس کی عوام سے محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ انہیں ہر ممکن مراعات دینے کے لئے رہتے تھے۔ اپنے قیام بالم پور کے دوران ہزہائنیس اس پہاڑی علاقے کے نادار اور مفلس ہندوؤں کی اعانت فرماتے رہے۔ نواب صادق محمد خان خامس کی اوّلین خواہش ہوتی کہ رعایا کے ساتھ کسی قسم کی بے انصافی نہ ہو سکے بلکہ رعایا کے ہر فرد کو پورا پورا انصاف مل سکے۔ چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے عدل نوشیرواں کی روایات کی تجدید کر دی۔ اول تو ہر شخص کو ابتدائی مرحلوں ہی میں انصاف

مل جاتا ورنہ ہز ہائینس کی بار گاہ انصاف سے کوئی شخص مایوس نہیں لوٹتا تھا۔ نوابین ریاست مذہبی عقیدت مندی کی بدولت علم وادب کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ مساجد کی تعمیر کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں نواب محمد بہاول خان خامس نے نور محل کے احاطے میں صدر عمارت سے ۲۰۰ گز کے فاصلے پر ایک خوبصورت مسجد تعمیر کروائی۔ یہ مسجد لاہور کے چیفس کالج کی مسجد کے نمونے کی جس کا شرف بھی نواب صاحب کو اپنی طالب علمی کے دور میں حاصل ہوا تھا۔ نور محل کی مسجد کی تعمیر پر اس دور میں ۲۰ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ اسی طرح صادق محمد خاں خامس کی اسلام سے وابستگی اور شعائر اسلام کے ساتھ بے پایاں محبت کا ثبوت جامع مسجد الصادق کی تعمیر ہے۔

غرضیکہ ریاست بہاول پور فلاحی ریاست کے معیار پر ہر پہلو سے پوری اترتی تھی۔ نواب صادق محمد خاں خامس کی زندگی کے آخری ایام میں مسجدوں میں قرآن کی تعلیم اور درودوسلام کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ یتیم خانوں میں یتیموں کی پرورش ہوا کرتی تھی۔ بیواؤں کو ہر ماہ گزر الاؤنس ملتا تھا۔ سوالی اپنی امیدوں کا سہارا لیے حاضر ہوتا تو اسکا دامن بھر دیا جاتا۔ غریب غرباء کے لیے لنگر تقسیم ہوتے تھے۔ اس لیے بیسویں صدی کے اوائل میں لوگ آرام اور سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس دور میں جرم ناپید تھے۔ قتل رہزنی یا ڈاکے کی خبر برسوں سننے میں نہیں آتی تھیں۔ ریاست بہاول پور اپنے پاکستان میں انضمام تک ایک مثالی فلاحی ریاست کے طور پر سرگرم عمل میں رہی جس کی مثال کم از کم برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

حوالہ جات

۱۔ مصطفی علی بریلوی، "بہاول پور کی تعلیمی سر گزشت"، سہ ماہی الزبیر (بہاول پور نمبر)، ص ۲۰۲۔

۲۔ میجر شمس الدین، "پیش لفظ (صادق نامہ)" نذیر علی شاہ ترجمہ صدیق طاہر، بہاول پور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۵۔

۳۔ محمد عامر، "ریاست بہاول پور کے برطانوی ہند سے تعلقات"، (مقالہ ایم فل)، ص ۱۶۳۔

۴۔ ڈاکٹر محمد خورشید،۔" خطہ بہاول پور میں علمی و دینی سرگرمیوں کا تاریخی جائزہ"، مجلہ علوم اسلامیہ ، بہاول پور، ۱۹۹۹ء، ص ۹۴

۵۔ مصطفی علی بریلوی "بہاول پور کی تعلیمی سر گزشت"، سہ ماہی الزبیر، ص ص ۲۰۲۔۲۰۳
مزید تفصیل کے لیے محمد خورشید، "خطہ بہاول پور میں علمی و دینی سرگرمیوں کا تاریخی جائزہ"، ص ۱۰۲

۶۔ محمد عزالرحمٰن عزیز، "صبح صادق" (قلمی نسخہ)، ص ۱۶۷۔

۷۔ مسعود حسن شہاب دہلوی، "اولیاء بہاول پور"، سہ ماہی الزبیر (بہاول پور نمبر)، ص ۲۷۹۔

۸۔ محمد عزالرحمٰن عزیز، "صبح صادق" (قلمی نسخہ)، ص ۱۶۸۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۶۸۔

۱۰۔ میاں نور الزمان احمد اوج، "بہاول پور تاریخ کے آئینے میں"، سہ ماہی الزبیر (بہاول پور نمبر)، ص ۲۶،۲۵۔

۱۱۔ سعید ہاشمی، "حیات صادق "،۱۹۴۹ء، ص ۲۲۔

۱۲۔ محمد عامر، "ریاست بہاول پور کے انگریزوں سے تعلقات"، ص ۱۷۰۔

۱۳۔ سعید ہاشمی، "حیات صادق"، ص ۲۲۔

۱۴۔ مصطفی علی بریلوی "بہاول پور کی تعلیمی سرگزشت"، ص ۱۷۰۔

15- Report on the administration of Bahawal pur state, 1945.46, P 112,113

16- Government of Bahawalpur, Information and publicity Department Bahawalpur State, 1949-50, p37.

۱۷۔ سعید ہاشمی، "حیات صادق"، ص ۳۶،۳۷۔

۱۸۔ محمد انور نبی قریشی، "مختصر تاریخ بہاول پور"، ص ۱۳۲۔

۱۹۔ سید مراد شاہ گردیزی، "تاریخ مراد) "جلد پنجم)، ص۱۲۶۔

۲۰۔ ایضاً، ص۱۸۱

۲۱۔ محمد انوار نبی قریشی، "مختصر تاریخ بہاول پور"، ص ۹۴

22- Pujab States Gazetteer, Vol XLV - B, pp ii, iii.

۲۳۔ محمد قمر الزمان عباسی، "بہاول پور کا صادق دوست"، ص۲۰۹۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۱۱۔

25- Government of Bahawalpur, Informataion and Publicity Department, Bahawalpur State, 1949-50,p41

26- Ibid, p42.

۲۷۔ محمد قمر الزمان عباسی، "بہاول پور کا صادق دوست"، ص ۴۴۔

۲۸۔ محمد سلیم ملک، "بہاول پور کے آئینے میں"، سہ ماہی الزبیر، ص ۳۸۔

۲۹۔ محمد قمر الزمان عباسی، "بہاول پور کا صادق دوست"، ص ۴۲۔

۳۰۔ ڈاکٹر شاہد حسن رضوی، "شاہی محلات"، سہ ماہی الزبیر، ص ۱۸۰۔

۳۱۔ محمد قمر الزمان عباسی، "بہاول پور کا صادق دوست"، (پیش لفظ منظور احمد رفعت)، ص ۸۔

۳۲۔ محمد سلیم ملک، "بہاول پور کے آئینے میں"، سہ ماہی الزبیر (بہاول پور نمبر)، ص ۴۱۔

ریاست بہاول پور کے نظمِ مملکت کا جائزہ

(۱۸۶۶ءتا۱۹۴۷ء)

زیرِ نظر تحقیقی مضمون میں سابق ریاست بہاول پور کے اکیاسی سال (۱۸۶۶ءتا۱۹۴۷ء)نظام حکومت کا جائزہ پیش کیا گیاہے۔ اس دوران قدیم اور جدید نظام ہائے حکومت کے امتزاج سے ایک نیاحکومتی ڈھانچہ مرتب کیا گیا۔ اگرچہ انگریزوں کا اتحادی ہونے کے ناطے ریاست منقسم اورزیر دست اقتدار اعلیٰ کی حامل تھی مگر اس کے باوجود یہاں نظم ونسق مملکت کے وہ تمام شعبے قائم تھے جو موجودہ دور کی آزاد اور خود مختار ریاستوں کا خاصہ ہیں۔ اس مضمون میں اُن تمام حکومتی اداروں کی تشکیل اور کارکردگی کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا گیاہے، جن پر ریاست کا انتظامی ڈھانچہ اُستوار تھا۔ اگرچہ تمام تر اختیارات کا منبع حکمران ریاست کی ذات تھی مگر اس کی انتظامی کونسل حکومتی معاملات میں اسے شورائی معاونت فراہم کرتی تھی۔ اس طرح شاہی محل حکومتی سرگرمیوں کا محور تھا۔ اس زرعی معیشت کی حامل ریاست کو ایک مؤثر مالیاتی نظام سے مستحکم کیا گیا۔ خصوصا ستلج ویلی پراجیکٹ جیسے عظیم آب پاشی کے منصوبے اور وسیع پیمانے پر کی جانے والی آباد کاری کے ذریعے لاکھوں ایکڑاراضی کو زیر کاشت لانے کا انتظام کیا گیا۔ ریاست کی تعمیر وترقی کے شعبہ جات میں سے محکمہ پبلک ورکس، مواصلات، شعبہ ڈاک و تار اور برقی سپلائی کی پیداوار سے ریاست نے ترقی کے نئے دور کا آغاز کیا۔ اس دوران عوام کو تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضروریات کی مفت فراہمی کے ذریعے فلاحی مملکت کا تصور اجاگر کیا گیا۔ ریاست نے اپنے عوام کو عدل وانصاف کی فراہمی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ امنِ عامہ کے قیام اور جرائم کی روک تھام کے لیے پولیس کوٹریننگ اور اسلحہ سے لیس کیا گیاجب کہ جیل کو اصلاحی ادارے اور پیداواری یونٹ میں تبدیل کرنے کی شاندار روایت قائم کی گئی۔ ریاست نے

اپنے بلدیاتی نظام کے ذریعے شہری سہولیات کی فراہمی کو اپنا شعار بنایا۔ ریاست میں دفاع اور امور خارجہ کے محکمہ جات بھی موجود تھے مگر ان کے تمام اختیارات بالا دست انگریزی حکومت کو حاصل تھے۔ خصوصاً ریاست کو امپیریل سروس ٹروپس" کے قیام کی صورت میں برطانوی استعمار کی دفاعی معاونت کا مہنگا ترین فریضہ سرانجام دینا پڑا۔ مگر اس ایک ڈویژن فوج نے برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستانی فوج میں شامل ہو کر استحکام پاکستان میں زبردست معاونت فراہم کی۔ غرض یہ کہ مجموعی طور پر ریاست بہاول پور کا نظم مملکت اپنے حکومتی اداروں کی ساخت اور کارکردگی کے اعتبار سے ایک مکمل انتظامی ڈھانچے کا حامل تھا۔ جو نا صرف اُس وقت کی بیشتر ہندوستانی ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا بلکہ اپنی فلاحی و رفاہی خصوصیات کی وجہ سے قابل تقلید تھا، جس سے آج بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

ریاست بہاول پور کو پاکستان سے الحاق کرنے والی اولین اور سب سے بڑی ریاست کا اعزاز حاصل ہے۔ تقسیم سے قبل اس کا شمار برصغیر پاک وہند کی چھ سو ترانوے ریاستوں کی فہرست میں دوسرے درجے کی ریاست میں ہوتا تھا۔ جب کہ متحدہ پنجاب اور راجپوتانہ گروپ کی ریاستوں میں ریاست بہاول پور کو دوسری بڑی ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی اہمیت کے پیش نظر تاج برطانیہ کی منظوری سے امیر آف بہاول پور کے لیے His Highness کا خطاب اور سترہ توپوں کی سلامی کا اعزاز مختص تھا۔ وہ براہِ راست وائسرائے ہند سے ملاقات کرنے کا مجاز تھا۔ پینتالیس ہزار پانچ سو اٹھاسی مربع کلومیٹر رقبہ اور تیرہ لاکھ اکتالیس ہزار دوسو نو نفوس کی آبادی پر مشتمل اس ریاست کو موجودہ دور کے کئی اہم ممالک پر سبقت حاصل تھی۔ ۲۔ جہاں تک اس کے اقتدار اعلیٰ کا تعلق ہے تو ۱۸۳۸ء کے اینگلو بہاول پور معاہدہ اور اس کے مابعد کی توجیہات کی رُو سے ریاست بہاول پور کو

انگریزوں کی بالا دست نگرانی میں اپنے اندرونی نظم و نسق کی انجام دہی کا کلی اختیار حاصل تھا، مگر دفاع اور اُمور کے سلسلے میں،، یہ ریاست کاملاً برطانوی حکومت کے دست نگر تھی۔

جہاں تک ریاست بہاول پور کے تاریخی ارتقا کا تعلق ہے تو اس کا قیام سندھ میں آباد عباسی النسل داؤد پوتروں کا مرہون منت ہے۔ ۱۷۲۶ - ۲۷ء کے دوران اس خاندان کی اپنے رشتہ دار سندھ کے حکمران کاہوڑوں سے دیرینہ چپقلش، ان کی اپنے آبائی علاقہ سے بے دخلی پر منتج ہوئی۔ اس موقع پر صوبہ ملتان کے مغل گورنر مرزا شاہنواز خان المعروف نواب حیات اللہ خاں (متوفی ۱۷۴۸ء) نے داؤد پوترہ سردار امیر صادق محمد خاں اول (۱۷۲۳ء تا ۱۷۴۸ء) کو علاقہ چودہری (موجودہ تحصیل لیاقت پور) کی جاگیر تفویض کی، تاکہ ضرورت پڑنے پر داؤد پوتروں کی جنگجویانہ صلاحیتوں سے استفادہ حاصل کیا جاسکے۔ ۱۷۲۷ء میں اس جاگیر کی تفویض ہی دراصل ریاست بہاول پور کی علاقائی وجغرافیائی تاسیس کانقطہ آغاز ثابت ہوئی۔

"ریاست بہاول پور میں مجموعی طور پر بارہ نواب حکمران رہے مگر نظم و نسق کے اعتبار سے آخری تین نوابوں کا عہد حکومت (۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۷ء) خصوصیت کا حامل ہے۔ اس عرصہ کے دوران برطانوی نگرانی میں تین کم سنی کی عبوری حکومتیں قائم رہیں۔ اس عہد کا آغاز نواب محمد بہاول خان رابع (۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۶ء) کی وفات سے ہوا۔ اس کا جانشین کم سن نواب صادق محمد خاں رابع (۱۸۷۶ء۔۱۸۹۹ء) تھا، جس کے مقابلے میں اس کے ایک رشتہ دار جعفر خاں (متوفی ۱۸۶۸ء) نے متوازی حکومت قائم کرلی۔ اس مسلح بغاوت کے استیصال میں ناکامی پر نواب کی والدہ نے انگریزی حکومت سے مدد کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں ۱۴ر۱۱گست ۱۸۶۶ء کو ریاستی حکومت کا نظم مملکت نواب صادق محمد خاں رابع کی بلوغت تک پولیٹکل ایجنٹ کے سپرد کردیا گیا، جسے منتظم و نگران اعلیٰ کی حیثیت سے پرنٹنڈنٹ ریاست بھی کہاجاتا تھا۔ اس کی معاونت کے لیے ایک انگریز اسٹنٹ

پولیٹکل ایجنٹ واسٹنٹ سپر نٹنڈ نٹ ایک اضافی مقامی ایجنٹ واسٹنٹ سپر نٹنڈ نٹ کا تقرر کیا گیا۔ اس عبوری حکومت کو ایجنسی کی حکومت" یا "دور مداخلت" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وہ عہد نو ہے جسے انتظامی اعتبار سے جدید نظام حکومت کا نقطہ آغاز قرار دیا جاسکتا۔ اس کی ساخت برطانوی ہند میں رائج انتظامی اداروں کی طرز پر استوار کی گئی۔ یہی وہ نظام تھا جو اپنی تمام تر ارتقائی خصوصیات کے ساتھ ۱۸۷۹ء میں نواب صادق محمد خاں رابع کو بالغ ہونے پر سپرد ہوا۔ نواب مذکورہ نے ریاست کے نظم و نسق کو مقامی روایات سے ہم آہنگ کیا اور اسے عوامی اعتبار سے ززیادہ قابل عمل بنایا۔ ایک عہد ساز شخصیت ہونے کے ناطے نواب مذکورہ کو صبح صادق" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے،یعنی ریاست کو تعمیر و ترقی کی نئی سحر۔ سے ہمکنار کرنے والا نواب ۴ فروری ۱۸۹۹ء کو نواب کی. وفات اور اُس کے جانشین نواب محمد بہاول خاں خامس (۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۷ء) کی کم سنی دوبارہ ایجنسی کی اور حکومت کے قیام پر منتج ہوئی۔ ان کی سات رکنی انتظامی کونسل چار سال (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۳ء) تک ریاست کے نظام حکومت میں دخیل کار رہی ہے۔ اس دوران انتظامی شعبوں نے قدرے ترقی کا سفر طے کیا۔ اس کے بعد نواب محمد بہاول خاں خامس تخت نشین ہوا۔ اُس کا مختصر عہد تعمیراتی اعتبار سے شاہجہانی عہد اور عدل و انصاف کی ترویج کی وجہ سے جہانگیری عہد سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہ بہاول پور کو حقیقی معنوں میں ایک جدید ترقی یافتہ ریاست میں تبدیل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کی جواں مرگی اس کے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی راہ میں حائل ہوئی۔ اس طرح ایک بار پھر اُس کے جانشین کی کم عمری عبوری حکومت کے قیام کا سبب بنی۔ مگر اس بار ریاست کا انتظام کونسل آف ریجنسی (۱۹۰۷ء تا ۱۹۲۴ء) کو سونپا گیا، جس کا صدر اور پانچ ممبران ایسے نامزد مقامی افراد تھے، جنہیں ریاستی نظم و نسق کا وسیع تجربہ حاصل تھا، برطانوی حکومت کی طرف سے سول معاملات میں پولیٹیکل ایجنٹ اور فوجی معاملات میں ایک ملٹری ایڈوائزر نگران اعلیٰ کی حیثیت سے ریجنسی کے معاملات کو

کنٹرول کرتے تھے۔ سترہ سال کی طویل المعیاد عبوری حکومت ترجیحی طور پر برطانوی مفادات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے رکھتی۔ تاہم مقدور بھر عوامی خواہشات اور مقامی رجحانات کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ ۸ مارچ ۱۹۲۴ء کو نواب صادق محمد خاں خامس (۱۹۲۴ء تا ۱۹۵۵ء) کو اختیارات تفویض کیے گئے۔ ان کا طویل ترین دور حکومت متنوع خصوصیات کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنی انتظامی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے حکومتی شعبوں کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا، انتظامی عہدوں پر انتہائی با صلاحیت افراد کو تعینات کیا۔ وہ نظم و نسق کے معاملے میں انتہائی سخت گیر موقف کے مالک تھے۔ حکومتی معاملات میں بے جا مداخلت، اقربا پروری اور سفارش کے سد باب کے لیے وہ اپنی اولاد تک کو ایک فاصلے پر رکھتے تھے۔ وہ نظم و نسق کے معاملات پر کڑی نظر رکھتے تھے اور اس سلسلے میں کسی بھی خامی یا بے قاعدگی کا سختی سے محاسبہ کرتے تھے۔ وہ عوام کی فوری دادرسی کو اپنا اولین فریضہ تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں حکومتی اداروں کا نظام خاصا فعال رہا، ریاستی وسائل میں ترقی ہوئی اور ریاست خوش حالی کی راہ پر گامزن رہی۔ اگرچہ نواب صادق محمد خاں خاس نے اپنی حکمرانی کا آغاز مطلق العنانیت سے کیا مگر انجام کار اپنے عوام کو جمہوری حقوق تفویض کیے۔

جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم کا منصوبہ پیش ہونے کے فوراً بعد کانگریسی قیادت کی طرف سے بہاول پور کے وزیر اعظم مشتاق احمد گورمانی کی ملی بھگت سے نواب صاحب کو اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی ہر ممکنہ ترغیب و تحریص کی گئی۔ مگر نواب صادق محمد خاں خاص نے اس کے برعکس ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنی ریاست کا الحاق مملکت پاکستان سے کیا۔ اس طرح اپنے دو سو ئیس سالہ موروثی اقتدار سے دست بردار ہو کر موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے درمیان جغرافیائی سالمیت اور مواصلاتی ربط پیدا کرنے میں معاونت فراہم کی۔ پاکستان سے الحاق کے بعد ریاست بہاول پور کا

علیحدہ انتظامی یونٹ اپنی داخلی خود مختاری کے ساتھ قائم رہا، جس کا مکمل ادغام ۱۴؍اکتوبر ۱۹۵۵ء کو وحدت مغربی پاکستان کے نتیجے میں عمل میں آیا۱۳۔

نظم و نسق کے حوالے سے ریاست بہاول پور کے مجموعی طور پر دو سو اٹھائیس سالہ (۱۷۲۷ء تا ۱۹۵۵ء) انتظامی دور میں سے اس کے اکیاسی سالہ (۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۷ء) عہد کا درمیانی عرصہ حکومت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس دوران یکے بعد دیگرے تین عبوری حکومتیں اور تین نواب برسر اقتدار رہے۔ یہی وہ عرصہ ہے جس کا آغاز ریاست کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنا۔ قدیم اور جدید حکومتی اداروں کے امتزاج سے ایک نیا انتظامی ڈھانچہ مرتب ہوا، جسے قابل عمل بنانے کے لیے اسے مقامی تقاضوں اور روایات سے ہم آہنگ کیا گیا۔ ریاست بہاول پور انتظامی طور پر متعدد بڑی اور چھوٹی انتظامی اکائیوں میں تقسیم ہوئی ۱۴۔ کے انتظام و انصرام کے لیے عہدہ داران مقرر ہوئے، جنہیں لوگوں کے مسائل مقامی طور پر حل کرنے کے اختیارات حاصل تھے، جہاں تک نظم و نسق مملکت کا تعلق ہے تو اس کے تمام تر اختیارات حکمران ریاست کی ذات میں مرتکز تھے البتہ اس کے توسط سے حکومتی شعبہ جات کا انتظام و انصرام انتظامی کونسل کے سپرد تھا۱۵۔ جو اپنے اقدامات اور فیصلوں کے عملی نفاذ کے لیے نواب کی قطعی توثیق کی مرہون منت تھی۔ جب کہ عبوری حکومتوں کے دور میں اہم معاملات کی توثیق کا اختیار پولیٹیکل ایجنٹ کو حاصل تھا۔ امیران بہاول پور کی جانشینی کی منظوری اور بالغ ہونے پر انہیں اختیارات کی تفویض وائسرائے ہند کی طرف سے عمل میں آتی تھی۔ ۱۸۶۶ء کے بعد اُصول جانشینی کی مسلمہ روایات کے مطابق ہر حکمران کے بعد اس کے سب سے بڑے بیٹے کو ہی وارث تخت قرار دیا گیا ہے۔ ریاستی انتظامیہ میں امیران بہاول پور کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ تاہم وہ نظریاتی اعتبار سے اللہ تعالی کے اقتدار اعلیٰ کے قائل تھے۔ وہ اپنی تمام تر بشری کمزوریوں اور شخصی حکومت کی خامیوں کے باوجود معاشرتی و اخلاقی قیود کے پابند تھے۔ اگرچہ وہ

ظاہری جاہ و جلال کو نظم و نسق کے قیام کے لیے ضروری سمجھتے تھے مگر ان کا یہ انداز انہیں عوام سے دور رکھنے میں مانع نہ تھا۔ مجموعی طور پر ان کا طرز عمل بلا تخصیص مذہب انصاف پروری، رحمدلی، مہربانی اور فیض رسانی کا مظہر تھا۔ ان کا ریاست کے فلاحی و رفاہی تصور کو اجاگر کرنے کے لیے حواصل کے جوڑے کو سرکاری نشان قرار دینا دراصل اس بات کا عزم تھا کہ وہ ان پرندوں کی سرشت کے مطابق اپنی رعایا کے لیے انتہائی مشفق ماں باپ ثابت ہوں گے اور ضرورت پڑنے پر انہیں اپنا خون اور گوشت تک کھلانے سے بھی دریغ نہ کریں گے ۱۸۔ اپنی ریاست . کے اندرونی معاملات میں خود مختار ہونے کے ساتھ ساتھ امیر ان بہاول پور دین اسلام کے پیروکار اور حامی تصور ہوتے تھے۔ امیر ان بہاول پور نے انگریزوں کی بالا دستی کے باوجود اپنی ریاست کا اسلامی تشخص برقرار رکھنے کی ہر ممکنہ سعی کی۔ انہوں نے اپنی مملکت میں اسلامی قوانین نافذ کیے۔ اپنے پرچم کو کلمہ طیبہ کی شمولیت سے بابرکت بنایا، جمعہ کی تعطیل کو لازم کیا، سرکاری لباس کے طور پر ترکی ٹوپی، سیاہ اچکن اور سفید شلوار قمیض کو رائج کیا ۱۹۔ یہی وہ اقدامات تھے جن کی بدولت ریاست بہاول پور کو برصغیر پاک و ہند کی ایک اہم اسلامی ریاست کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔

خالصتاً امیر ان بہاول پور کے دور حکومت میں شاہی محل اور اس کے ادارے کے حکومتی کا مرکز تھے۔ شاہی محل کا نظام ترکان عثمانیہ، سلاطین دہلی، مغل اور انگریزی لوازمات و روایات سے مخلوط تھا، مگر اس کے اداروں کو فعال بنانے کے لیے انہیں مقامی رسوم و رواج سے ہم آہنگ کیا گیا تھا۔ اگر چہ ظاہراً شاہی محل اور اس کے بیشتر اداروں کا مقصد امیر ان بہاول پور کو سہولیات اور آسائشات کی فراہمی معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقتاً انہیں ریاست کے مرکزی سیکرٹریٹ کا درجہ حاصل تھا۔ دراصل یہی وہ مقام تھا جہاں نہ صرف سیاسی و حکومتی حکمت عملیاں وضع ہوتی تھیں۔ بلکہ ہر قسم کی معاشی و ثقافتی سرگرمیاں بھی پروان چڑھتی تھیں۔ امیر ان بہاول پور اور ان کے محلات ہر قسم کے دنیاوی

اعزاز و. مراعات ، عزت و وقار اور معاشی کفالت اور روز گار کا ذریعہ تصور ہوتے تھے۔ محکمہ تعریفات نہ صرف حکمران ریاست کے اخراجات اور اشیائے صرف کی بہم رسانی کا ذمہ دار تھا بلکہ وہ غربا، مساکین، معذوروں اور یتیموں کی کفالت کا فریضہ بھی سر انجام دیتا تھا۔ ۲۔ اندرونِ ریاست اور ہندوستان بھر کے اہم تعلیمی اداروں اور معاشرتی بہبود کی انجمنوں کو یکمشت اور سالانہ امداد یہیں سے فراہم کی جاتی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں نواب صادق محمد خاں خاس کی دادی حضرت مائی صاحبہ نے ندوۃ العلماء لکھنو کو پچاس ہزار روپے چندہ دیا تو اس پر شبلی نعمانی نے شکریہ کے خط کے ساتھ انہیں زندہ زبیدہ خاتون کے خطاب سے معنون کیا۔ اس طرح 1911ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی تعمیر کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے امداد" فراہم کی گئی، جب کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ۱۹۳۰ء تک دولاکھ اناسی ہزار دو سو روپے کی ادائیگی کی گئی۔ اس طرح پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال کی تعمیر بھی کرائی گئی۔ اس کے علاوہ انجمن حمایت اسلام اور اس کے اداروں کو بھی گراں قدر امداد دی جاتی تھی۔ ۲۔ یہی وہ ادارے تھے، جنہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور کردار ادا کیا۔

امیران بہاول پور کی قیادت میں منعقد ہونے والے شاہانہ دربار، پروقار تقاریب، جشن اور جلوس جہاں ایک طرف اُن کے جلال و عظمت کی علامت تھے، وہاں دوسری طرف یہ عوام سے رابطے کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ ایسے مواقع مظلوم عوام کی داد رہی، ضرورت مندوں کی امداد اور غریب پروری کا باعث ہوتے تھے۔ شاہی محل کے تمام ادارے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ اصطبل، فیل خانہ، شتر خانہ، رتھ خانہ، بگھی خانہ کی بدولت ریاست میں باربرداری کے جانوروں کی افزائش نسل کشی اور علاج معالجے میں معاونت ملتی تھی۔ جب کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی موٹر خانہ کے قیام نے ریاست کو جدید مواصلاتی ذرائع فراہم کیے۔ نواب صادق محمد خاں خاص نے چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کی تقریب کو شایان شان طریقے سے منانے کے لیے اپنی نصف درجن کاریں

کراچی روانہ کیں۔ اس موقع پر خود قائد اعظم! اور مونٹ بیٹن ریاست بہاول پور کی رولز رائس میں سوار ہوئے ۲۲۔ اس طرح شاہی باورچی خانہ اور توشہ خانہ خانہ اور توشہ خانہ محل میں رہائش پذیر افراد کے علاوہ شاہی مہمانوں کے لیے طعام و قیام کی تمام ضروریات پوری کرتے تھے۔ بعض اوقات مہمانوں کی فہرست میں وائسرائے اور مہاراجوں سے لے کر ایک معمولی آدمی تک شامل ہوتے تھے۔ باورچی خانہ میں انواع و اقسام کے کھانے تیار کیے جاتے تھے ۲۳۔ یہاں پر کام کرنے والے باورچی ان کھانوں کو ریاست بھر میں متعارف کراتے اور مقامی کھانوں کو بیرون ریاست متعارف کرایا جاتا۔ جب کہ توشہ خانہ کا شعبہ ہوئی سے لے کر قیمتی خیموں، فرنیچر اور سونے، چاندی کے برتنوں کیک کی ایک خاصی تعداد رکھتا، جنہیں اہم تقریبات کے مواقع پر استعمال میں لایا جاتا تھا ۲۴۔ ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ کی صنعت کی غیر موجودگی میں ان اداروں کی بہت افادیت تھی۔ اس طرح محل سے متصل کارخانہ جات کئی صنعتوں اور دستکاریوں کے فروغ کا باعث تھے۔ اگر اس دور میں اسی نہج پر ریاست بھر میں صنعتی وقتی مراکز قائم کر دیے جاتے تو آج یہ خطہ بہت ترقی یافتہ ہوتا۔ ان محلات کا سب سے پوشیدہ مگر بارونق حصہ حرم سرا تھا ۲۵۔ امیران بہاول پور نے شرعی اور جبلی تقاضوں سے انحراف کرتے ہوئے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو رشتہ ازدواج سے منسلک کرنا اپنی توہین سمجھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بے شمار شرعی اور غیر شرعی نکاح کیے۔ نتیجہ تا حرم سرا سینکڑوں خواتین کا مسکن تھا۔ جہاں مقامی تہذیب و معاشرت، انداز آرائش و زیبائش، رقص و سرور کی محفلیں سجتیں۔ مگر زنان خانے میں ماسوائے نواب کے کسی اور مرد کا سایہ بھی داخل نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح یہ ایک ایسا حسین قفس تھا، جہاں ایک بار جنم لینے والی یا داخل ہونے والی عورت یہاں سے پھر کبھی نہ نکل سکتی تھی۔ کثرت ازدواج – تھی۔ کثرت ازدواج سے نہ صرف حکمران خاندان کی نسبی روایات تبدیل ہوئیں بلکہ اس کے انتشار و افتراق کا سبب بنیں۔ محل کا ایک حصہ "کتب خانہ

سلطانی" اور " میوزیم سلطانی پر مشتمل تھا، جو بلا شبہ بر صغیر پاک وہند کے نادر علمی، تاریخی اور تہذیبی ورثے کا حامل تھا۲٦۔ شاہی لائبریری کی سوا دو سو سالہ تاریخ میں ہر نواب نے اس میں گراں قدر مخطوطات اور کتب کا اضافہ کیا۔ جب کہ میوزیم میں قیمتی نوادرات کاذخیرہ کیاجاتارہا۔ نواب صادق محمد خاں خامس کی وفات کے بعد یہ دونوں ادارے حکمران خاندان کی باہمی چپقلش کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ کاشکار ہوگئے۔

جہاں تک ریاست بہاول پور کے مالیاتی ڈھانچہ کا تعلق ہے تو اسے بر صغیر میں مروج قدیم نظام مال گزاری، خصوصاً ہمسایہ علاقہ جات سندھ اور ملتان کے آزمودہ مالیاتی تجربوں پر استوار کیا گیا تھا۔ پہلی ایجنسی کے دور میں مالی ابتری کا خاتمہ کیا گیا۔ غیر ضروری اخراجات پر قدغن لگائی گئی، آمدن وخرچ کی مدیں مقرر کی گئیں اور ان کے اندراج اور جانچ پڑتال (Auditing) کاطریقہ کار اختیار کیا گیا۔ ۱۸٦٦ء کے بعد ریاستی خزانے کا بیشتر حصہ حکمران کی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے ترقیاتی کاموں پر خرچ کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ اصلاحات کے نفاذ سے زرعی اجناس کی پیداوار میں اضافے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔ اس کے نتیجے میں ہمسایہ برطانوی اضلاع کے مقابلے میں مال گزاری کے تخمینے (Assessment) کی اوسط شرح میں اضافہ ہوا۔ اور ریاست کی اقتصادی حالت بہتر ہوئی۔ ۱۸٦۷ء میں باقاعدہ خطوط پر محکمہ مال کا قیام عمل میں آیا، جس کے سپرد ترقی زراعت کا کام بھی تھا۔ جب کہ خزانے کا شعبہ علیحدہ سے قائم کیا گیا۔ ہر مالیاتی اکائی (نظامت) کے ناظم کو اپنے علاقے میں انتظامی وعدالتی اختیارات تفویض ہوئے۲۷ - ۱۹۰۳ء کے دوران محکمہ مال کی تنظیم نو ہوئی تو ضلع، تحصیل اور سب تحصیل کے نام سے مالیاتی اکائیاں قائم ہوئیں۲۸ ۱۹۲۴ء میں وزارت مال کا قیام عمل میں آیا۔ آمدنی اور پیداوار کے تمام اہم شعبہ جات اس کے سپرد کر دیے گئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی فنانس منسٹر کے تقرر کا اختیار حکومت ہند نے خود حاصل کر لیا۔ دراصل یہی وہ

طریقہ تھا جس کے ذریعے برطانوی سامراج مقامی ریاستوں کی اقتصادیات میں زیادہ سے زیادہ اثرو نفوذ اور تصرف حاصل کرتا تھا۔ محکمہ مال کا ایک بڑا کارنامہ بندوبست اراضی کا انتظام تھا اس کے ذریعے تمام قابل کاشت رقبہ معلوم کیا گیا۔ ہر دس سال کے لیے تشخیص اراضی ہوئی یا زمین کی بندی اور اس پر کاشت کردہ اجناس کی اوسط قیمت کے مطابق مالیہ کی فی بیٹھے شرح مقرر کی گئی۔ پانچ بیگھ اراضی تک کے کاشتکار ان کو مالیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ مال گزاری کی تحصیل کے لیے جنس کی بجائے نقدی کا طریقہ اختیار کیا گیا۲۹۔ یہی وہ اصول تھے جنہیں آئندہ کے لیے زرعی محصولات کی بنیاد بنایا گیا۔ مالیہ اراضی اور آبیانہ سے حاصل شدہ آمدنی کے علاوہ ہیں کی تعداد میں اور محصولات بھی عائد کیے جاتے تھے۔ ان میں سے کچھ ٹیکس فی الواقع عوام پر بوجھ کے مترادف تھے۔ ان میں جانوروں کی چرائی کا ٹیکس اور کھجور کے درختوں پر ٹیکس شامل تھے۔ ۱۸۶۶ء کے بعد اخراجات سے متعلق ایک نیا تصور پیدا ہوا۔ اس سے پیشتر ریاستی خزانہ حکمران کی نجی ملکیت تصور ہوتا تھا۔ اگر عوام پر کچھ خرچ بھی کیا جاتا تھا تو وہ ان کا حق سمجھ کر نہیں بلکہ خیرات، امداد اور ثواب کی غرض سے کچھ رقم مختص کر دی جاتی تھی۔ مگر باقاعدہ بجٹ کا نظام رائج ہونے سے امیر ان بہاول پور کے نجی اخراجات کے لیے ایک خاص رقم مختص کر دی گئی۔ جب کہ اس کا معتدبہ حصہ انتظامی اداروں اور تعمیرات کے علاوہ تعلیم اور صحت عامہ کے شعبوں پر خرچ کیا جانے لگا۔ مگر ریاستی حکومت کو انگریزوں کے اتحادی ہونے کا معاوضہ امدادی فوج کے اخراجات کی صورت میں برداشت کرنا پڑتا تھا جو اس کے بجٹ کے پچیس فی۔ صد سے متجاوز تھے۔ یہ ایسے اخراجات تھے جن کا ریاست یا اس کے عوام سے کوئی مفاد وابستہ نہ تھا۔ البتہ ریاست کے مجموعی بجٹ کی رقم میں سالانہ اضافہ اور ترقیاتی منصوبوں پر اخراجات کا رجحان اس کی صحت مند معیشت کی دلیل تھی۔ مثلاً ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۳ء کے دوران ستلج ویلی پراجیکٹ پر اٹھنے والے مجموعی اخراجات میں سے دو کروڑ روپے

ریاست نے اپنی بچتوں میں سے خرچ کیے۔ جب کہ بارہ کروڑ روپے حکومت ہند سے قرض لیے گئے ۳۰۔ اس کی واپسی منصوبے کی تکمیل کے ترین برس بعد ہونا تھی۔ مگر ریاست نے قرض کی رقم جو سود کے ہمراہ ستائیس کروڑ روپے تک متجاوز ہو چکی تھی، کو تاریخ ادائیگی سے چھتیس سال پیشتر ادا کر کے اپنی مضبوط معیشت کا ثبوت دیا۔ ریاست بہاول پور کا محکمہ حساب و خزانہ جات تمام آمدنی و خرچ کا ریکارڈ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ جمع شدہ نقدی، سونا، چاندی اور دیگر قیمتی اشیا کی حفاظت کرتا تھا۔ چونکہ ریاست بہاول پور زرعی معیشت کی حامل تھی اس لیے زراعت اور اس سے وابستہ افراد کی ترقی اور بہبود کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔ مثلاً ریاست کے لاکھوں ایکٹر غیر آباد رقبے کو زیر کاشت لانے کے لیے بیرون ریاست سے زراعت پیشہ اقوام کو انتہائی آسان شرائط پر اراضی تفویض کی گئی۔ مگر اس سلسلے میں نہ تو کسی قسم کے تحفظات کو ملحوظ رکھا گیا اور نہ ہی مستقبل کے لیے کوئی پیش بندی کی گئی۔ ریاست کی زرخیز زمینوں سے معاشی مفاد حاصل کرنے والوں میں ایسے طبقات پیش پیش تھے جن کا زراعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً حکومت ہند کے دباؤ پر برطانوی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو فوجی گرانٹس کی صورت میں ہزارہا ایکٹر اراضی سے نوازا گیا۔ یہ قبیح رسم قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک جاری ہے، جس کی رو سے حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجیوں کو کئی چک الاٹ کیے جا چکے ہیں۔ اس لوٹ کھسوٹ میں بیوروکریسی اور معمولی اہلکاران نے بھی خوب ہاتھ رنگے۔ ہر دور کا برسر اقتدار سیاسی ٹولہ بھی اس بندر بانٹ میں شامل رہا۔ ان بارسوخ طبقات نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی الاٹ شدہ زمینوں کا تبادلہ زیادہ بہتر مقامات پر کرایا، انہیں آباد کرنے کے لیے سرکاری مشینری اور وسائل کا بلا دریغ استعمال کیا۔ نہری پانی اور سڑکوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کی۔ غیر زراعت پیشہ افراد کو رقبہ جات کی بطور انعام تفویض. کاشتکار طبقہ اور خصوصاً مقامی باشندوں کا سخت استحصال ہوا۔ اسی مراعات یافتہ طبقہ نے خود کاشت کی

بجائے چھوٹے آباد کاروں اور مقامی مزارعین کی محنت کو بروئے کارلا کر اپنی مملوکہ اراضی کو آباد کیا ۔ جب کہ ان میں سے بیشتر نے موقع محل کی مناسبت سے اپنے رقبہ جات کو اونے پونے داموں فروخت کر کے بڑے شہروں کے ڈیفنس ایریاز میں رہائش پذیر ہوئے اور یہاں سے کمائے جانے والی رقم سے دوسری جگہ سرمایہ کاری کرنے کو ترجیح دی۔

آباد کاری سے متعلق ناقص منصوبہ بندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اراضی کے حصول کے لیے کوئی حد مقرر نہ کی گئی۔۱۹۰۸ء کے " قانون تعہد اراضیات کے تحت کوئی بھی آباد کار صرف ڈیڑھ روپیہ فی دیکھ کے حساب سے ایک ہزار دیکھے تک اراضی حاصل کر سکتا تھا۔جب کہ رقم کی ادائیگی، زمین کی قسم کے مطابق بارہ سال سے بیس سال کے عرصے میں بذریعہ اقساط ادا کرنا ہوتی تھی ۳۲۔حالانکہ زرعی نظام کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ جاگیرداری کے رجحان کو روکا جاتا۔ آباد کاری کے لیے فی خاندان اراضی کی اتنی حد مقرر کی جاتی جسے با آسانی کاشت کیا جاسکتا۔ ایک ہی فرد یا خاندان کو نوازنے کی بجائے مزید خاندانوں کی معاشی کفالت کا اہتمام کیا جاتا۔ مگر کوئی ضابطہ نہ ہونے کی وجہ سے چند بڑے زمینداروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جس نے مقامی اور قومی سیاست میں وارد ہو کر ہر دور کی آمرانہ اور غیر جمہوری طاقتوں کی پشت پناہی کو اپنا شعار بنایا۔ اس قسم کے آباد کارانہ نظام کے نتیجے میں مقامی آبادی کے حقوق بری طرح سے متاثر ہوئے۔ ریاستی حکومت سے یہ بڑی کوتاہی ہوئی کہ مقامی کاشتکار طبقہ کے لیے مستقل بنیادوں پر آباد کاری کے علاقوں میں کسی قسم کا کوئی کونہ مختص نہ کیا گیا۔ نتیجتاً ریاست میں زرعی معیشت کی ترقی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ثمرات سے زیادہ تر آباد کار طبقہ ہی مستفید ہوا اور مقامی افراد اپنی سہل پسندی اور ک اور حکومت کی بے اعتنائی و بے توجہی کی وجہ سے اس معاشی دوڑ میں کوئی پیش رفت نہ کر سکے۔ یہی وہ عوامل تھے جو بعد ازاں مقامی اور غیر مقامی آبادی میں معاشی و معاشرتی عدم توازن کا سبب بنے۔

خصوصاً دیہی معاشرے میں یہ فرق آج بھی نمایاں ہے۔ ریاست میں آباد کاری کے نتیجے میں اگرچہ معاشی ترقی کو مہمیز ملی مگر اس کے ساتھ ہی یہاں کی قدیم معاشرتی و اخلاقی اقدار بھی متاثر ہوئیں۔ خاص طور رشوت، بد عنوانی اور اقربا پروری جیسی قباحتوں نے در اندازی کی، مگر اس کے ساتھ ساتھ آباد کاری نے یہاں کے جامد معاشرے رے میں کئی تبدیلیاں پیدا کیں۔ مقامی آبادی میں جذبہ مسابقت پیدا ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پردے کی نارو ابندشوں سے یہاں کی مقامی خواتین کو ایک حد تک آزادی ملی، جس سے ان میں تعلیم اور ترقی کے حصول کی ترغیب ہوئی۔ مگر آباد کاری کی اس غیر متوازن پالیسی سے قطع نظر امیر ان بہاول پور نے کاشت کار طبقہ کی بہبود کے لیے کئی مثبت اقدامات کیے۔ یہاں کا زمین دار طبقہ صدیوں سے ہندو ساہو کار کے استحصال کا شکار ہو تا رہا تھا۔ وہ اپنے کھاتوں میں قرض کی رقم کو بڑھا چڑھا کر لکھ لیتے، اس پر سود در سود کا اضافہ کرتے جاتے۔ اس طرح ایک بار قرض لینے والا پھر کبھی ان کے چنگل سے نکل نہ پاتا اور جلد یا بدیر نتیجہ مدعیون کی گرفتاری اور جائداد مرہونہ کی کرتی پر منتج ہوتا۔ چنانچہ اس کے تدارک کے لیے، انیسویں صدی کے اختتام پر سود در سوڈ" کے نظام کے خلاف قانون سازی کی گئی ۳۳۔ قانون معیادِ سماعت کے تحت قدیم سودی مقدمات پر پابندی لگادی گئی۔ مقروض کی گرفتاری یا اس کی فصل اور آلات کشاورزی کی ضبطی کی ممانعت کر دی گئی۔ سود کی شرح مقرر کر دی گئی۔ حکومت نے دیہی عوام کو کم شرح سود پر قرض کی فراہمی کے لیے کو آپریٹو سوسائٹیوں کے قیام میں معاونت فراہم کی۔ علاوہ ازیں زراعت پیشہ افراد کو اہلکاران ریاست کی چیرہ دستیوں سے تحفظ کے لیے ضوابط بنائے۔ نواب اور عمال ریاست کے دوروں کے دوران رسد کی فراہمی اور مفت اشیاء کی وصولی کی ممانعت کر دی گئی۔ ۱۹۱۰ء میں نہروں اور بھل صفائی کے لیے لی جانے والی جبری مشقت (چھیہ ٹر بندی) کا خاتمہ کر دیا گیا ۳۴ ۔ آفاتِ ارضی و سماوی کی صورت میں مالیہ اور آبیانہ میں معافی اور چھوٹ کی رعایت دی جاتی تھی۔ مگر

زرعی پیداوار کی ترقی اور کسانوں کی رہنمائی کے لیے عملی اقدامات کا آغاز ۱۹۲۷ء میں محکمہ اصلاح دیہات اور ۱۹۴۱ء میں محکمہ زراعت کے قیام سے ہوا۳۵۔ اس کے تحت زرعی شعبہ میں جدید یدید تحقیق اور طریقوں سے متعلق آگاہی پیدا کی گئی۔ بیجوں کی اعلیٰ اقسام اور جدید آلات زرعی کی فراہمی کا آغاز کیا گیا۔ قدرتی کھاد کی تیاری اور استعمال کے طریقے سے آگاہ کیا گیا، فصلوں کی بیماریوں کے تدارک، کیڑوں، سنڈیوں اور ٹڈی دل کے اتلاف کے لیے اقدامات کیے گئے۔ ریاست بھر میں باغات لگانے کے لیے فروٹ نرسری قائم کی گئی۔ زراعت کی عملی تربیت کے لیے ٹریننگ سکول قائم کیا گیا۔ زرعی اجناس سے متعلق مارکیٹ ایکٹ، مارکیٹ کمیٹیوں اور منڈیوں کا قیام عمل میں آیا۔ غرض کہ قیام پاکستان کے وقت زرعی معیشت انتہائی سرعت سے ترقی کی طرف گامزن تھی۳۶۔ مگر ریاست کے قدیم جاگیر دارانہ نظام میں اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ اس طرح زمیندار اور مزارعین کے درمیان بہتر تعلقات استوار کرنے کے لیے کوئی شعوری کوشش نہ کی گئی۔ مزارعین کے حقوق سے متعلق کسی قسم کی قانون سازی کی ضرورت کو محسوس نہ کیا گیا۔ البتہ امیران بہاول پور نے ہر دور میں مزارمین کی ذات اور عزت پر ہونے والی زیادتیوں کا فوری اور سختی سے نوٹس لیا۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ریاست بہاول پور کی زرعی معیشت کا انحصار نہری آب پاشی کے مؤثر نظام کے بغیر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس کا آغاز ۱۸۷۷ء میں ایک سو میں میل لمی فورڈواہ نہر کی تعمیر سے ہوا۳۷۔ اگرچہ نواب محمد بہاول خاں خامس کے دور تک دریاؤں سے براہ راست نہریں نکال کر زمینوں کو سیراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر ایسی نہریں صرف دریا میں مکمل طور پر پانی آنے کے دوران ہی چلتی تھیں اور پھر ان کے دہانے جلد ہی مٹی اٹ جانے سے بند ہو جاتے تھے۔ اس طرح پانی کو کنٹرول کرنے کے نظام کی عدم موجودگی کی وجہ سے سیلاب کے دوران فصلیں تباہ ہو جاتیں اور بہت زیادہ علاقہ زیر آب آجاتا۔ علاوہ ازیں ایسی نہروں سے زیادہ رقبہ کی آب پاشی ممکن نہ

تھی۔ اس مقصد کے لیے ریاست کی اٹھائیں لاکھ پچیس ہزار ایکٹر اراضی کو سیر اب کرنے کے لیے ستلج ویلی پراجیکٹ" کے نام سے انتہائی ترقی یافتہ نہری نظام کا قیام عمل میں لایا گیا ۳۸۔ اس من۔ اس منصوبے کی تکمیل اور اجرا کے کچھ ہی عرصے بعد اہی عرصے بعد اس کے ثمرات سامنے آئے۔ ریاست کی سالانہ آمدن اپنی انتہائی حد کو جا کاہلی اور اسے بر صغیر کے اناج گھر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ آب پاشی کے اس جدید منصوبے کی بدولت کم و بیش دس لاکھ انسانوں کو فائدہ ہو ۳۹۔ مگر تقسیمِ ملک کے بعد ریاست بہاول پور کو پاکستان سے الحاق کرنے کی یہ سزا دی گئی کہ اس کی سرزمین کو صدیوں۔ سیر اب کرنے والے دریائے ستلج اور دریائے بیاس کے پانی سے محروم کر دیا گیا۔ حالانکہ ۱۸۳۳ء کے اینگلو بہاول پور معاہدے کی رو سے ریاست بیاول پور کے شمال میں واقع دریائی پٹی جو پنجاب کے ے پانچ دریاوں پر مشتمل تھی ریاست بہاول پور کے حق کو تسلیم کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی کشتیاں بہاول پور کی دریائی گزر گاہ سے گزرنے کے دوران اسے کسٹم ڈیوٹی دینے کی پابند تھیں ۴۰۔ اسی موقف کی بنیاد پر پنجاب باؤنڈری کمیشن کے پاکستانی نمائندے جسٹس دین محمد نے ریاست بہاول پور کے نظام آب پاشی کے حوالے سے دریائے ستلج پر اس کے حق کی بھرپور وکالت کی۔ مگر جیسے ہی ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ثالثی کمیشن کی مدت کار ختم ہوئی بھارت نے فیروز پور ہیڈ ورکس سے پاکستانی علاقے کو سیر اب کرنے والی نہروں کا پانی منقطع کر دیا اس کے نتیجے میں ریاست بہاول پور کو پانی مہیا کرنے والی ایسٹرن گرے کینال" بھی بند کر دی گئی۔ اور اس کے بعد سندھ طابق معاہدہ ۱۹۶۰ء کے مطابق بہاول پور کو دریائے ستلج اور بیاس کے پانی سے محروم کر دیا گیا۔ اس سے آئندہ کے لیے ریاست کی زرعی معیشت پر بہت بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ آب پاشی کے نئے نظام کے تحت بہاول پور کی لاکھوں ایکٹر اراضی کے لیے اس کی ضرورت سے بہت کم پانی مختص کیا گیا۔ موجودہ دور میں ضرورت اس امر کی ہے کہ مستقبل کے مجوزہ ڈیموں سے موجودہ خطہ بہاول

پور کے لیے اتنا وافر کوٹہ مختص کیا جائے جس سے نا صرف اس کے موجودہ زیر کاشت رقبہ کو خاطر خواہ مقدار میں پانی مل سکے بلکہ نئی نہروں کے اجرا سے بہاول پور کے میں ہزار دو سو مربع کلو میٹر چولستان یہ تمام عمارات شکست و کو سرسبز و شاداب خطے میں تبدیل کر کے پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک زرعی ملک بنایا جا سکے۔

ریاست بہاول پور نے تعمیر و ترقی اور مواصلات کے شعبوں میں خاطر خواہ ترقی کی۔ ۱۸۶۸ء میں پبلک ورکس کے محکمہ کے باقاعدہ قیام کے بعد شاہی اور سول عمارات کی تعمیر کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ سکولوں اور صحت کے مراکز تعمیر کیے گئے۔ ان میں سے اکثر عمارات اب تک دفاتر اور رفاہی اداروں کے طور پر کام آ رہی ہیں۔ خصوصا نور محل، دولت خانہ، صادق گڑھ پیلس اور بہاول گڑھ کے محلات اِن میں مبارک محل (دَربار محل)، نشاط محل، ھرخ محل اور گلزار محل شامل ہیں کا شمار اپنے طرز تعمیر کے اعتبار سے برصغیر پاک و ہند کی شاندار عمارات میں ہوتا ہے۔ ریاست بہاول پور کے ادغام اور نواب صادق محمد خاں خامس کی وفات کے بعد سے ریات کا شکار ہو گئیں۔ ان محلات کا طرز تعمیر مسلم عہد کی عمارات کے علاوہ یورپ کی اہم عمارات سے مخلوط تھا۔ اس طرح انہیں محرابوں اور دوہری دیواروں سے مضبوطی دی گئی۔ بلند و بالا چھتوں، بالکونیوں، گنبدوں ' جھروکوں سے ان میں عظمت و جلال پیدا کیا گیا۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے ریاست بہاول پور کی دیگر عمارات میں موجودہ ایس۔ ڈی ہائی سکول اور سنٹرل لائبریری فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ دورِ حاضر کے ماہرین تعمیرات اور نقشہ ساز ان فنی خصوصیات کو بروئے کار لاتے ہوئے مستقبل کے لیے تعمیر کی جانے والی عمارات کو زیادہ دیدہ زیب اور موسمی و ماحولیاتی ضروریات کے مطابق بنانے میں معاونت فراہم کر سکتے ہیں۔ ریاست نے سرکاری طور پر زیر استعمال آنے والی دھاتی، چوبی اور ڈھلائی کی اشیا کی تیاری کے علاوہ برف سازی اور خشت سازی تک میں خود انحصاری کے لیے حکومتی سطح پر کارخانے

اگائے۔ یہاں تیار کی جانے والی اشیا بہت معیاری ہوتی تھیں، جن میں مقامی خام مال استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں مقامی کاریگر کام کرتے تھے۔ یہاں نو آموز شاگرد پیشہ نوجوانوں کو عملی تربیت بھی فراہم کی جاتی تھی ۴۲۔ مگر یہ بات قابل افسوس ہے کہ ریاستی حکومت کی طرف سے مقامی خام مال سے بڑے پیمانے پر صنعتوں کے قیام کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب نہ کیا گیا۔ بلکہ قیام پاکستان۔ بعد بھی اس علاقے کو صنعتی اعتبار سے پس ماندہ رکھا گیا۔

ریاست بہاول پور نے فلاحی مملکت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عوام کی تعلیمی ترقی کے لیے بھرپور کوشش کی۔ ۱۸۶۶ء سے قبل مساجد اور خانقاہوں سے متصل جو دینی تعلیم کے مکاتب قائم تھے، ان کے قیام اور سرپرستی میں امیران بہاول پور نے بھرپور معاونت فراہم کی۔ مگر بدلتے ہوئے حالات کے مطابق جدید انگریزی تعلیم کی ترویج کی ضرورت تھی۔ جس کا آغاز ۱۸۶۷ء میں مشن سکول بہاول پور کے قیام سے ہوا ۴۳۔ اس کے نصاب میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو کی تعلیم بھی شامل تھی۔ مگر یہ اینگلو ورنیکر سکول چونکہ تمام ریاست کی تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے ۱۸۶۸-۶۹ء کے دوران ریاست کے تمام اہم شہروں میں ورنیکر سکولوں کا قیام عمل میں آیا۔ پہلی ایجینسی کے دور کو ریاست میں جدید تعلیم کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اس بارہ سالہ ارتقائی عرصہ کے دوران ۱۸۷۰ء میں محکمہ تعلیم کا قیام عمل میں آیا ۴۴۔ یکم اگست ۱۸۷۱ء سے اساتذہ کی تربیت کے لئے مدرستہ المعلمین (نارمل سکول) بہاول پور کا قیام عمل میں آیا۔ اس مدرسہ میں ناصرف دیہی سکولوں کے اساتذہ اور ورنیکلر سکولوں کے فارغ التحصیل طلبا کو علم تدریس کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ اس کا دوسرا حصہ اینگلو ورنیکر مڈل سکول کا درجہ کے رکھتا تھا ۴۵۔ اس طرح مشن سکول کے بعد یہ ریاستی وسائل سے قائم ہونے والا دوسرا مڈل سکول تھا جہاں انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ وہی ادارہ تھا جس کے مدرستہ المعلمین نے نہ صرف ریاست بھر کے ابتدائی تعلیم کے

دیہی سکولوں کے اساتذہ کو تربیت فراہم کرنے میں معاونت فراہم کی بلکہ نئے اساتذہ کی کھیپ بھی تیار کی۔ اگرچہ برطانوی ہند کے ٹیچرز ٹریننگ سکولوں کے مقابلے میں یہ کم معیار کا ادارہ تھا، مگر اس سے منسلک اینگلو ورنیکلر مڈل سکول اس لحاظ۔ قابلِ ذکر ہے کہ اس نے ۱۸۸۲ء میں ریاست کے پہلے ہائی سکول ایجرٹن ہائی سکول) اور ۱۸۸۶ء میں ریاست کے پہلے کالج (صادق ایجرٹن کالج) کے درجے پر ترقی حاصل کی۔ اس دور میں انھی اداروں کی بدولت بہاول پور کو لاہور کے بعد ایک اہم علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ہم بجا طور پر یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جس وقت سر سید احمد خان برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے کوشاں تھے، عین اسی وقت ریاست بہاول پور اس خطے میں انھی مقاصد کی تکمیل میں سے معنون کیا جاتا تھا۔ اس درس گاہ میں دینی اور مشرقی علوم کے علاوہ انگریزی تعلیم کا بھی اہتمام تھا۔ علاوہ ازیں طب مشرقی یا طب یونانی کے حکما کی تربیت کے لیے عباسیہ طبیہ کالج کے نام سے علیحدہ شعبہ قائم تھا۔ اس طرح اس کا شعبہ "شیخ التشریع الاسلامی فتوی نویسی کی تعلیم کے علاوہ عوام کی رہنمائی کے لیے فتاوی جات بھی جاری کرتا تھا ۵۰۔ جامعہ عباسیہ کو برصغیر پاک وہند کے نامور علماء کرام کی خدمات میسر رہیں۔ اس کے نصاب کی تدوین نو میں سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا ظفر احمد انصاری اور اور ٹیل کالج لاہور کے مولانا محمد شفیع جیسے نامور اصحاب شامل تھے ۵۱۔ ریاست کی طرف سے ملنے والی بھرپور مالی معاونت کے باعث جامعہ عباسیہ نے بہت ترقی کی۔ یہاں علم حاصل کرنے کے لیے برصغیر پاک وہند کے علاوہ افغانستان تک سے طلبا آتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ریاست میں بشمول جامعہ تمام مدارس عربیہ میں مفت تعو تعلیم کا انتظام تھا۔ اس جامعہ کے ساتھ ریاست کے متعدد دینی مدارس کا الحاق تھا۔ یہاں کے فارغ التحصیل علماء کرام کسی خاص مسلک کی تبلیغ یا اسلام کی فروعات پر بحث و تمحیص کی بجائے اُمت مسلمہ میں اتحاد و یگانگت کے جذبے کی آبیاری کرتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں جامعہ عباسیہ کا نام بدل

کر جامعہ اسلامیہ رکھا گیا جب کہ ۱۹۷۵ء میں اس کی خالصتاً دینی حیثیت ختم کر کے اسے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے نام سے معنون کر دیا گیا۔

ریاست بہاول پور خواتین کی مذہبی تعلیم کی اہمیت سے ؟سے بھی آگاہ تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ۱۸۸۴ء میں ایک مدرسہ قو قائم کیا گیا جہاں قرآن پاک کی تدریس کے علاوہ روزمرہ کے شرعی مسائل کی تعلیم کا انتظام بھی تھا ۵۲۔ اس طرح ۱۹۰۶ء میں پہلی بار لڑکیوں کی جدید تعلیم کے لیے گرلز سکول قائم کیا گیا ۵۳۔ یہ یقیناً ایک انقلابی قدم تھا۔ کیونکہ ریاست کا دقیانوسی معاشرہ عورتوں کی تعلیم کا مخالف تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کو خواتین کی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس نقطہ نظر کی ترویج میں ریاست کے پہلے گرلز سکول نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ کونسل آف ریجنسی (۱۹۰۷ء تا ۱۹۲۴ء) کے دور میں مزید تعلیمی اصلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ بات باعث تشویش تھی کہ ریاست میں تعلیمی ادارے تو موجود تھے مگر تعلیم کے درجات بڑھنے کے ساتھ ساتھ ریاستی طلبا کی تعداد میں بتدریج کمی اور غیر ریاستی طلبا کے تناسب میں اضافہ کا رُجحان پایا جاتا تھا۔ مثلاً پرائمری درجہ میں تو مقامی طلبہ اٹھانوے فی صد تھے۔ مگر ہائی سکول میں ان کا تناسب تینتالیس فی صد اور کالج میں ان کی تعداد صرف پندرہ فی صد تھی۔ اس طرح اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں ریاستی مسلم طلبا کا تناسب، ریاستی ہندو طلبا کے مقابلے میں انتہائی کم تھا۔ مثلاً کالج میں صرف دو فی صد مقامی مسلمان طلبا داخل تھے۔ جب کہ مقامی ہندو طلبا کی تعداد تیرہ فی صد تھی ۵۴۔

نواب صادق محمد خاں خاص کے دور میں تعلیم کے شعبے کو اپنی معراج تک پہنچایا گیا۔ اگر آپ کو اپنے عہد کا سرسید کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس دور میں تعلیم کی وزارت قائم کی گئی اور اس عہدے پر علی گڑھ کے ایک پوسٹ گریجوئیٹ فارغ التحصیل کو تعینات کیا گیا۔ اگرچہ اس عہد میں ریاست تلج ویلی پراجیکٹ اور جنگ عظیم دوم کی وجہ سے شدید معاشی بحران کا شکار رہی مگر اس کے باوجود تعلیم کے

فروغ سے پہلو تہی اختیار نہ کی گئی۔ تعلیمی ذمہ داریوں میں بلدیاتی اداروں کو شامل کیا گیا۔ پرائمری تعلیم کو لازمی قرار دے دیا گیا۵۵۔ نواب مذکورہ کے دور میں کالج کی تعلیم میں بھی دوررس تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ ۱۹۴۵ء میں بہاول نگر میں ریاست کا دوسرا کالج قائم ہوا۵۶۔ ایس۔ ای۔ کالج کے تقسیم اسناد کے جلسوں میں سید سلیمان ندوی، خلیفہ شجاع الدین، ایس۔ پی سنہا، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر ضیاء الدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی نامور شخصیات کو مدعو کیا جاتا رہا۔ اس کالج نے کھیلوں میں بھی خوب نام پیدا کیا۔ نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ریاست کے پاکستان سے الحاق کے وقت ریاست بھر میں اٹھائیس گرلز سکول قائم تھے جہاں ایک ہزار ایک سو چونسٹھ طالبات زیر تعلیم تھیں ۵۸۔ یقیناً ایک ایسا معاشرہ جہاں عورتوں پر کئی طرح کی قدغنیں عائد تھیں، اس میں ان کے لیے تعلیم کے دروازے واء ہو جانا ایک مثبت پیش رفت تھی۔ نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں فنی، زرعی، کمرشل اور نابینا افراد کی تعلیم کے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۴۰ء میں "سب آرڈی نیٹ انجینیئرنگ کالج کے قیام سے مقامی طور پر ریاست کے محکمہ انہار، پبلک ورکس، کارخانہ جات سرکاری اور جزٹینگ اسٹیشن کے لیے سب انجینئرز کی کھیپ تیار کرنے میں مدد ملی ۵۹۔ یہی وہ ادارہ تھا جس نے بعد ازاں پولی ٹیکنک" کا درجہ حاصل کیا۔ اس طرح ۱۹۴۲ء میں اہل فن و حرفہ کی تربیت کے لیے بہاول پور میں انڈسٹریل سکول کے قیام سے صنعتی اشیاء کی تیاری کا آغاز ہوا ۶۰۔ جب کہ ۱۹۴۶ء میں زراعتی تربیت کے ادارے کے قیام سے زراعت پیشہ افراد کو جدید طریقہ ہائے کاشت سے آگاہی ملی ۶۱ - ۱۹۴۵ء میں "صادق کمرشل انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تربیت یافتہ دفتری عملے کی فراہمی میں مدد ملی۔ ریاست نے ۱۹۴۳ء میں نابینا افراد کی تعلیم اور انہیں پیشہ ورانہ تربیت فراہم کرنے کے لیے سکول قائم کیا جسے اقوام متحدہ کی طرف سے ایشیاء بھر میں اپنی نوعیت کا بہترین ادارہ قرار دیا گیا ۶۲۔ اس کے علاوہ ریاست میں

شرح خواندگی کو بڑھانے کے لیے ۱۹۳۹ء میں تعلیم بالغاں کے پروگرام کو پورے شدومد سے شروع کیا گیا۶۳۔ مگر اسی دور میں انجینئیرنگ، میڈیکل، زراعت اور قانون کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی ادارہ قائم نہ ہو سکا۔ چنانچہ ان علوم کی تحصیل کے لیے باصلاحیت نوجوانوں کو وظائف پر اندرون ملک اور برطانیہ بھیجا جاتا تھا۔ یہی وہ ماہرین تھے جنہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ریاست کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تعلیم کے فروغ میں کتب خانوں کے قیام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بہاول پور میں صادق ریڈنگ لائبریری کے علاوہ سترہ دیگر چھوٹے بڑے کتب خانوں اور ریڈنگ رومز نے تعلیمی ترقی میں بھرپور معاونت فراہم کی ۶۴۔

ریاست بہاول پور میں باقاعدہ طور پر عوام کو طبی سہولیات کی فراہمی کا آغاز ۱۸۶۷ء میں ہوا ۶۵۔ تربیت یافتہ ڈاکٹروں اور اور پیرامیڈیکل عملے کی عدم دستیابی اور ہسپتالوں کے لیے عمارات کی غیر موجودگی جیسے مسائل درپیش تھے۔ چنانچہ اس صورتِ حال میں محکمہ صحت کا قیام عمل میں آیا، جو اپنے آغاز میں صرف ایک چیف میڈیکل آفیسر، ایک کلرک اور ایک چپڑاسی پر مشتمل تھا، مگر انیسویں صدی کے اختتام تک بہاول پور کے صدر ہسپتال کے علاوہ دیگر آٹھ بڑے شہروں میں شفاخانے قائم ہو چکے تھے جہاں جدید طریقہ علاج مروج تھا۔ بہاول پور اور خان پور کے ہسپتالوں میں تو بڑے آپریشن بھی کیے جاتے تھے۔ دماغی امراض میں مبتلا افراد کے علاج کے لیے چھ ہسپتالوں میں علیحدہ وارڈز مختص تھے۔ اگرچہ خواتین کو ہر ہسپتال میں علاج معالجے کی سہولت میسر تھی مگر ۱۸۹۲ء میں زنانہ جوبلی ہسپتال کے نام سے دارالحکومت میں ایک بڑا ہسپتال قائم کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں اسے ایک بڑی عمارت میں منتقل کیا گیا تو خواتین کو وسیع پیمانے پر پہلے سے زیادہ بہتر ماحول میں جدید طبی سہولتیں میسر آئیں۔ اس طرح ۱۹۳۵ء میں بہاول نگر میں اور ۱۹۴۵ء کے دوران احمد پور شرقیہ میں بھی علیحدہ سے زنانہ ہسپتالوں کا قیام عمل میں آیا، جن کی علیحدہ حیثیت قیامِ پاکستان کے

بعد ختم کر دی گئی۔ خواتین کے ان تمام علاج علیحدہ ہسپتالوں کی ضرورت اس لیے زیادہ تھی کہ مقامی معاشرے میں عورتوں کا مرد معالجین -کرانا انتہائی معیوب اور باعث شرم سمجھا جاتا تھا۔ حتی کہ عمومی امراض کے علاج کے لیے بھی عورتیں ڈاکٹر کے سامنے آنے کی بجائے وہاں پر تعینات دائیوں کو اپنے مرض کی کیفیت بیان کرتیں اور بالواسطہ طور پر دوائی حاصل کرتیں۔ اس صورت حال میں خصوصیت سے امراض نسواں کے علاج اور زچگی کے مقاصد کے لیے زنانہ ہسپتالوں کا قیام ایک نعمت غیر مترکہ بہ سے کم نہ تھا۔ ریاست بہاول پور کے محکمہ صحت کی طرف سے چیچک، طاعون، ہیضہ، ملیریا اور دیگر امراض اکثر وبائی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے تدارک کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی، ویکسین کا استعمال، جراثیم کشی کا طریقہ، وبائی امراض میں مبتلا افراد سے دوسرے لوگوں کو محفوظ رکھنے کے لیے قرنطینہ کے انتظامات، مکھیوں، مچھروں اور موذی جانوروں کے اتلاف کا انتظام محکمہ صحت کے فرائض میں شامل تھا۔ ریاست کی میونسپل کمیٹیاں شہروں میں صفائی اور حفظانِ صحت کے قواعد پر عمل درآمد کے سلسلے میں چیف میڈیکل آفیسر کے تابع تھیں، جسے چیف سینٹری انسپکٹر اور ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کے اختیارات حاصل تھے۶۷۔ اس طرح موجودہ دور میں خطرناک بیماریوں اور وباؤں کی روک تھام کے لیے محکمہ صحت اور بلدیاتی اداروں کو باہمی اشتراک سے حکمت عملی مرتب کرنے کی ضرورت : ہے۔ ۱۸۶۸ء میں محکمہ صحت کو موسمیات کا شعبہ بھی تفویض کیا گیا۔ بہاول پور کے صدر ہسپتال میں نصب آلات کی مدد سے موسمیاتی کیفیت کا ریکارڈ اکٹھا کرنے کے علاوہ ریاست کے تمام اہم مقامات کے موسمی حالات کی تفصیلات بھی جمع کی جاتی تھیں اور انہیں ریاست کے صادق الاخبار گزٹ میں شائع کیا جاتا تھا۔ اس موسمیاتی ریکارڈ کی مدد سے متو متوقع بیماریوں اور وباؤں کا اندازہ لگانے اور ان سے تحفظ کے لیے پیش بندی کر لی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں اس سے فصلوں کی کاشت سے متعلق رہنمائی بھی حاصل کی جاتی ۱۸۷۰ء میں محکمہ

صحت کو شرح پیدائش اور اموا اور اموات کا ریکارڈ مرتب کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی ۶۸۔ اس سے افزائشِ آبادی کے مطابق مستقبل کی منصوبہ بندی میں مدد ملتی تھی۔ ۱۸۷۲ء سے محکمہ صحت نے عدلیہ کو فوجداری مقدمات میں معاونت فراہم کرنے کے لیے شعبہ طب قانونی کا اجرا کیا ۶۹ ۔ اس شعبے کو مزید ترقی اس وقت ملی جب ۱۹۴۰ء میں اس مقصد کے لیے "مرکزی تجزیاتی لیبارٹری کا قیام عمل میں آیا۔ اس لیبارٹری میں مریضوں کے بعض پیچیدہ ٹیسٹ بھی کیے جاتے تھے ۔ یہ اعزاز ریاست بہاول پور کو حاصل ہے کہ اس کے عوام کو بلا تخصیص مفت علاج معالجے کی سہولت میسر رہی۔ ہر قسم کی ادویات سرکاری شفاخانوں سے فراہم کی جاتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک ریاست بھر میں نہ تو کوئی میڈیکل سٹور قائم ہوا اور نہ ہی کسی نیست کی دوکان کھلی۔ اپریشن کی صورت میں تمام تر انتظام و انصرام ہسپتال انتظامیہ کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ ان ڈور مریضوں کو معیاری یا پرہیزی خوراک اور دودھ تک فراہم کیا جاتا تھا۔ انہیں آلودگی سے پاک لباس بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ ریاست بہاول پور کی یہ رفاہی حکمت عملی اس قدر عوامی مقبولیت کی حامل تھی کہ اسے ریاست کے دن یونٹ میں ادغام کے کافی عرصہ بعد تک جاری رکھنا پڑا۔ اس طرح موجودہ دور کے ڈاکٹروں کے عمومی مادیت پرستی کے رویے کے برعکس اس دور کے ڈاکٹروں میں ایثار و قربانی کا جذبہ اس قدر موجزن تھا کہ وہ ہمہ وقت دُکھی انسانیت کی خدمت کو اپنا فریضہ تصور کرتے تھے۔ وہ ہسپتال کے اوقات کے علاوہ بھی اپنے گھروں پر مریضوں کا بغیر فیس علاج کرتے۔ لاچار مریضوں اور مستوارت کی درخواست پر ان کے گھروں پر پہنچ کر ان کا بلا معاوضہ معائینہ کرتے اے۔ دراصل ریاست کی طرف سے محکمہ صحت کے عملے کو شروع سے ہی دُکھی انسانیت کی خدمت کے لیے خود کو وقف رکھنے کے لیے قواعد مرتب کیے گئے۔ چنانچہ انہیں اپنی پیشہ ورانہ خدمات کی ادائیگی میں سہولت بہم پہنچانے کے لیے ہسپتال کے احاطہ میں ہی رہائش گاہیں فراہم کی گئیں، تاکہ کسی بھی

ایمر جنسی کی صورت میں انہیں مریضوں تک پہنچنے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔ وہ پابند تھے کہ اپنے اوقات کار کا زیادہ سے زیادہ حصہ مریضوں کے ساتھ گزاریں۔ ایسے مریض جن کے ساتھ ان کے لواحقین موجود نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تیمار داری کا تمام تر فریضہ ہسپتال ملازمین کے سپرد تھا۔ ریاست بہاول پور میں ۱۹۴۷ء تک سرکاری ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پریکٹس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مگر اس کے برعکس موجودہ دور کے سرکاری ڈاکٹروں نے پرائیویٹ پریکٹس کو اپنا حق بنالیا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے ہسپتالوں میں تفویض کردہ منصبی ذمہ داری کو دل جمعی سے انجام دینے کے بجائے اپنی سرکاری رہائش گاہوں کو پرائیویٹ پریکٹس کے مراکز میں تبدیل کر ڈالا ہے، ان کے پرائیویٹ کلینک اور آپریشن تھیٹر بلا حیل و حجت دیکھی اور مجبور انسانیت کی خدمت کی بجائے ان کا جبراً استحصال کرنے میں مصروف ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد کم از کم اس مقدس پیشے سے منسلک افراد پہلے سے بھی زیادہ خدمت کو اپنا نصب العین بناتے۔

بتدریج کمی کرتے ہوئے بالآخر ۱۸۷۶ء میں انہیں بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ ان مصالحتی عدالتوں کی بڑی افادیت تھی کیونکہ ان کے ذریعے بیشتر مقدمات کا فیصلہ بڑے احسن طریقے سے مقامی طور پر ہی طے پا جاتا تھا۔ اس طرح عام عدالتوں پر کام کا بوجھ کم کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اگر ان عدالتوں کو ختم کرنے کی بجائے ان کے نظام کار میں اصلاح کی جاتی تو اس طرح مقامی طور پر ہی لوگوں کو مفت، فوری اور سہل انصاف کی فراہمی کا سلسلہ جاری رہتا۔ کیوں کہ یہ نظام صدیوں سے عوام کے مزاج میں رسوخ رکھتا تھا، اس لیے پنچایتی عدالتوں کی افادیت کے پیش نظر ۱۹۴۳ء سے تمام دیہی علاقوں میں ان کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ پنچائیتوں کے قیام، ان کے فیصلوں اور ان پر عمل درآمد نیز ان عدالتوں کے ممبران کے تقرر، اہلیت اور اختیارات سے متعلق قواعد مرتب ہوئے۔ پنچایتی عدالتیں ریاست کے ون یونٹ میں ادغام تک قائم رکھی گئیں۔ بہتر ہوتا کہ پنچایتی نظام میں مزید اصلاحات

نافذ کی جاتیں اور نہ صرف دیہاتی علاقوں میں بلکہ شہروں میں بھی مصالحتی عدالتیں تشکیل دی جاتیں۔ نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں ریاست میں ریونیو کورٹس" علیحدہ سے قائم تھیں۔ مگر ان کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی سماعت کا اختیار صدر عدالت کی بجائے مشیر مال کی عدالت کو حاصل تھا ہے۔ یقینا یہ بات قرین انصاف نہ تھی کہ مالیاتی امور سے متعلق کی ناانصافی یا بے قاعدگی کی صورت میں ریاست کی عدالت عالیہ تک کو نگرانی یا فیصلہ پر نظر ثانی کا اختیار حاصل نہ ہو۔ ریاست بہاول پور میں سپریم کورٹ کے اختیارات عبوری حکومتوں کے دوران ان کے سربراہان کو حاصل ہوتے تھے۔ مگر امیران بہاول پور کے تخت نشین ہونے کے بعد یہ اختیارات انہیں منتقل ہو جاتے تھے۷۸۔ اپنی اسی حیثیت سے انہیں تمام دیوانی، فوجداری اور مالیاتی اپیلوں کے قطعی فیصلے کے علاوہ سزائے موت کی صورت میں رحم کی اپیل پر سزا کی معافی، تبدیلی یا ۲۱ یا اس کی توثیق کا اختیار حاصل تھا۔ تاہم ہر دور کے حکمران نے عدلیہ کے ان بالاتر اختیارات کے استعمال سے متعلق انفرادی طریقہ کار وضع کیا۔ نواب صادق محمد خاں رابع سپریم کورٹ کے اختیارات اپنے وزیر اعظم کی رائے سے استعمال کرتے تھے ۷۹۔ جب کہ نواب محمد بہاول خاں خامس نے اپنی انتظامی کونسل کے تین ممبران کو سپریم کورٹ کا درجہ دیا، جن کے فیصلوں کی توثیق وہ خود کرتا تھا۔ نواب صادق محمد خاں خامس کے دور حکومت کے ابتدائی سترہ سالوں (۱۹۲۵ء تا ۱۹۴۲ء) کے دوران عدالت عظمی کے اختیارات اس کی کابینہ کو حاصل تھے۔ اس مقصد کے لیے چیف منسٹر کی صدارت میں اجلاس خاص" منعقد ہوتا، جس میں اپیلوں یا نظر ثانی کی درخواستوں کو ممبران کابینہ کی رائے کے لیے پیش کیا جاتا اور کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنے کے بعد ہر رکن اپنی رائے تحریر کرتا، جسے قانونی حیثیت نواب کے توثیقی دستخطوں تھی۔ ۱۹۴۲ء میں اس مقصد کے لیے جوڈیشل کمیٹی" تشکیل دی گئی۔ اس میں ریاست کے چیف جسٹس کے علاوہ کابینہ کے تین لاء گریجویٹ ارکان کو شامل کیا گیا، جو ہائی کورٹ کے جج یا چیف

جسٹس رہ چکے تھے۔ اس میں اقلیتوں کی نمائندگی کے لیے ایک ہندووزیر بھی شامل کیا گیا ۸۰۔ اس اعتبار سے ریاست کے آخری دور میں قائم اعلیٰ اختیارات کی عدالت انصاف اپنی ساخت اور کارکردگی کے اعتبار سے انتہائی صلاحیت کی حامل تھی۔ نواب صادق محمد خاں خامس نے ہمیشہ جوڈیشل کمیٹی“ کی تجاویز سے اتفاق کیا اور کبھی بھی اپنے صوابدیدی اختیارات کے ذریعے اس کے فیصلوں کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کی۔ موجودہ دور میں یہ موجودہ دور میں یہ بات قرین انصاف نہیں کہ سپریم کورٹ کی طرف سے سنائی جانے والی سزائے موت کی سزامیں معافی کا اختیار صدر مم ر مملکت کی ذات کو تفویض کر دیا جائے اور وہ اس سلسلے میں کسی سے مشورہ لینے کا پابند :نہ ہو۔ ریاست کی عدالت عالیہ میں انتہائی نامور جوں نے خدمات انجام دیں۔ ان ججوں کے مشہور فیصلے آج تک زبان زدِ عام و خاص ہونے کے علاوہ عدالتی نظائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ججوں کی فہرست میں خصوصیت سے سید مراد شاہ (۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۲ء)، مولوی محمد دین (۱۹۰۹ء تا۱۹۱۹ء)، میر سراج الدین (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء)، مولوی فضل حسین (۱۹۲۶ء تا ۱۹۴۲ء)، محمد اکبر (۱۹۳۶ء تا۱۹۴۶ء سر عبد القادر (۱۹۴۲ء تا۱۹۴۶ء) اور شیخ ۱۹۴۸ء) شامل ہیں۔ آخری دو جوں نے تو پنجاب ہائی کورٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست بہاول پور میں خدمات انجام دیں۔ ریاست میں ججوں کو بہت عزت و تکریم حاصل تھی، انہیں معقول مشاہرہ جات ملتے تھے۔ ان ججوں نے بھی اپنے پیشے سے خوب انصاف کیا اور اپنے ذاتی کردار کی وجہ نے بدعنوانی۔سے دور رہے۔ ان کی دیانت داری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ چیف جج سید مراد شاہ اور سید فیض الحسن دوران ملازمت مقروض فوت ہوئے اور ان کا قرض ریاست نے ادا کیا۔ ان جوں کی اپنے پیشے سے لگن، انصاف پروری، دیانت داری، لیاقت اور بے باکی موجودہ دور کے جوں کے لیے قابل تقلید مثال کا درجہ رکھتی ہے۔

ریاست بہاول پور میں نئے عدالتی ڈھانچے کی تشکیل کے ساتھ ہی کچھ ایسے ضوابط سامنے آئے جو عوام کے لیے قطعاً پسندیدہ نہ تھے۔ ان میں خصوصیت سے ۱۸۷۱ء سے نافذ العمل کورٹ فیس ایکٹ کا نفاذ سرِفہرست ہیں۔ ریاستی عوام ایک سو تینتالیس سال (۱۷۲۷ء تا ۱۸۷۰ء) تک بالکل مفت انصاف کا حق استعمال کرتے آئے تھے۔ خود امیران بہاول پور بھی بلا معاوضہ انصاف کی فراہمی کو اپنی حکومت کا بنیادی فریضہ تصور کرتے تھے۔ کورٹ فیس کے اطلاق نے ریاستی عدلیہ کو ہمیشہ کے لیے بھاڑے کی ادائیگی پر خدمات انجام دینے والا ادارہ بنا ڈالا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے ضوابط بھی نافذ کیے گئے جن سے مروج عدالتی نظام کی اصلاح ہوئی اور بالواسطہ طور پر عوام کو بھی فائدہ پہنچا۔ مثلاً ریاست میں شروع سے ہی فریقین مقدمہ کی طرف سے وکلا کو عدالتوں میں پیش ہونے پر پابندی لگا دی گئی تاکہ مقدمہ بازی کے رُجحان کو کم کیا جاسکے اور اس کی وجہ سے عوام مفلس ہونے سے بچ جائیں ۸۲۔ علاوہ ازیں وکلا کی غیر موجودگی کی وجہ سے لوگ نہ صرف ان کی بھاری فیسوں سے بچے ہوئے تھے بلکہ اس طرح جوں کو محض حقائق، شہادتوں اور بیانات کو سامنے رکھ کر زیادہ قرین انصاف اور فوری فیصلے کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب عدالتی طریقہ کار میں پیچیدگی کی وجہ سے قوانین کی تشریح و توضیح کی ضرورت محسوس ہوئی اور مقدمات کی تعداد میں اضافہ ہوا تو وکلا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ پہلی بار بہاول پور لیگل پریکٹیشنرز ایکٹ مجریہ ۱۹۴۰ء کی رو سے ارد سے وکلا کو پریکٹس کی اجازت دی گئی ۸۳ موجودہ دور میں اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے معمولی مقدمات میں فریقین کو وکیل کے بغیر پیش ہونے کی اجازت دینی چاہیے۔ ریاست میں جدید نظام عدل کو عوام کے لیے سہل اور قابل قبول بنانے کے لیے اس میں حسب ضرورت اصلاحات کی جاتی رہیں۔ اس طرح ایسے غیر رواجی اور غیر روایتی قوانین جو عوام الناس کے جذبات سے ہم آہنگ نہ تھے انہیں ان کے لیے ممکنہ حد تک قابل قبول بنایا گیا۔

یہاں کے عوام ایک عرصہ سے فوری داد خواہی کے خوگر تھے، چنانچہ اس مقصد کے لیے ججوں کے لیے یہ ضابطہ کار وضع کیا گیا کہ وہ ایک سال کے دوران دائر ہونے والے تمام مقدمات کا تصفیہ ہر صورت میں سال کے آخر تک کر دیں ۸۴۔ عدلیہ کو اپنی سالانہ رپورٹ میں سال کے دوران درج شدہ، فیصلہ شدہ اور غیر فیصلہ شوہ مقدمات کے اعداد و شمار دینے ہوتے تھے اس طرح عدالت عالیہ اپنی ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کی جانچ پڑتال کرتی تھی اور کسی ضابطہ یا عدالتی طریقہ کار کی خلاف ورزی کی صورت میں جواب طلبی کے علاوہ ماتحت جوں کی تنزلی اور برطرفی کے احکامات بھی صادر کیے جاتے تھے ۸۵۔ یہی وہ اقدامات تھے جن کی وجہ سے عوام کا اس وقت کے مروجہ عدالتی نظام پر اعتماد بڑھا اور ان میں انصاف کے حصول کے لیے اپنا قانونی حق استعمال کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ چنانچہ باہمی تنازعات کو بڑھانے کی بجائے اب انہیں عدالتوں کے ذریعے طے کرنے پر ترجیح دی جانے لگی۔ اس طرح ریاست کے سادہ لوح عوام میں انصاف کے حصول کے لیے اپنا قانونی حق استعمال کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ غرض کہ نئے عدالتی نظام کی بدولت زراعت پیشہ طبقہ کو معاشی استحصال سے نجات ملی، تجارت پیشہ افراد، قرض دار اور مقروض افراد کو یکساں طور پر قانونی تحفظ حاصل ہوا۔ کیوں کہ نئ قانونی اصلاحات کے تحت اب دیوانی عدالتوں کو سودی لین دین کے تنازعات میں قابل عمل ضوابط کے تابع کر دیا گیا تھا۔ صدر عدالت اپنی معمول کی ذمہ داریوں کے علاوہ رفاہ عامہ کے مقاصد اور امر باعث تکلیف عامہ جیسے واقعات کو رفع کرنے کے لیے انتظامیہ اور پولیس کو اپنے فل بنچ کے ذریعے احکامات صادر کرتی تھی۔ اس دور میں سرکاری ملازمین، ریاستی فوج اور انتظامیہ و عدلیہ کے عہدہ داران کی اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے دوران روا رکھی جانے والی بے قاعدگیوں، بدعنوانیوں، رشوت ستانی اور عوام پر ظلم و زیادتی کے ارتکاب پر گرفت اور مواخذے کا اختیار عدالت عالیہ کو حاصل تھا۔ اگر تحقیق پر جرم ثابت ہو جاتا تو ملازمت سے برطرفی

کے علاوہ قید اور جرمانے کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ اس طرح انسانی حقوق کی خلاف ورزی یا پامالی کی صورت میں بھی عدلیہ از خود کارروائی کرتی تھی۔ خصوصاً ۱۸۷۱ء کے دوران غلامی کے انسداد اور عورتوں کی خرید و فروخت جیسے واقعات کے سدباب کے لیے عدالت عالیہ نے جو رولنگ دی وہ آئندہ کے لیے ریاست میں انسانی حقوق کے تحفظ کی ضامن ثابت ہوئی۸۶۔ ریاست بہاول پور کی عدلیہ نے بے شمار ایسے فیصلے کیے جنہیں عدالتی نظائر کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے ایک مثالی فیصلہ احمدیوں کو خارج از اسلام قرار دینے کا ہے۔ کیوں کہ اس مذہب کے پیروکار ختم نبوت کے قائل نہیں، اس لیے اسلام کے اس بنیادی عقیدہ سے انحراف کی بنیاد پر اس متنازعہ مسئلے کو عدالت میں زیر بحث لایا گیا۔ اس موقع پر برصغیر پاک وہند کے تمام نامور مسلم علما کے علاوہ احمدی مذہب کے اہم علما کو بھی اپنے دلائل پیش کرنے کا پورا موقع دیا گیا۔ چھ سال کی طویل سماعت کے بعد بہاول پور کی عدلیہ نے خالصتاً حقائق و شواہد اور فریقین کے دلائل سننے کے بعد احمدیوں کو مذہب اسلام سے خارج قرار دینے کا فیصلہ سنایا۔ واضح ہو کہ اس نوعیت کے مقدمات کے سلسلے میں پنجاب، مدراس اور پٹنہ کی عدالت عالیہ احمدیوں کو مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ قرار دے چکی تھیں، مگر یہ اعزاز صرف ریاست بہاول پور کی عدلیہ کو حاصل ہے کہ اس نے تمام اختلافی مسائل پر مکمل محاکمہ کے بعد برطانوی صوبہ جات کی عدالتوں کی نظائر کے مقابلہ میں ایک آفاقی نظیر پیش کی۸۷۔ اسلام اور مرزائیت کے مابین ایک طویل مناقشہ جو برصغیر پاک وہند میں جڑ پکڑ چکا تھا کی حقیقت سے متعلق فقہی اجتہاد کو بروئے کار لا کر عدالتی فیصلہ سنایا گیا۔ کیوں کہ ریاست بہاول پور کی عدلیہ پاکستان کے علاقے میں شامل تھی اس لیے اگر قیام پاکستان کے فوراً بعد اس مذہبی مناقشے کا مدارک محض اس فیصلے کی بنیاد پر طے شدہ تسلیم کر لیا جاتا اور فرقہ احمدیہ کو خارج از اسلام مذہب قرار دے دیا جاتا تو پاکستان کے مسلمان نہ تو ۱۹۵۲-۵۳ء کے دوران اس کے لیے کوئی تحریک چلاتے اور نہ ہی حکومت

کو اسے دبانے کے لیے پُر تشدد اقدامات کرنے پڑتے۔ بالآخر جب یہ دیرینہ مذہبی مسئلہ ۱۹۷۴ء میں دوبارہ ایک زبردست عوامی تحریک میں تبدیل ہو گیا تو خود پارلیمنٹ نے ختم نبوت کے بنیادی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

امیران بہاول پور نے ذاتی طور پر بھی انصاف کی ترویج کو اپنا فریضہ بنایا۔ وہ عدلیہ کے بالا تر اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے عوام کی دادرسی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دربار عام کے ذریعے رعایا کی شکایات سننے اور ان کے ازالے کا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے عوام کو انصاف ان کی دہلیز تک پہنچانے کے لیے ریاست کے طول و عرض میں دورے کیے اور عوامی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ دارالحکومت میں یا اس سے باہر جب بھی وہ شاہی سواری کی صورت میں باہر نکلتے تو عوام کو اس موقع پر زبانی یا تحریری طور پر درخواستیں پیش کرنے کی اجازت تھی ۸۸۔ اس کے علاوہ دو آخری نوابوں کے دور میں اس مقصد کے لیے شاہی دروازے کے ساتھ ایک صندوق رکھا گیا۔ عوام کو اپنی عرضیاں بذریعہ ڈاک بھیجنے کی سہولت بھی دی گئی۔ عموماً یہ درخواستیں یا شکایات سرکاری عہدہ داران اور عمال ریاست کی بد عنوانی، رشوت ستانی اور ظلم و جور سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ لوگ اپنے علاقے کے جاگیرداروں یا زمینداروں کی زیادتیوں اور بداعمالیوں سے متعلق بھی دادرسی حاصل کرتے تھے۔ مزید برآں ایسے مواقع پر سادہ لوح دیہی آبادی اپنے خاندانی تنازعات اور مناقشات بھی پیش کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتی تھی۔ جب کہ ضرورت مند افراد اسی ذریعے سے اپنی ذاتی اغراض اور معاشی حاجات پیش کرتے تھے۔ امیران بہاول پور عوامی شکایات کا ہر ممکنہ طریقے سے سدباب کرتے اور لوگوں کی حاجت روائی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے۔ نواب صادق محمد خاں رابع نے سرکاری افسران و اہلکاران کی چیرہ دستیوں سے اپنی رعایا کو محفوظ کرنے کے لیے ۱۸۸۱ء میں جو ضابطہ وضع کیا اس کے مطابق انہیں عوام سے زبردستی اشیائے صرف حاصل کرنے یا

بے جا طور پر کسی کے ہاں قیام کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی۔ اس طرح نواب محمد بہاول خاں خامس نے 9 نومبر ۱۹۰۴ء کو اپنے خصوصی فرمان کے ذریعے تمام افسران کو اپنے ماتحتوں اور رعایا سے ہے، تحائف اور ڈالیاں وصول کرنے کی ممانعت کر دی۸۹۔ یہ ضابطہ دفتری نظام میں رشوت ستانی اور بد عنوانی کے خاتمے کی طرف ایک مثبت پیش رفت تھا۔ آخری نواب صادق محمد خاں خامس نے ۱۹۳۰ء میں سرکاری ملازمین اور ان کے اہلِ خانہ کو کسی بھی شخص سے انعام، عطیہ یا معاوضہ وصول کرنے کی ممانعت کر دی ۹۰، غرض کہ ریاست بہاول پور نے اپنے عوام کو انصاف فراہم کرنے کے لیے ایک مربوط عدالتی ڈھانچہ تشکیل دیا اور اپنی آبادی کے تمام طبقات کو معاشی اور معاشرتی انصاف کے مواقع فراہم کرتے ہوئے ایک فلاحی ریاست کا تصور پیش کیا جس کی آج کے دور میں بھی بے حد ضرورت ہے۔

ریاست میں امن و امان کے قیام اور جرائم کے روک تھام کے لیے پولیس کے مؤثر نظام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جنوری ۱۸۶۷ء سے سابقہ دور کے کوتوالوں کی نگرانی میں فوج کے خود اسپ "سپاہیوں پر مشتمل پولیس فورس کا قیام عمل میں آیا۔ ریاست میں پولیس نظام کے عمیق جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۹ء تک کوئی پولیس کوڈ رائج نہ تھا، تاہم اسی سال پنجاب پولیس کوڈ کو متعارف کرایا گیا۔ البتہ اسے یہاں کے مخصوص حالات سے مربوط کرنے کے لیے اس میں کچھ ترمیمات کی گئیں اور بعض نئے ضوابط شامل کیے گئے ۹۲ ۔ اس سے نہ صرف قابل اندازی پولیس اور ناقابل دست اندازی پولیس معاملات میں تخصیص پیدا ہوئی بلکہ پولیس کو اپنی حدود و! دو قیود کا علم ہوا۔ ۱۹۰۵ء کی پولیس اصلاحات کے نفاذ سے ریاستی پولیس کو برطانوی ہند کی پولیس کی طرز پر منظم کیا گیا۔ کیوں کہ تمام پولیس کو ایک مرکز سے نگرانی کرنے کی ضرورت تھی، چنانچہ اس مقصد کے لیے دارالحکومت میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کا دفتر قائم کیا گیا ۹۳۔ علاوہ ازیں پولیس لائن کے قیام سے پولیس کی پیشہ

ورانہ ترب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ تاہم شرح خواندگی میں کمی کی وجہ سے خاطر خواہ طور پر تربیت کے مقاصد پورے نہ ہوسکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس اہم محکمے کو عوام دوست ادارے میں تبدیل کرنے کے لیے اس کی اخلاقی تربیت کے تقاضے بھی پورے نہ کیے گئے۔ کم از کم ایک اسلامی ریاست کی پولیس کو اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کے ذریعے، رشوت، بدعنوانی، بدکلامی، درشتگی اور اپنے اختیارات سے متجاوز ہونے سے روکا جاسکتا تھا۔ تربیت کا یہی فقدان برطانوی ہند کی پولیس کا خاصا تھا، مگر موجودہ دور میں ان ناپسندیدہ روایات واثرات چھٹکارا حاصل کرنا ہمارے قومی مقاصد میں شامل ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں ریاست میں جرائم کی بیخ کنی کے لیے جرائم پیشہ اقوام کے ایکٹ کے نام سے جو قانون نافذ کیا گیا۹۴، اس کا بڑا مقصد نہ صرف ایسے جرائم پیشہ گروہوں پر نظر رکھنا تھا جو کسی ایک خاندان یا قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے بلکہ انہیں مستقل طور پر جرائم کی دنیا سے نکال کر کسی صحت مند فن یا پیشہ سے منسلک کرنا، ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اور ایسے افراد کی بہبود و بحالی کے لیے حکومتی سطح پر اہتمام کرنا جیسے مقاصد شامل تھے۔ یہ وہ اقدامات تھے جنہیں بروئے کار لا کر جرائم سے وابستہ افراد اور خاندانوں کو مستقل طور پر ایک با مقصد زندگی کی طرف لانے کی کوشش کی گئی۔
موجودہ دور میں بے شمار افراد بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر جرائم کو بطور پیشہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت ہے۔ موجودہ دور میں سرکاری سطح پر یا این۔ جی۔ اوز (غیر سرکاری ادارے) کی طرف سے جرائم پیشہ افراد سے متعلق ایسی منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے، جس کی سے انہیں باعزت روزگار کے مواقع فراہم کرنے کی ضمانت پر اپنی مجرمانہ سرگرمیوں سے کنارہ کش ہونے کے مواقع میسر آسکیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جو کسی پولیس کی مدد کے بغیر جرائم میں ملوث افراد کو راہ راست پر لانے اور معاشرے سے جرائم کے بڑھتے ہوئے رُجحانات کے استیصال میں معاون ثابت ہوسکتا۔ ہے۔

ریاست میں جیلوں کے نظام کار اور قیدیوں کی حالت زار کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اصلاحی اقدامات کیے گئے۔ اسی نقطہ نظر سے ۱۸۶۶ء میں اس محکمے کا چارج کسی درشت جیلر کے ہاتھ میں دینے کی بجائے ریاست کے چیف میڈیکل آفیسر کے سپرد کیا گیا۹۵۔ اسی طرح ۱۸۷۰ء میں دیگر مقامات کی جیلوں کی بندش اور وہاں پر مقید قیدیوں کی سنٹرل جیل بہاول پور منتقلی کا مقصد بھی یہی تھا کہ مزایابی کے عمل کو انسانی اور اخلاقی نقطہ نظر سے منضبط بنانے میں معاونت مل سکے۔ اس کے علاوہ قیدیوں سے لی جانے والی مشقت کو منفعت بخش بنانے کے لیے جیل کو ایک صنعتی یونٹ میں تبدیل کیا گیا۔ بہاول پور سینٹرل جیل اس لحاظ سے ایک مثالی ادارہ تھا کہ یہاں مقامی فنون اور گھریلو صنعت کو فروغ ملا۔ یہاں پر تیار کی جانے والی اشیائے صرف کی مقامی منڈی میں کھپت تھی جب کہ فرنیچر اور کاغذ وغیرہ دفاتر میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے حاصل شدہ آمدنی جیل کے نصف سے لے کر دو تہائی اخراجات تک کی کفالت کرتی تھی۔ اس کا دوسرا تابناک پہلو یہ تھا کہ اس طریقے سے ہر قیدی اس قدر ہنر مند بنا دیا جاتا تھا کہ وہ رہا ہونے کے بعد کسی بھی صنعتی پیشہ کے ذریعے روزگار حاصل کر سکتا تھا۔

شہری علاقوں کے انتظام و انصرام میں بلدیاتی اداروں کی اہمیت کے پیش نظر ریاست بہاول پور نے ۱۸۶۷ء میں ان کی تشکیل کی ضرورت محسوس کی ۹۷۔ یقیناً یہ ایک ایسا مثبت قدم تھا جس کی طرف اس وقت تک حیدرآباد دکن جیسی اہم ریاست کے علاوہ بیشتر ہندوستانی ریاستوں نے کوئی پیش رفت نہیں کی تھی۔ ۱۸۷۴ء کے بہاول پور میونسپل لاز" کی رُو سے شہروں میں ٹریفک کے قوانین پر عمل درآمد، وبائی امراض کی روک تھام، منافع خوری کے تدراک اور ملاوٹ شدہ کھانے پینے کی اشیا کی فروخت کی روک تھام، گداگری کی ممانعت اور خطرناک جانوروں کے رکھنے پر پابندی جیسے امور کی خلاف ورزی پر جرمانہ اور قید کی سزا دینے کا اختیار بھی اراکین کمیٹی کو تفویض کیا گیا۹۸۔ یہی وہ۔

سلگتے ہوئے مسائل ہیں جو آج بھی شہری علاقوں اور ان کے عوام کو درپیش ہیں، جنہیں حل کرنے کا زیادہ سے زیادہ اختیار حکومت خود اختیاری کے ارکان کو حاصل ہونا چاہیے۔ ریاست کے بلدیاتی نظام کو اس اعتبار سے بھی ترقی یافتہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ بتدریج بڑھتی ہوئی آبادی کے تقاضوں اور مستقبل کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے شہروں کی توسیع اور ان میں تعمیراتی منصوبوں کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ اس کی پیش رفت کے طور پر ۱۸۷۴ء میں بہاول پور کے قدیم شہر کی تعمیر نو کا آغاز با قاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ عمل میں آیا۹۹۔ چنانچہ آمد و رفت کی سہولت کے لیے شہر کو سرکلر روڈ سے محیط کیا گیا۔ اندرون شہر گلیوں اور راستوں کے پیچ و خم درست کیے گئے۔ کاروباری مقاصد کے لیے آٹھ بازار قائم ہوئے۔ ان میں بیشتر دوکانیں با قاعدہ نقشہ کے مطابق میونسپلٹی کی طرف سے تیار کر کے فروخت کی گئیں۔ حفاظتی نقطہ نظر سے شہر کے داخلی راستوں پر ستات دروازے تعمیر کیے گئے، مسافروں کے قیام کے لیے سراؤں کی سہولت مہیا کی گئی۔ پانی کی فراہمی کے لیے پختہ کنویں اور تالاب بنائے گئے۔ شہر کے چاروں طرف ایک نہر رواں دواں تھی جو اسے سیر اب کرتی تھی، جب کہ اس کے کناروں پر مہیا کردہ گھاٹ عوامی غسل خانوں کی ضروریات پورا کرتے تھے۔ اگرچہ اس دور کے شہریوں کو فضائی آلودگی کا سامنا نہیں تھا، تاہم انہیں تروتازہ ہوا کی فراہمی کے لیے شہر کے اطراف میں بائیس کے لگ بھگ باغات لگوائے گئے، اس کے دروازوں کو اضافی طور پر باغیچوں سے مزین کیا گیا اور سڑکوں کو شجر کاری کے ذریعے سایہ دار بنایا گیا۔ علاوہ ازیں سٹریٹ لائٹ تک کا انتظام کیا گیا۔ غرض کہ ٹاؤن پلاننگ کے انہی مسلمہ اصولوں کو ریاست کے دیگر شہروں کی توسیع و تعمیر کے دوران بھی اختیار کیا گیا۔ ۱۹۰۳ء میں جدید واٹر سپلائی سکیم کا اجرا اور ۱۹۱۰ء سے سیوریج کے قابل عمل منصوبے کا آغاز اس دور کے بلدیاتی نظام کی بہتر کارکردگی کی دلیل ہیں ۱۰۰۔ اس طرح ۱۹۴۲-۴۳ء کے دوران ریاست کے اہم شہروں کی توسیع کے لیے جو ٹاؤن پلانگ سکیم تیار کی گئی

تھی۔ اس میں اس دور کے مروجہ بین الاقوامی اصول وضوابط کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ واضح ہو کہ شہروں کی توسیع کے اس منصوبے کو آئندہ صدی تک کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مربوط کیا گیا، جسے اس دور کے شہری منصوبہ بندی کے ماہرین اور پبلک ورکس کے انجینئروں نے باہمی شراکت .سے تیار کیا تھا۔ اس ٹاؤن پلاننگ سکیم کی خاص خوبی یہ تھی کہ اس میں خصوصیت سے ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے جدید رہائشی سکیمیں تیار کی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں تعلیمی، صنعتی، دفتری، کاروباری اور رہائشی زون علیحدہ علیحدہ مختص کیے گئے تھے۔ ابھی ریاست میں اس جدید ٹاؤن پلاننگ سکیم کے معدودے چند حصوں پر عمل درآمد ہی ہوا تھا کہ وحدت مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے نتیجے میں بہاول پور کی جداگانہ حیثیت ختم ہوئی۔ چنانچہ ارتکاز اختیار کے نتیجے میں بلدیاتی تعمیر وترقی کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وسائل کا منبع بدل جانے سے شاہراہ ترقی کا رُخ بھی تبدیل ہو گیا۔

ایک اور اہم شعبہ جس نے خصوصیت سے عوام میں شعور و آگہی کے نفوذ میں بھرپور کردار ادا کیا، وہ سرکاری چھاپہ خانہ تھا۔ واقعتاً اس کے قیام ۱۸٦۷ء سے ریاست بہاول پور نے ذرائع ابلاغ کے ایک ایسے دور میں قدم رکھا جس سے اس وقت تک مقامی ریاستیں اور برطانوی ہند کے متعدد صوبے تہی دست تھے ۱۰۲۔ واضح ہو کہ اردو زبان جسے باقاعدہ طور پر ۱۸٦٦ء سے ، ریاست کی واحد سرکاری زبان ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، کی ترویج واشاعت میں اس پریس کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس مطبع کی بدولت ریاستی قوانین وضوابط اور سرکاری احکامات کو اردو زبان میں منضبط کرنے کا آغاز ہوا، جنہیں صادق الاخبار گزٹ " میں باقاعدگی سے مشتہر کیا جاتا تھا۔ یہی وہ ذرائع تھے، جن کی بدولت اردو نے ریاست میں مسلسل اٹھاسی برسوں (۱۸٦٦ء تا ۱۹۵۴ء) تک اپنا سکہ بٹھائے رکھا۔ اس طویل عرصے کے دوران سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو نے تمام ارتقائی منازل طے کیں۔

علاوہ ازیں دفتری، مالیاتی اور عدالتی اصطلاحات کی بھرپور شمولیت سے خود کو بارآور بنایا اور اس کے نتیجے میں ایک کاملاً قابل نفاذ زبان کا درجہ حاصل کیا۔

جہاں تک امیران بہاول پور کے دفاعی نظام کا تعلق ہے تو انھوں نے ابتدائی ایک سو گیارہ سالوں کے دوران اپنی مرکزی اور باقاعدہ فوج کی مدد سے اندرونی اور بیرونی محاذوں پر کئی شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۸۳۸ء کے اینگلو بہاول پور معاہدہ کی رُو سے ریاست کے دفاع کی تمام تر ذمہ داری برطانوی حکومت کے سپرد تھی۱۰۳۔ اس کے بعد سے ریاستی فوج صرف اندرونی نظم و نسق کے قیام اور امیران بہاول پور کی حفاظت کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اگرچہ کسی بھی معاہدہ کی رُو سے ریاست کو امدادی فوج رکھنے کا پابند نہیں کیا گیا تھا، مگر طلب کرنے پر اسے ہر صورت میں انگریزی حکومت کو عسکری معاونت فراہم کرنا ہوتی تھی۔ چنانچہ انگریزی مفادات کے تحفظ کے لیے نگران حکومت نے دوسرا بڑا مقصد ۱۸۶۹ء میں رسالہ نظام کے نام سے امدادی فوج تشکیل دی۱۰۴۔ جو آئندہ اٹھہتر برسوں تک برطانوی استعمار کے آلہ کار کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ ایک ایسی فوج جس کا ریاست کے دفاع سے تو کوئی تعلق نہ تھا البتہ اس پر اٹھنے والے اخراجات ریاستی معیشت کے لیے گراں بوجھ کا درجہ رکھتے تھے۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۹۰۰ء کے دوران دربار بہاول پور کو امپیریل سروس ٹروپس کے قیام پر سالانہ لاکھوں روپے خرچ کرنے پڑے۔ اس فوج نے دوسری جنگ عظیم کے دوران مشرقی محاذ پر نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ تاہم سقوط سنگاپور کے نتیجے میں دی بہاول پور فرسٹ انفنٹری کو شدید نقصان پہنچا۔ مگر نواب صادق محمد خاں خامس، جو خود برطانوی فوج کے تربیت یافتہ افسر تھے، نے اس فوج کی تشکیل نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر اس کے نتیجے میں ریاست کا دفاعی بجٹ ۱۹۴۶ء میں چوبیس لاکھ چونسٹھ ہزار بیانوے روپے تک جا پہنچا۱۰۵۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد ۱۹۵۲ء کے ضمنی معاہدہ الحاق کے مطابق ریاست بہاول پور کی جدید انداز میں تربیت یافتہ

ایک ڈویژن کے قریب فوج رکی پاکستانی فوج میں ضم ہونے کے بعد بلوچ رجمنٹ قرار پائی اور دفاع پاکستان میں معاون ثابت ہوئی۱۰۶۔ جس کا نشان حسب سابق حواصل (Pelican) برقرار رکھا گیا۔ یہی فوج اب ایک کور (Corp) کا درجہ رکھتی ہے۔

جہاں تک ریاست بہاول پور کے خارجہ امور کا تعلق ہے تو۱۸۳۸ءکے اینگلو بہاول پور معاہدہ کی رو سے اس کی بین الاقوامی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ اس معاہدہ کے تحت ایک طرف تو بالا دست انگریزی حکومت نے اپنی ماتحت علیحدگی کی پالیسی "The Policy of Subordinate Isolation" کے اطلاق سے ریاست کو خارجہ تعلقات کے سلسلے میں دیگر ریاستوں سے الگ تھلگ کر کے اسے محض اپنا زیر نگیں بنالیا، جب کہ دوسری جانب دربار بہاول پور کو اپنی ماتحت اتحاد کی پالیسی (The Policy of Subordinate Union) کے ذریعے پابند کیا گیا کہ وہ اس اتحاد کی قیمت پکانے کے لیے انگریزی استعمار کو ہر ممکنہ امداد و تعاون فراہم کرے۱۰۷۔ اگرچہ اس کے بعد سے ریاست کے خارجہ تعلقات کا محور و مرکز ہندوستان کی برطانوی حکومت تھی۔ تاہم امیران بہاولپور کو دیگر مقامی ریاستوں کے حکمرانوں سے صرف نجی اور دوستانہ مراسم کی حد تک تعلقات استوار کرنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ ان دونوں مقاصد کے لیے خارجہ امور کا شعبہ تو قائم رہا مگر اس کے لیے کسی قسم کی خارجہ پالیسی کی ضرورت نہ تھی۔

غرض کہ اپنی تمام ترخوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ریاست بہاول پور کا انتظامی ڈھانچہ اپنے عہد کی بیشتر ہندوستانی ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے حکومتی نظام کو بہتر بنانے کے لیے نہ صرف برطانوی ہند کے انتظامی اداروں کی ساخت سے بھرپور استفادہ کیا گیا تھا بلکہ اس کے عملی نفاذ میں انگریزوں نے معاونت فراہم کی تھی۔ البتہ نظم ونسق مملکت کو مقامی روایات سے ہم آہنگ کرنے میں خود امیرانِ بہاولپور نے بھرپور کردار ادا کیا۔ اگرچہ ریاستی عوام

جمہوری آزادیوں سے یکسر محروم تھے، تاہم انہیں ہر قسم کے معاشی، معاشرتی اور شہری حقوق حاصل تھے۔ یہی وہ دور تھا جب کہ ریاستی وسائل کو ممکنہ حد تک شہریوں کی فلاح و بہبود پر صرف کرنے کا آغاز ہوا۔ لو ہوا۔ تعلیم اور اور صحت جیسی بنیادی سہولیات کی بلا تخصیص و بلامعاوضہ فراہمی ممکن ہوئی۔

امن عامہ کے قیام سے عوام کے جان و مال کو تحفظ حاصل ہوا اور انصاف کی ترویج کو ریاست کا بنیادی فریضہ قرار دیا گیا۔ بادی النظر میں یہی وہ عوامل ہیں جو کسی ریاست کو فلاحی مملکت کے تصور سے قریب تر کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ریاست بہاول پور نے اپنے عوام کو ان مقاصد سے ہمکنار کرنے کے لیے ہر ممکنہ تھی کی۔ موجودہ دور میں اسلامی جمہوری مملکت پاکستان کے انتظامی اداروں کو زیادہ سے زیادہ عوامی خواہشات سے ہم آہنگ کرنے کی جو ضرورت محسوس کی جارہی ہے، تو اس سلسلے میں سابق ریاست بہاول پور کے گراں قدر انتظامی تجربات سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جب کبھی پاکستان کو مزید انتظامی اکائیوں میں منقسم کیا جائے، جس کی ضرورت کا احساس موجودہ دور میں بڑی شدت سے ہو رہا ہے، تو ایسی صورت میں سابق ریاست بہاول پور کے علیحدہ انتظامی یونٹ کو اپنی سابقہ جغرافیائی حدود میں بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ وحدت مغربی پاکستان سے قبل ایک جداگانہ صوبے کے طور پر اس کی حیثیت متعین تھی۔ کیوں کہ یہی وہ حکمت عملی ہے جس کے ذریعے پاکستان کے اس پس ماندہ خطے کے عوام زیادہ سے زیادہ معاشی و اقتصادی خوش حالی سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست بہاولپور کے باہمی تعلقات کا جائزہ

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً چھ سو ریاستیں قائم ہوئیں۔ یہ ریاستیں براہ راست ان کے حقوق کا باقاعدہ طور پر معاہدوں کی کمی کیجاتی تھی۔ جس کی توثیق تاج برطانیہ سے ہوتی تھی۔ برصغیر میں برطانوی برتری کا آغاز ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں لارڈ وزلے (۱۷۹۸ء، ۱۸۰۵ء) نے ۱۷۹۹ء میں اپنے امدادی نظام (Subsidiary System) سے کیا۔ جس کے مطابق کمپنی کی امدادی فوج کے اخراجات کی عدم ادائیگی پر ریاست کا کچھ علاقہ ہتھیا لیا جاتا۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا شکار حیدرآباد کی ریاست ہوئی۔ اسی طرح ۱۸۰۱ء میں ریاست اودھ سے امدادی رقوم کے بقایاجات کی عدم ادائیگی کی بناء پر اس کے تقریباً نصف مقبوضات پر قبضہ کر لیا گیا تاہم بہت سی ریاستوں نے جن میں راجپوت ریاستیں بھی شامل ہیں، اس نظام کو قبول کیا۔ یہاں تک کہ مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی (۱۸۰۲ء-۱۸۵۹ء) نے بھی اس نظام کو قبول کرنے میں بہتری سمجھی اور اس طرح انگریز رفتہ رفتہ برصغیر کی سب سے بڑی قوت بن گئے۔ پھر ریاستوں اور انگریز حکومت کے تعلقات میں اضافہ ہوا۔ میر ریاستیں امور خارجہ میں بالادست حکومت کے تابع تھیں لیکن اندرونی معاملات نظم ونسق میں ان کی خودمختاری کو تسلیم کیا گیا بلکہ ممکنہ حد تک کم سے کم مداخلت کی جاتی رہی۔ اسی طرح لارڈ ولیم بینٹک (Bentinck) (۱۸۲۸ء-۱۸۳۵ء) کے دور میں بھی ریاست کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی کو جاری رکھا گیا لیکن بہت جلد ریاستوں اور انگریز حکومت کے خوشگوار تعلقات ختم ہوگئے۔ اس کی بڑی وجہ یہی کہ لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸ء-۱۸۵۲ء) نے ریاستوں پر قبضہ کرنے کے لیے الحاق کی پالیسی اختیار کی جس کے تحت ریاستوں میں انتظامی ابتری پیدا ہونے اور حکمرانوں میں نرینہ وارث نہ ہونے کی صورت میں بنی بنانے کا حق چھین لیا گیا۔ ای پالیسی کے تحت ۱۸۵۴ء تک ستارا، جیت پور مبل پور، ادھے پور، جھانی اور ناگپور اور ۱۸۵۲ء میں اورج کی

ریاستوں کا الحاق عمل میں آیا۔ جس کے نتیجے میں ہندوستان میں افراتفری اور بغاوتوں کا ایک سلسلہ چل کا جو ہائی خبر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک سبب بنا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ریاستوں پر جبری قبضہ کرنے کی یا الحاق کی پالیسی کی نفی کی گئی اور اسی دوران کمپنی کی حکومت کے خاتمے کے بعد برصغیر براہ راست تاج برطانیہ کے تحت ہو گیا۔ اس نئی حکومت نے ریاستوں سے متعلق بھی سابقہ پالیسی ماتحتانہ علیحدگی والحاق کی بجائے فاتحانہ اتحاد کی حکمت عملی کو اپنایا جس کے نتیجے میں حکومت اور ریاستوں کے درمیان براہ راست رابطہ قائم کیا گیا۔ ۲

جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ بہتر تعلقات کا آغاز ہوا جو وقت گزرنے کے ساتھ اور مستحکم ہوئے۔ اسی لیے انگریزوں نے ریاستی حکمرانوں سے مغل شہنشاہوں جیسا سلوک اختیار کیا۔ ان کی وفاداری اور خدمات کی بدولت ان نوابوں اور راجاؤں کو خطابوں سے نوازا جاتا۔ جاگیر میں عطا کی جاتیں۔ میسور کی ریاست ۵۰ سال بعد ان کے راجاؤں کو واپس کر دی گئی۔ بنارس کو ۱۹۱۲ء میں ریاست کا درجہ دے دیا گیا۔ ریاستوں میں بدنظمی اور کم سن حکمرانوں کے معاملات چلانے کے لیے ایجنسی کے تحت ریاستی نظم ونسق چلانے کا بندوبست کیا گیا۔ حیدرآباد جیسی بڑی ریاست کو سکہ سازی، ریلوے اور ڈاک تک کے اختیارات حاصل تھے۔ جب کہ بیرونی جارحیت اور خطرات کی صورت میں ان ریاستوں کو برطانوی ہند کی جانب سے مکمل تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے خارجہ امور کے سلسلے میں کسی ریاست کے حکمران کو کسی بیرونی ملک یا ریاست سے برطانوی ہند کی اجازت کے بغیر تعلقات استوار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح علاقائی ریاستوں کے آپس کے باہمی تنازعات میں بھی مرکزی حکومت کو سپریم حیثیت حاصل تھی ۔ اس کا فیصلہ حتمی تصور ہوتا تھا۔ ۳ ریذیڈنٹ اور پولیٹیکل ایسٹ ریاستوں اور حکومت ہند کے درمیان رابطے کا ذرایہ تھے۔ حکومت ہند کا ایک علیحہ و محکمہ امور خارجہ اور سیاسی امور کے نام سے

ہندوستانی ریاستوں کے معاملات سے متعلق تھا۔ محکمہ براہ راست وائسرائے کے پاس تھا جس کی معاونت کے لیے سیکرٹری امور خارجہ اور پولٹیکل سیکرٹری ہوتے تھے۔ جب کہ ریڈیڈنٹ اور پیٹیکل ایکٹ ان کے زیر نگرانی تھے۔۴ ریاست میں افراتفری اور غیر یقینی صورتحال میں برطانوی حکومت کو مداخلت کرنے اور نظم و نسق کو عارضی طور پر اپنے کنٹرول میں لے لینے کا اختیار حاصل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ریاستوں کے متعلق معاملات میں حکومت برطانیہ اپنی برتر حیثیت کا ہمیشہ احساس دلاتی رہتی تھی۔

برصغیر میں ایک مسلم ریاست بہاول پورا ایک اہم ترین ریاست تھی۔ ریاست بہاول پور کا آغاز ۱۷۲۷ء میں عمل میں آیا اور امیر صادق محمد خاں اس کے پہلے حکمران قرار پائے۔ جن کا تعلق بغداد کے خلفائے عباسیہ سے تھا اور جن کی بعد تو کافی عرصہ سے سندھ میں حکمران رہی تھی۔ سندھ میں عباسیوں کا عروج کچھ اس طرح سے شروع ہوا کہ پہلے پہل انہوں نے مذہبی قیادت سنبھالی بعد میں ان کی اولاد زمیندار جاگیردار بن گئی اور آخر میں زیرہ میں اور بالائی سندھ میں سیاست کا افراتفری کا فائدہ اٹھا کر یہ وہاں کے حکمران بن گئے۔ شہنشاہ اکبر کا شہزادہ مراد ملتان آیا اور تمام سندھ کے امراء نے اس کے دربار میں حاضری دی تو ان میں عباسی امیر چنی خاں بھی شامل تھا۔ جب شہزادہ مراد کو اس کے خاندان کے پس منظر کا پتہ چلا تو اس نے اوباڑو سے لے کر لاہوری بندر تک امیر چینی خان کی سپردگی میں دے کر اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ امیر چینی خاں کو پنج ہزاری کا منصب بھی عطا کیا۔ امیر چتی خاں کے دو فرزند تھے ایک امیر مہدی خاں اور دوسرے امیر داؤد خاں۔ ان کی وفات کے بعد امیر مہدی خاں اپنے والد کے جانشین ہے۔ امیر مہدی خاں کا تھوڑے عرصہ بعد انتقال ہو گیا اور ان کا لڑکا امیر ابراہیم خان المعروف کلہوڑا تخت نشین ہوئے۔ جس کے بعد ان کے چا میر داؤد خاں سے ان کی کشمکش کا آغاز ہوا اور عباسی دو گروہوں میں بٹ گئے اور نتیجتاً میر کلہوڑو کی

اولاد علاقہ سندھ پر قابض ہو گئی اور امیر داؤد خاں کی اولاد سندھ سے نقل مکانی کر کے موجودہ بہاول پور کی حدود میں آ گئی۔ عباسیوں کی اس شاخ کے سربراہ امیر صادق محمد خاں تھے جو مخادیم گیلانی و بخاری کی دعوت پر پہلے پہل اوچ میں قیام پذیر ہوئے پھر انہوں نے گورنر ملتان سے رابطہ کر کے چوہدری اور شکار پور کا علاقہ بطور جاگیر حاصل کیا اور اللہ آباد شہر کی بنیاد رکھی۔ جس کے حکمرانوں میں امیر بہاول خاں ثانی (۱۷۷۲ء۔۱۸۰۹ء) کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ان کا یہ دور بہاول پور کی ایک آزاد ریاست کی تشکیل و تعمیر کا دور تھا۔ جس میں انہوں نے نہ صرف اس وقت کی ہمسایہ ریاستوں، پنجاب میں سکھوں سے اور ملتان، سندھ، بیکانیر اور جیسلمیر کے ہندو حکمرانوں سے اپنے آپ کو منوایا بلکہ مغل فرمانروا اور کابل کے حکمران سے خطابات حاصل کیے۔ اپنی خود مختاری اور آزاد حیثیت کو تسلیم کروانے کے لیے ٹکسال قائم کر کے اپنے سونے، چاندی اور تانبے کے سکے جاری کیے۔ بہاول خاں ثانی کی برصغیر کے حالات پر بھی گہری نظر تھی۔ وہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس دور میں انگریز ہندوستان پر روسی اور یورپی حملے کے خطرات محسوس کر رہے تھے جس کے لیے انہیں افغانستان اور خراسان کے معاملات پر نظر رکھنے کے لیے ایک وفد بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس سلسلے میں برطانیہ سے یہ ہدایت نامہ دہلی کی انگلش حکومت کو موصول ہوا کہ براستہ بیکانیر اور بہاول پور ایک وفد کی روانگی کا بندوبست کیا جائے۔ اس وفد کو صحرائے چولستان سے گزرنا تھا جس کو عبور کرنے کے لیے انہیں ریاست بہاول پور کے امیر کی اجازت و حمایت کی ضرورت تھی۔ اس ضمن میں مسٹر سیٹن (Seton) نے دہلی سے میر عزت اللہ خاں کو ایک خط کے ہمراہ دربار بہاول پور سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کے لیے سفیر کی حیثیت سے روانہ کیا۔ ۵ پھر میر عزت اللہ انگریز حکومت کے پہلے باقاعدہ نمائندہ کی حیثیت سے قلعہ دراوڑ میں امیر آف بہاول پور سے ملے، جس میں انہوں نے بہاول پور کے راستے انگریز وفد کے گزرنے کی

اجازت طلب کی۔ اس ضمن میں نواب موصوف نے اپنے درباری امراءسے مشورکیا۔ اگرچہ کچھ امراءنے برطانوی وفد کے بہاول پور کی سرزمین سے گزرنے کی مخالفت کی لیکن بالآخر امیر نے اپنے دوستانہ رویے کی وجہ سے ان کو علاقے سے گزرنے کی اجازت دے دی۔ اس سفارتی کامیابی کے نتیجے کے طور پر ۱۸۰۸ء میں ایک چودہ رکنی سفارتی وفد جس کی قیادت ایسٹورٹ الفنسٹن (۱۷۷۹ء۔ ۱۸۵۹ء) کررہا تھا ریاست بیکانیر کے راستے بہاول پور میں داخل ہوا۔ امیر آف بہاول پور نے اسے بھی خوش آمدید کہا۔

اس طرح اس ملاقات و مذاکرات سے ریاست کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات کی ابتداءہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت کو مزید وسعت دینے کے لیے مشرقی پنجاب میں دریائے ستلج کے شمالی کنارے پر واقع چھوٹی ریاستوں کی طرف اپنا رخ کیا لیکن اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اس علاقے تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ان دو بڑی قوتوں نے براہ راست ایک دوسرے کے سامنے آنے کی بجائے ان چھوٹی ریاستوں کو ۱۸۰۹ء میں ہونے والے ایک معاہدے کے تحت اپنے درمیان حد فاصل قرار دے دیا۔ ۲

اسی دوران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ریاست بہاول پور کے اس علاقے پہ جو دریائے ستلج کے شمال مشرقی کنارے پر واقع تھا، قبضہ کرلیا اور ریاست پہ باقاعدہ خراج کا اطلاق بھی کردیا۔ ۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ کی فوج نے ملتان پر ایک بڑا حملہ کیا۔ اس مرتبہ نواب مظفر خاں نے جنگ کرنے کی کوشش کی جس میں وہ اپنے بیٹوں سمیت مارا گیا اور ملتان پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہوگیا۔ 7

رنجیت سنگھ کی فتح ملتان نے ریاست بہاول پور کو اب حقیقی معنوں میں اپنی سلامتی کی فکرلاحق کردی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جس تیزی سے اپنے مقبوضات میں اضافہ کررہا تھا اسے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ پورے پنجاب کو فتح کرنے کے بعد اس کا اگلا ہدف ریاست بہاول پور اور صوبہ سندھ

تھے چنانچہ مہاراجہ نے اس طرف پیش قدمی کرتے ہوئے 1819ء میں ریاست بہاول پور کے علاقے ڈیرہ غازی خاں پر بھی قبضہ کر لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شدید خواہش تھی کہ وہ امیران سندھ سے خراج وصول کرے اور اس کے لیے وہ سوبہ سندھ کے کچھ علاقوں خاص طور پر شکارپور پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اس منصوبے کو ملی جامہ پہنانے کے لیے۱۸۴۹ء میں رنجیت سنگھ نے سندھ کے علاقے کوٹ سبرل پر حملہ کرنے کے لیے ریاست بہاول پور کے پڑھ علاقوں اور بلوچستان کے علاقوں داجل اور راجن پور کو اپنے قبضے میں کر لیا۔

رنجیت سنگھ کی دریائے سندھ کے ساتھ ریاست بہاول پور کی سرحد پہ کاروائیاں اس بات کا واضح اشارہ تھیں کہ ریاست بہاول پور اب رنجیت سنگھ کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہی۔ ان حالات میں ریاست بہاول پور کے نواب تھے بہاول خاں ثالث (۱۸۲۵ء۔ ۱۸۵۲ء) ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف دیکھ رہے تھے جو اس علاقے میں بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھر رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل بنیادی طور پر تجارت کی غرض سے ہوئی تھی لیکن جب ہندوستان سیاسی طور پر انتشار کا شکار ہوا تو کمپنی نے اپنے تجارتی مقاصد کو تقویت دینے کے لیے سرگرمیاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے کمپنی نے اپنی عسکری حیثیت کو مضبوط بنانے کے لیے بحر ہند کے ساتھ ساتھ جنوب مشرقی ہندوستان میں قلعہ بندیوں کا عمل شروع کیا۔ پھر نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے لائے ہوئے سیسی انتشار کا فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے مقبوضات کو وسعت دینا شروع کر دی۔ اس طرح انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی تمام جنوب مشرقی اور وسطی ہندوستان کو اپنے زیر نگیں لاتے ہوئے شمال مغربی ہندستان تک پہنچ گئی۔ ہندوستان کے اس محلے میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ساتھ ساتھ دو بڑی حکومتیں تھیں ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت پنجاب اور امیران تالپور کی حکومت سندھ ۔ یہ علاقے اپنی زرخیزی اور دریائی گزر گاہوں کے باعث بہت اہمیت کے حال تھے۔ ان صوبوں کی شمال

مغربی سرحد میں افغانستان اور ممالک فارس سے متصل تھیں۔ جو نہ صرف خشکی کے اہم تجارتی راستے تھے بلکہ عسکری لحاظ سے بھی ان کی یت بہت باری یاان کی تجارتی سرگرمی اور برطانیہ کے بین اویسی اثر ورسوخ کی کش میں اہم کردار ادا کرسکتے توں میں فرانس، برطانیہ اور روس ایک دوسرے کے مد مقابل تھے۔ انہ ویں صدی عیسوی کے شروع تک فرانسیسی جرنیل نپولین اس سیاسی کشمکش میں سب سے نمایاں تھا۔ برطانی کو یہ خطرہ تھا کہ میں نپولین تری کی سلطنت عثمانیہ اور ممالک فارس۔ مل کر افغانستان کے راستے ہندوستان پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ 9

اس وقت کمپنی کا نقطہ نظر یہ معلوم ہوتا تھا کہ دہ رنجیت سنگھ کے علاقہ حکومت کو اپنے اور افغان علاقے درمیان بفر اسٹیٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے چنانچہ اس مقصد کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے رنجیت سنگھ کی علاقائی توسیع پسندانہ پالیسی سے مصلح احتراز برتا لیکن ۱۸۰۶ء میں نپولین کی وفات کے بعد اورپی سیاست کے معاملات بدل گئے۔ فرانسیسی حملے کا خطرہ ختم ہوتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نقطہ نظر میں بھی واضح تبدیلی آئی جس کے مطابق ۱۸۰۹ء میں کمپنی نے رنجیت سنگھ کے ساتھ معاہدے میں اس کی توسیع پسندانہ پالیسی پر پہلی مرتبہ اس شرط کے ساتھ پابندی لگائی کہ وہ دریائے ستلج کے شمالی کنارے پر واقع چھوٹی آزاد ریاستوں پر حملہ آور ندہ ہو گا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے اگرچہ فرانسیسی حملے کا خطرہ ختم ہو چکا تھا لیکن روی جارحیت کی تلوار بدستور اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ اس لیے کمپنی کا ارادہ یہ تھا کہ روس کے وسط ایشیا اور ایران میں بڑھتے ہوئے اثرات کے پیش نظر اس علاقے میں اپنے قدموں کو مستحکم کرے تاکہ وہ افغانستان اور ایران میں رونما ہونے والے واقعات کا جائزہ لے سکے اور وسط ایشیا میں روی تجارتی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھ سکے۔ اس لیے کمپنی نے سندھ کے معاملات میں زیادہ پیچپی لینے کا فیصلہ کیا تاکہ سندھ اور بلوچستان کی طرف رنجیت سنگھ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا جاسکے اور اس کے ساتھ افغانستان تک اس کی رسائی بھی

آسان ہو جائے۔ اس کے لیے کمپنی نے اپنے نمائندہ الیگزینڈر برنس (Alexander Burmes) کو سندھ کے جائزے کے لیے بھیجا۔ الیگزینڈر برنس ریاست بہاول پور سے ہوتا ہوا وادی سندھ میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے سروے کے دوران وادی سندھ کی جغرافیائی حیثیت سے متعلق تفصیلی نقشہ جات تیار کیے اور ان راستوں کا تعین کیا جو عسکری و تجارتی لحاظ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی افغان اور وسط ایشیائی پالیسی کے لیے انتہائی اہم تھے۔10

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۹ء میں ڈیرہ غازی خاں فتح کرنے کے بعد نواب صادق محمد خاں ثانی (۱۸۰۹ء۔۱۸۲۵ء) کو تین لاکھ روپے سالانہ خراج پر دیا تھا لیکن ہر سال وہ خراج کی رقم میں اضافہ کر دیتا تھا، جو ریاست کو مجبوراً ادا کرنا پڑتا۔ جب نواب بہاول خاں ثالث برسر اقتدار آیا تو خراج کی سیرت پانچ لاکھ روپیہ سالانہ ہو چکی تھی چنانچہ ریاست کی طرف سے خراج کی رقم ادا کرنے کے سلسلے میں تاخیر ہونے لگی۔ رنجیت سنگھ جو پہلے ہی ریاست بہاول پور پر حملے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے ۱۸۳۱ء میں اپنے فرانسیسی جنرل (Vintura) ونورا کو ڈسرہ غازی خاں پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ جنرل ونٹورا نے ڈیرہ غازی خاں پر حملہ کر کے نواب بہاول خاں ثالث کے نمائندے کو علاقے سے بے دخل کر دیا۔ "ڈیرہ غازی خاں پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے براہ راست ریاست بہاول پور پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ جس کے لیے اس نے فوج کے دو رسے تشکیل دیے۔ ایک دستے کو جنرل ونٹورا کی قیادت میں پاکپتن کے راستے مشرق کی جانب سے حملے کے لیے بھیجا جب کہ دوسرا دستہ جنرل شام سنگھ کی قیادت میں ڈیرہ غازی خاں سے ریاست کے شمال مغربی حصے پر حملہ کرنے کے لیے پیش قدمی کرنے لگا۔ ۱۲

اس مشکل وقت میں نواب بہاول خاں ثالث کو کسی مددگار کی ضرورت تھی اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تن تنہا رنجیت سنگھ کی فوج سے جنگ کر سکے۔ نواب بہاول خاں کو اپنی ہمسایہ ریاستوں سندھ، بیکا

نیئر یا جیسلمیر سے مدد کی کوئی امید تھی کیونکہ ان کے درمیان کبھی اچھے تعلقات ندرہے تھے اور دوا تنی بڑی قوتیں بھی تھیں کہ رنجیت سنگھ کا راستہ روک سکتیں۔ ان حالات میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہی وہ واحد طاقت تھی جو رنجیت سنگھ کو اس کے منصوبے پر عمل درآمد کرنے سے روک سکتی تھی۔ جس کے ساتھ ریاست کے غیر رسمی تعلقات ۱۸۰۹ء سے قائم تھے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا سفیر مسٹر الفنسٹن کابل جاتے ہوئے ریاست بہاول پور سے گزرا تھا جہاں نواب بہاول خاں ثانی نے اس کا شاندار استقبال کرتے ہوئے قیمتی تحائف نذرانے کے طور پر دیے تھے اور کمپنی کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے کا مدعا بھی بیان کیا تھا جس کا مسٹر الفنسٹن نے حوصلہ افزا جواب دیا تھا۔ اب ریاست کی بقا کو خطرے میں دیکھ کر نواب بہاول خاں ثالث نے اپنا نمائندہ غلام مصطفی شاہ کو شملہ میں گورنر جنرل ڈبلیوئی بینک کے پاس بھیجا اور ان سے مدد کی استدعا کی۔ 13

ایسٹ انڈیا کمپنی خود ان علاقوں میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کے لیے کوشاں تھی اور رنجیت سنگھ کو سندھ کی طرف بڑھنے سے روکنا چاہتی تھی اس لیے کمپنی رنجیت سنگھ کی فوجی نقل و حرکت کا فورا نوٹس لیا اور اسے متنبہ کیا کہ وہ دریائے ستلج کو عبور نہ کرے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تنبیہ پر رنجیت سنگھ کی افواج واپس چلی گئیں۔ ۱۴ اس طرح نواب بہاول خاں ثالث مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ریاست بہاول پور کو بچانے میں کامیاب رہا۔ اس ساری صورتحال سے یہ بات واضح تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی صوبہ سندھ میں اپنے مفاد کے پیش نظر رنجیت سنگھ کو دریائے سندھ کے دونوں اطراف میں اپنی حکومت قائم کرنے سے روکنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے ریاست بہاول پور کو مستقل طور پر اپنی سرپرستی میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے کمپنی نے لدھیانہ میں متعین اپنے پیٹیکل ایجنٹ کیپٹن سی ایم ویڈ اور لیفٹینینٹ میکسن کو نواب بہاول خاں ثالث سے معاہدہ کرنے کے لیے ریاست بہاول پور

بھیجا۔ ۱۵ بالآخر ۲۲ فروری ۱۸۳۳ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست بہاول پور کے نمائندوں کے درمیان باہمی بات چیت کے بعد معاہدہ طے پایا گیا جس کے اہم نکات یہ تھے:

1. ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب محمد بہاول خاں، اس کے ورثا و جانشینوں کے درمیان دوستی واتحاد قائم رہے گا۔
2. ایسٹ انڈیا کمپنی ریاست بہاول پور کے موروثی یا غیر موروثی علاقہ میں دست اندازی نہیں کرے گی۔
3. نواب اپنی ریاست کے انتظام واختیارات اور رعایا کے حقوق کے بارے میں خودتار میں گے۔
4. برطانوی حکومت کا جو نمائندہ نواب کے دربار میں رہنے کے لیے مقرر ہو گا وہ درج بالا شرائط کے مطابق نواب کے انتظام میں مداخلت سے پرہیز کرے گا اور دونوں حکومتوں کے درمیان دوستی کے قیام کو مدنظر رکھے گا۔
5. ریاست بہاول پور بینظور کرتی ہے کہ ریاست کے علاقے میں دریائے سندھ اور دریائے ستلج کے ذریعے سوداگروں کو آمد ورفت کی اجازت ہے بشرطیکہ پروانہ راہداری ان کے پاس ہو۔
6. حکومت بہاول پورا قرار کرتی ہے کہ جو تاجر اس راستہ سے گزریں گے ان سے اشیاء تجارت پر مناسب محصول وصرایا جائے گا جس میں کمی بیشی نہ ہو گی۔
7. مقرر شد محصول کو عام مشتہر کیا جائے گا اور علاقہ بہاول پور کے مال گزاری پر متعین افسران محصول کی وصولی کے بعد تاجروں کو کسی حد پر نہیں روکیں گے۔

8. انہیں اشیاء تجارت پر محصول وصول کیا جائے گا جو مقررہ راستے سے گزر میں گی اور اس کا واسطہ اس محصول سے نہیں ہو گا جو کہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کے لیے گھاٹ پر لیا جاتا ہے۔

9. جو تاجر اس راستہ سے گزر میں گئے ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جب تک علاقہ ریاست میں رہیں گے حکومت نواب کا خیال رکھیں اور کوئی عمل ایسانہ کریں جو نکی انتظام اور ریاستی عوام کے مذہب کے خلاف ہو۔

10. جو حصول نواب کے ساتھ مقرر کیا جائے گا اسی قدر اس کے اہلکاروں کے ذریعے مقررہ مقامات پر وصول ہو گا۔

11. سامان کا جائزہ لینے اور محصول کے لیے حکومت بہاول پور کے جو اہلکار مقرر ہوں گے دو مقامات مٹھن کوٹ اور ہری کے، قیام کریں گے اور دونوں مقامات کے علاوہ کہیں کشتیاں نہیں روکی جائیں گی اور نہ سامان کی تلاشی لی جائے گی۔

12. جب تاجر کسی مقام پر اپنی مرضی سے کشتیاں روکیں گے اور کچھ سامان اتار میں بالا دمیں گے اس سامان پر معاہدے کے آٹھو میں شرط کے مطابق محصول لیا جائے گا

13. جو سپر نٹنڈنٹ مٹھن کوٹ ٹھہرے گا وہ سامان کی تلاشی لے کر اور محصول وصول کر کے پروانہ راہداری دے گا جس میں سامان کی تفصیل درج ہو گی۔ جب میکشتی ہری کے پہنچے گی تو وہاں پر متعین سپر نٹنڈنٹ فہرست کے مطابق سامان کا جائزہ لے گا جو سامان زائد ہو گا اس پر محصول لیا جائے گا اور باقی سامان بلاروک جانے دیا جائے گا۔

14. ہری کے سے مٹھن کوٹ جانے والی تجارتی کشتیوں پر بھی یہی طریقہ کارلا گو ہو گا۔

15. نواب کے اہلکار حتی المقدور تاجروں کی حفاظت کریں تھے اور جو تاجر کسی مقام پر رات بسر کریں گر کسی تھانہ داریا صاحب اختیار شخص کو پروانہ راہداری دکھا کر حفاظت طلب کریں۔

16. اس عہد نامہ میں انتظام ملک اور تجارت کی نسبت جو بھی شرائط ر میں دونوں حکومتیں اس کی پابندی کریں گی۔ ۱۲

اس معاہدے کی پہلی چار شرائط ریاست بہاول پور اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان اتحاد اور دوستی کی توثیق کرتی تھیں جس کے تحت ریاست بہاول پور کو اپنے داخلی و خارجی معاملات میں آزادی دی گئی اور ریاست بہاول پور میں کمپنی کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کمنی کا نمائندہ تعین کیا گیا تھا۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے کافی حد تک ریاست بہاول پور کے ساتھ برابری کی سطح پر اپنے تعلقات قائم کیے تھے۔ معاہدے کی باقی شرائط دریائے ستلج اور دریائے سندھ میں ایسٹ انڈیانی سے تعلق رکھنے والی تمہاری آمدورفت سے تعلق رکھتی تھی۔

معاہدے میں اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست بہاول پور کے درمیان اتحاد اور دوتی کی بات کی گئی کی لیکن ایک دوسرے کے لیے عسکری تعاون کا ذکر نہ تھا تاہم بالواسطہ طور پر ایسٹ انڈیاپنی نے رنجیت جارہا تھا کہ ریاست بہاول پور اب اس کی حلیف بن چکی ہے اور وہ دوبارہ ریاستی علاقہ پر حملہ کرنے کی جرات نہ کرے۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست بہاول پور کو رنجیت سنگھ اور صوبہ سندھ کے درمیان رکاوٹ بنادیا جس کی وجہ سے رنجیت سنگھ کا صوبہ سندھ کی طرف بڑھنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس پابندی کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مارچ ۵ ۱۱ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے بھی دریائے ستلج اور دریائے سندھ میں تجارتی آمدورفت سے تعلق

معاہدہ کر لیا۔ اس طرح دریائے ستلج اور دریائے سندھ رنجیت سنگھ اور نواب بہاول خاں ثالث کے درمیان سرحد قرار پائے۔

اس تمام صورتحال سے یہ بات بھی واضح تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ دونوں ایک دوسرے سے خوف زدہ تھے اس لیے وہ بالواسطہ طور پر اپنی سرحدوں کے درمیان فاصلہ قائم رکھنا چاہتے تھے جیسا کہ انہوں نے ۱۸۰۹ء میں معاہدہ کرکے دریائے ستلج کی شمالی ریاستوں کو تحفظ دیا تھا تاہم ایسٹ انڈیا کمپنی ان چھوٹی غیر اہم ریاستوں کی بجائے افغان سرحد کے قریب ہونے کے لیے صوبہ سندھ اور پنجاب پر نظر رکھے ہوئے تھی اور رنجیت سنگھ کو اس کے علاقے تک محدود کرکے بتدریج کمزور کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے نواب بہادل خاں ثالث نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ کر کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا کیونکہ ریاست بہاول پور دو طاقتور دشمنوں رنجیت سنگھ اور امیران سندھ کے درمیان واقع تھی ایسے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہی ریاست بہاول پور کو تحفظ دے سکتی تھی۔

اس معاہدے کی وجہ سے ریاست بہاول پور معاشی طور پر بھی فائدہ حاصل ہوا کیونکہ اس سے پہلے دریائے ستلج پر اور دریائے سندھ پر ریاست کی جانب سے باقاعدہ طور پر محصولات کا نظام قائم نہ تھا لیکن اب نہ صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی وجہ سے دریائی تجارت میں اضافہ ہوا بلکہ ریاست کو حصولات بھی وصول ہونا شروع ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست بہاول پور سے معاہدے کی چوتھی شرط کے مطابق لیفٹیننٹ میکسن کو ریاست میں اپنا پہلا پیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا۔ ۱۸

ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدے کے بعد نواب بہاول خاں ثالث نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو خراج کی رقم دینا بند کر دی جو وہ نواب صادق محمد خاں ثانی کے دور سے ادا کر رہے تھے جس کی وجہ سے ریاست کی مالی حیثیت کافی مستحکم ہو گئی اور اندرون ریاست نواب بہاول خاں ثالث کے عزت و وقار

میں بھی اضافہ ہوا جس کے باعث عارضی طور پر ریاست کی داخلی صورتحال میں بھی امن و امان قائم ہو گیا۔

اس دوران ایسٹ انڈیا کمپنی رنجیت سنگھ کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو اس خطے میں مستحکم کرنے میں لگی رہی اس وقت کمپنی کی خواہش تھی کہ افغان حکومت کے ساتھ بھی اس کے تعلقات قائم ہو جائیں تاکہ وسط ایشیا اور ایران میں روس کے بڑھتے اثرات کوہندوستان میں دخل ہونے سے روکا جا سکے۔

۱۸۳۸ء میں امیر دوست محمد خاں حکمران کابل ہوئے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس نئے حکمران سے تعلقات پیدا کرنے کے لیے اپنی ایک سفارت الیگزینڈر برنس کی قیادت میں اس کے دربار بھیجی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سی سفیر ریاست بہاول پور سے گزرے تونواب بہادل خاں ثالث نے کمپنی کی خوشنودی کے پیش نظر ان کی خوب خاطر مدارت کی اور اپنی حفاظت میں انہیں دریائے سندھ عبور کرایا۔۱۹چر الیگزینڈر برنس نے کمپنی کے ایماء پر امیر دوست محمد خاں کو تجارتی ودفاعی نوعیت کے معاہدے کی پیش کش کی لیکن امیر دوست محمد خاں کاجھکاؤ ایران اور روس کی طرف تھا۔

اس سفارت کی ناکامی سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے محسوس کیا کہ جب تک امیر دوست محمد خاں کابل کے تخت پر براجمان رہے گا اس وقت تک روس کی جانب سے ہندوستان میں ان کے مفادات خطرے میں رہیں گے۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ شجاع الملک کو تخت کابل پر بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ کابل پر حملے کے لیے کمپنی نے شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ سے معاہدات کیے اور اس حملہ کے پیش نظر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست بہاول پور سے بھی ایک نیا عالم و کیا جس کے مندرجہ ذیل شرائط تھیں۔20

1. ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب بہاول خاں ثالث، اس کے ورثاء وجانشینوں کے درمیان دوستی واتفاق جاری رہے گا۔ ایک فریق کے دوست ودشمن دوسرے فریق کے دوست ودشمن تصور کیے جائیں گے۔
2. برطانوی حکومت وعدہ کرتی ہے کہ وہ ریاست بہاول پور کی حفاظت کرے گی۔
3. نواب بہاول خاں ثالث اور اس کے ورثاء وجانشین برطانوی حکومت کے تابع حکم رہیں گے اور اس کی حکومت کو اعلیٰ تسلیم کرلیں گے اور کسی رئیس حکومت سے تعلق نہ رکھیں گے۔
4. نواب اور اس کے ورثاء و جانشین کسی رئیس و حکومت غیر سے بلا اطلاع د منظوری سرکار انگریز دوستی واتفاق نہیں کریں گے۔
5. نواب اور اس کے ورثاء وجانشین کسی پر زیادتی نہ کریں گے مگر اتفاقی کسی سے تکرار واقع ہوگی تو وہ سپر ٹالٹی سرکار انگریزی کی جائے گی۔
6. سرکار بہاول پور بوقت ضرورت فوج سے سرکار انگریزی کی مدد کرے گی۔
7. نواب اور اس کے ورثاء اور جانشین حاکم کل اپنے ملک کے رہیں گے اور ملک میں انگریزی انتظام داخل نہ ہوگا۔

یہ معاہدہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست بہال پور کے درمیان بہت زیادہ اہمیت کا حال تھا۔ اس معاہدے سے گرچہ ان کے آپس کے تعلقات انتہائی قریبی نوعیت کے ہوگئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا لیکن ان کے درمیان حیثیت کا بہت نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ کمپنی نے ریاست کو صرف ایک انتظامی اکائی میں تبدیل کر دیا جس کا سربراہ نواب محمد بہاول

خاں ثالث کو قرار دیا گیا۔ ریاست اپنے تمام خارجی حقوق سے محروم ہو گئی اور اسے اس امر کا پابند بنا دیا گیا کہ وہ بیرونی مہمات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد کرے گی۔ اس معاہدے نے ریاست بہاول پور کو مکمل طور پر کمپنی کا ماتحت اور حلیف قرار دے دیا۔ اس معاہدے کے بعد کمپنی نے نواب بہاول خاں ثالث کو حکم دیا کہ وہ اپنے علاقے سے انگریز فوج کے گزرنے کے لیے سڑک تعمیر کروائے اور اس کے ساتھ سامان رسد اور دریائی آمد و رفت کا انتظام بھی کرے۔ ۲۱ نواب بہاول خاں ثالث نے اس مقصد کے لیے فیروز پور سے لے کر براستہ چولستان دریائے سندھ تک تقریباً ڈھائی سو میل لمبی سڑک بنوائی اور اس کے ساتھ چولستان سے گزرنے کے لیے اونٹوں اور دریائے سندھ کو عبور کرنے کے لیے کشتیوں کا بندوبست بھی کیا۔ ۲۳ چنانچہ افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے کمپنی کی فوج براستہ فیروز پور ۲۳ دسمبر ۱۸۳۸ء کو ریاست بہاول پور میں داخل ہوئی جہاں نواب بہاول خاں ثالث نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ نواب نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا کہ اسے اقتدار کے لیے کمپنی کی پشت پناہی حاصل رہے۔ انگریز فوج کے کابل فتح کرنے کے بعد کمپنی کی طرف سے خوشخبری کا ایک خصوصی مراسلہ نواب بہاول خاں ثالث کے نام بھیجا گیا جس کی خوشی میں نواب بہادل خاں ثالث نے احمد پور شرقی اور بہاول پور میں چراغاں کروایا اور توپوں کی سلامی دی۔ 23

ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی آڑ میں ریاست بہاول پور کے ذریعے عسکری ساز و سامان اور فوج سندھ میں بھیج کر سرزمین سندھ پی پی حیثیت کا مال کرلی تھی۔ اگرچہ ایران سند ایسٹ انڈیا کائی کے ساتھ کیے گئے معاہدات پر پوری طرح کاربند تھے لیکن ایسٹ انڈیا کی سند کو مکمل طور پر اپنے سال میں دیکھنا چاہتی تھی۔ 24

اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس وقت کی پالیسی کا جائزہ لیا جائے جو سندھ کے بارے میں اختیار کیے ہوئے تھی تو اس کا اپنا مفاد صاف نظر آتا ہے۔ چارلس نیپیئر نے اسوقت بزور طاقت تمام سندھ کو اپنے قبضے

میں کر لیا۔ اب ایسٹ انڈیا کمپنی خشکی کے راستوں کے ذریعے سندھ میں اپنی تجارتی سرگرمیاں شروع کرنا چاہتی تھی لیکن راستے میں ریاست بہاول پور کے علاقے چولستان سے گزرنا پڑتا تھالہذا اس طویل صحرا میں کمپنی نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے تجارتی قافلوں کے گزرنے کے لیے خود انتظام کرے جو اس کے لیے خاصا مہنگا ثابت ہو سکتا تھا چنانچہ یہ سب انتظامات نواب بہاول خاں ثالث کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ ممنون احسان رہے۔ اس مقصد کے لیے کمپنی نے ۱۸۴۳ء میں نواب بہاول خال ثالث سے ایک نیا معاہدہ آمد و رفت برائے خشکی کیا جس میں باقی شرائط کے علاوہ ایک شرط یتھی" اگر بہاول پور سے مقام سرسہ پختہ چاہات اور سرائیں مسافروں اور تاجروں کے لیے بنائی جائیں تو سرکار بہاول پور اپنے علاقے میں ہر منزل پر پختہ چاہات اور سرائیں مسافروں کے آرام کے لیے بنائے گی اور سڑک بھی بنا کر اس کی وقتاً فوقتاً مرمت کرتی رہے گی۔۲۵ اس معاہدے کی آڑ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فروری ۱۸۴۴ء میں اپنے نمائندے رابرٹ ہملٹن، فریڈرک اور کیپٹن میرین کو نواب بہاول خاں ثالث کے پاس بھیجا۔ انہوں نے گورنر جنرل کے کہنے پر نواب بہاول خاں ثالث سے درخواست کی کہ ریاست کی مشرقی سرحد کا علاقہ کوٹ وٹواں برطانوی ہند کی عمل داری میں دے دیا جائے چنانچہ نواب بہاول خاں ثالث نے کمپنی کے کہنے کے مطابق کوٹ وٹواں کا سرسبز و شاداب علاقہ جس پر ۲۵ ہزار سالانہ مالیہ قیئم تھا، باسی معاوضہ کے کمپنی کے حوالے کر دیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاستی حکمران کمپنی کے سامنے پوری طرح بے بس تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے صحرائے راجپوتانہ کے ذریعے صوبہ سندھ میں اپنی تجارتی سرگرمیاں شروع کرنے کے بعد ان علاقوں کو زیادہ محفوظ اور پر امن بنانے کے لیے ۱۸۴۵ء میں ریاست بہاول پور اور ریاست بیکانیر کی سرحد بندی کروادی تاکہ دونوں ریاستیں اپنے علاقوں کے اندر تجارتی شاہراہوں کا بہتر طور پر انتظام کر ہیں۔ ۲۲

اب کمپنی کی نظر میں پنجاب پر تھیں اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے وہاں اپنا اثر ورسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔ پھر ایسے واقعات پیش آئے کہ پنجاب کا مشرقی اور شمال مغربی علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ اس وقت ملتان پر دیوان مولراج گورنر تھا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اختلاف کے باعث اپنے عہدے سے استعفی دینے کا اعلان کر دیا۔ ملتان کی سکھ فوج دیوان مولراج کے اس فیصلے سے متفق بھی۔ اس لیے جب می لوگ ۲۲ اپریل ۱۸۴۸، کو دیوان مولراج سے چارج لینے کے لیے قلعہ ملتان پہنچے تو سکھ فوج کی جانب سے ان پر حملہ کیا۔ لہذا انگریزوں نے اس آزمائش کے وقت بھی اپنے حلیف نواب بہاول خاں ثالث سے امداد طلب کی۔ ۴۷ اتنے میں مولراج کی فوج نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے بغاوت کا اعلان کر دیا اور مولراج بھی ان کے ساتھ شامل ہو چکا تھا۔ باغی فوج نے انگریز نمائندوں کے کیمپ پر حملہ آور ہو کر انہیں قتل کر دیا۔ ایسے وقت میں ملتان کی سکھ بغاوت نے دیگر حصوں کے سکھوں کو بھی متحرک کر دیا جو پنجاب میں انگریزی اقتدار کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔ اس موقع پر لاہور کے چیف کمشنر جان لارنس نے نواب بہاول خاں ثالث سے رابطہ قائم کیا اور اسے ملتان پر حملے کے لیے فوج تیار رکھنے کو کہا۔ اس کے ساتھ نواب بہاول خاں ثالث کے لیے یکم بھی آیا کہ وہ اپنے علاقے میں دیوان مولراج کے آدمیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اور اپنے عاقے میں اس کی جائداد ضبط کر لے۔ نواب صاحب نے اس پر عمل کرتے ہوئے دیوان مولراج کی جائداد ضبط کر لی اور اس کے وکیل کو ریاست بدر کر دیا۔ ۴۸ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس بغاوت کو دبانے کے لیے لیفٹیننٹ ایڈورڈز کو فوج سمیت ملتان کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اس کے ملتان پہنچنے سے پہلے کمشنر لاہور نے نواب بہاول خاں ثالث کو اپنی فوج علاقہ ملتان میں داخل کرنے کو کہا اور ساتھ یہ تاکید بھی کی کہ اس کی فوج دریائے ستلج کے پار جتنے علاقے پر ممکن ہو، قبضہ کر لے اور وہاں امن وامان برقرار رکھے اور فصل ربیع کا مالیہ وصول کرے۔ نواب بہاول خاں ثالث نے اپنی تین

ہزار سے زیادہ فوج دریائے ستلج کے پار بھیج دی۔ اب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملتان پر ایک بڑا حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے نواب بہاول خاں ثالث سے مزید فوج طلب کی گئی۔ چنانچہ نواب نے مزید فوج بھیجی۔ لیفٹیننٹ ایڈورڈز جو ملتان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اسے یہ خبر دریائے چناب کے کنارے ملی اس نے اس وقت ایک مراسلہ نواب بہاول خاں کے نام ارسال کیا جس میں نواب بہاول خاں ثالث کی خدمات کو سراہا اور اس اہم موقع پر مدد کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی ریاستی فوج کی فتح پر مبارک باد دی۔۲۹

ریاست بہاول پور کی فوج کو اس کی شاندار خدمات پر بیش قیمت انعامات سے نوازا گیا۔ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے نواب محمد بہاول خاں ثالث کے لیے ایک لاکھ روپے سالانہ پنشن تاحیات مقرر کی اور آٹھ لاکھ روپیہ فوج کی خدمات کے لیے دیا گیا۔ فتح ملتان کے ساتھ ہی تمام پنجاب سے سکھ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ریاست بہاول پور کو تین نسلوں تک سکھوں سے اپنی بقاء کا خطرہ لاحق رہا تھا اور وہ سکھوں کو بھاری خراج ادا کرتے رہے تھے۔ جو انہیں واپس نہ ملا کیونکہ اسے انگریزوں نے اپنی عمل داری میں شامل کر لیا تھا لیکن ریاستی حکمران اس پر خوش تھے کہ انہیں سکھوں کے خطرے سے نجات مل گئی۔

حوالہ جات

V.A. Smith, The Oxford Student History of India, London, 1951,

p.741.

Ibid, p. 742

M. R. Palande, Introduction to India Administration, Bombay,

1951.

p.p. 81-82.

Ibid, P. 83.

Shahamat Ali, History of Bahawalpur, London, 1948, p.142.

Henry Steinback, The Punjab, Karachi, 1973, p.171.

ایتان اپنی اور ریاست بہاولپور کے باہمی تعلقات کا جائزہ

Shahamat Ali, Opcit., p. 174

Sinha, N.K. Ranjit Singh, Calcutta, 1933, p.p. 116-117.

S.S. Thorburn. The Punjab in Peace and War, Lahore, n.d/p. 5.

Khushwant Singh, A History of the Siks, Vol. 1(1469-1893),

Delhi,

1977, p. 275.

Shahamat Ali, Opcit, p. 176.

Din Mohammad, Political History of Bahawalpur, d.n.f-2.

Ibid, f-4

Ibid, f-5

سید مراد شاہ گردیزی، تاریخ مراد، (جلد چہارم) ف۱۵۔

ایضاً، ف۱۸۔

Henry Steinback, Opcit., p. 175.

سید مراد شاہ گردیزی، بحوالہ سابقہ ص۱۸۔۱۸۔

S.A. Akhtar Kazmi, Anglo Afghan Tussle, karachi, 1984, p. 37.

Shahamat Ali, Opcit, p. 219.

اشرف گورگانی و دین محمد، حوالہ سابقہ ص۲۱۵۔

Din Mohammad, Political History of Bahawalpur, p. 20.

اشرف گورگانی در بین محمد، بحوالہ سابقہ، بہاول پور ۱۹۹۹، ص۲۱۷۔

Roberts, P.E. History of Brithsh India, London, 1958, p. 328.

سید مراد شاہ گردیزی، بحوالہ سابقہ ص۲۹۔

ایضاص۸۷-۸۸۔

ایضاص۸۹۔

اشرف گورگانی و دین محمد، حوالہ سابقہ ۲۲۴۔

Din Mohammad, Opcit, p.46.

ریاست بہاول پور کے حکومت پاکستان سے طے پائے جانے والے معاہدات (الحاق سے ادغام تک) کا جائزہ

ریاست بہاول پور کو تقسیم کے بعد مملکت پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے والی سب سے اولین اور سب سے بڑی مسلم ریاست کا اعزاز حاصل ہے۔ ۲۵ ۵۸۸ مربع کلومیٹر رقبہ پر محیط اس ریاست کو برصغیر کی اہم ریاستوں کی درجہ بندی کی فہرست میں دوسرے درجے کی ریاست شمار کیا جاتا تھا۔ جبکہ متحدہ پنجاب اور راجپوتانہ کے گروپ کی ریاستوں میں ریاست بہاول پور کا نمبر ریاست پٹیالہ کے بعد آتا تھا۔ اسی طرح حکومت برطانیہ کی طرف سے منصبی قدر و منزلت (پروٹوکول) کے اعتبار سے امیر آف بہاول پور کے اعزاز کے لیے سرکاری طور پر سترہ توپوں کی سلامی مختص تھی۔ اہم سرکاری تقاریب میں وہ گورنر پنجاب اور مہاراجہ پٹیالہ کے بعد جگہ پاتے تھے (۱)۔
برطانوی حکومت نے ریاست بہاول پور کے آخری نواب صادق محمد خان خامس عباسی کی خدمات کے اعتراف میں انہیں ہز ہائی نس، جی سی آئی ای (نائیٹ گرینڈ کمانڈر آف دی انڈین امپائر)، کے سی وی او (نائیٹ کمانڈر آف دی رائیل وکٹورین آرڈر) اور کسی ایس آئی (تالیف کمانڈر آف بہار آف دی سٹار آف انڈیا) کے خطابات اور اعزازات سے نوازا گیا تھا (۲)۔

جسے ذیل میں ریاست بہاول پور سے پاکستان کے الحاق (۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء) ون یونٹ میں اس کے ادغام (۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء) اور ون یونٹ کی تحلیل (یکم اپریل ۱۹۷۰ء) کے بعد پنجاب کے ساتھ انضمام کے تمام واقعات کو دستاویزی ریکارڈ کی روشنی دی میں پیش کیا جاتا ہے۔ تین جون کے منصوبے کی رو سے حکومت برطانیہ کو مسلم لیگ کے دیرینہ مطالبہ وقت بہ "تقسیم کرو اور ملک چھوڑ دو (Divide)(and quit "کو تسلیم کرنا پڑا۔ قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے مطابق برصغیر پاک و ہند کی چھ سو ترانوے ریاستوں (۳) سے برطانوی حکومت کے تمام سابقہ معاہدات منسوخ کر دیے

گئے۔ اس قانون کے ظاہری الفاظ سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوئی اور ریاستی حکمرانوں کی اکثریت نے یہی سمجھا کہ اب وہ بذات خود ایسی آزاد مملکتوں کے مالک بن چکے ہیں۔ جنہیں بین الاقوامی طور پر آزادی وخود مختاری کے تمام تر حقوق واپس مل چکے ہیں(۴) ۔ بلکہ انتقال اقتدار ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی تکمیل تک ریاستی حکمران اس خوش فہمی میں بہتا رہے کہ اگر وہ چاہیں تو پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کی بجائے اپنی اپنی ریاست کی خود مختارانہ حیثیت پر صادر کریں۔(۵)۔

موقع محل کی مناسبت سے امیر آف بہاول پور نواب صادق محمد خان خامس عباسی (۱۹۲۴ تا ۱۹۵۵ء) نے انتقال اقتدار کے موقع پر اپنے ایک شاہی فرمان کے ذریعے اپنے نقطہ نظر کو اس طرح سے واضح کیا "یہ میری دلی خواہش ہے کہ آزادی ملنے کے بعد اپنی ریاست کے بہتر اظم ونسق کے لیے اپنے عوام کی اعانت سے اسلامی نظریہ کے مطابق ایک ایسا آئین مرتب کیا جائے جو مذہب اسلام کے روشن خیال اور بہبود پر مبنی نظریات پر استوار ہو۔ جس کی رو سے میری محبوب رعایا کو ہر قسم کی روحانی ومادی ترقی کے مواقع میسر ہوں، جس کی رو سے میری حکومت اس بات کی یقین دہانی کرائے گی کہ میری عوام کے قانونی حقوق و مفادات کی درست طریقے سے حفاظت کی جائے گی اور یہ کہ انہیں نظم ونسق مملکت میں زیادہ سے زیادہ شرکت کے مواقع میسر ہوں۔ یہ بھی میری حکومت کی خصوصی کوشش ہو گی کہ رعایا کے ان طبقات کی جو کہ آبادی میں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں یا معاشی اور تعلیمی لحاظ سے دوسروں سے پیچھے ہیں اور خصوصی توجہ کے مستحق ہیں کے جائز حقوق و مفادات کا تحفظ کرے۔ اس بات کی یقین دہانی کرائی جائے گی کہ میری ریاست کے ہر شہری کو بلا روک ٹوک اپنے مذہب اور عقیدے پر عمل پیرا ہونے، اظہار رائے عمل اور اجتماع کی آزادی ہو۔ اسی حد تک جب تک کہ وہ مسلمہ اخلاق اور ریاستی قانون کی حدود کی خلاف ورزی کے باعث نہ ہو۔ میری حکومت انتہائی مستعدی سے ایسے تمام منصوبوں پر غور کر رہی ہے جن کو بروئے کار لاتے

ہوئے میری ریاست کے مستقبل کی تعمیر نو اوترقی کے اہم امور طے کیے جائیں۔ اس سلسلے میں تمام تجاویز کو جلد ہی میرے سامنے پیش کیا جائے گا۔

جہاں تک ہمارے ہمسایوں سے دوستی اور مستقبل کے تعلقات کا تعلق ہے۔ اس ضمن میں میری انتہائی خواہش ہے کہ ریاست بہاول پور کے تعلقات اس کے بڑے ہمسائیوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ اور قریبی ہوں ۔ بہت غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مملکت پاکستان سے جغرافیائی اتصال اور معاشرتی، سماجی اور معاشرتی روابط کی وجہ سے میرے نمائندے پاکستان کی مجلس قانون ساز میں شرکت کریں تا کہ اس طرح نہ صرف میری ریاست اور مملکت پاکستان کے مابین گہرے تعلقات استوار ہو سکیں بلکہ باہمی امور کا آئینی طریقے سے حل نکل سکے۔ علاوہ ازیں آئین کی تیاری میں شرکت کریں۔ ہمارے سامنے قومی تعمیر وترقی اور بہبود کا ایک بہت بڑا فریضہ ہے جس کے لیے عمل پیہم کی ضرورت ہے اور مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اس سلسلے میں میری عوام میری حکومت کی معاونت کریں گے اور میری حکومت کے اراکین مجتمع ہو کر اپنی توجہ تعمیر نو اور ترقیاتی امور کی طرف مبذول کریں تا کہ اس طریقے سے یہ ریاست ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ مجھے یقین ہے کہ خداوند تعالی کے فضل وکرم سے بہاولپور نہ صرف روحانی اور مادی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو گا بلکہ برصغیر پاک وہند میں امن وخوشحالی کے قیام کے سلسلے میں بھرپور معاونت کرے گا۔ میں دعا گو ہوں کہ خداوند تعالیٰ کے کرم اور حضور پینے کی برکات میرے محبوب عوام پر قائم و دائم رہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امن وامان سے رہیں اور ان کی خوشیوں اور خوشحالی میں اضافہ ہو (٦)"۔

درج بالا فرمان شاہی کو امیر آف بہاول پور کی مستقبل کی حکمت عملی کا آئینہ دار کہا جاسکتا ہے، جس میں انہوں نے ایک اسلامی ریاست کے مسلم حکمران کی حیثیت سے پاکستان سے اپنے روابط اور اپنے

عوام کے جمہوری حقوق اور ترقی وخوشحالی سے متعلق اپنے عزائم اور مقاصدِ کار کا تعین کیا۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ شروع سے ہی اپنا جھکاؤ پاکستان کی طرف رکھتے تھے اور اس سے الحاق کے لیے مستقبل قریب میں کسی مناسب موقع محل کے منتظر تھے۔

تقسیم ملک کے منصوبے کے اعلان کے فوراً بعد وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن (۱۹۴۷ء) نے برصغیر پاک وہند کی ان ریاستوں کی آزادی وخود مختاری پر کاری وار کیا جو تاج برطانیہ سے وفادارانہ جذبات کے عملی اظہار کے طور پر شروع سے ہر قسم کی قربانیاں پیش کرتے چلے آئے تھے۔ اس موقع پر وائسرائے نے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا کہ ہندوستانی ریاستوں کو بہر صورت کسی نہ کسی مملکت ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کرنا ہوگا(۷)۔ یہ قطعی فیصلہ غالباً کانگریس کے ایماء پر بعد میں کیا گیا تھا اور اس سے سب سے زیادہ فائدہ اس کو حاصل ہوتا تھا کیونکہ بیشتر ریاستیں ہندوستانی علاقوں سے گھری ہوئی تھیں۔ برصغیر میں ریاست بہاول پور ہی وہ واحد ریاست تھی جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک بفرسٹیٹ (Buffer State) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی مشرقی اور جنوبی سرحد کا چار سو پچاس کلو میٹر علاقہ ہندوستان کے حساس ترین صوبہ مشرقی پنجاب اور ریاست ہائے بیکانیر وجیسلمیر سے ملتا تھا۔ ایک طرف دریائے ستلج پر واقع ریلوے کا ایمپرس برج (پل) پاکستان کے دو بڑے صوبوں سندھ اور پنجاب کے مابین مواصلاتی رابطے کا اہم ترین ذریعہ تھا۔ دوسری طرف اس کی مشرقی ریلوے لائن کا سلسلہ ہندوستان سے جاملتا تھا(۸)۔ مزید یہ کہ چودہ کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والا تلج ویلی پراجیکٹ زرعی خوشحالی کا ضامن تھا(۹)۔ ریاست بہاول پور کی جغرافیائی اور دفاعی اہمیت کے پیش نظر کانگریسی لیڈروں کی رائیں ٹپکنے لگیں اور انہوں نے اس ریاست کے ہندوستان سے الحاق کی کوششوں کو تیز کر دیا۔ کیوں کہ ریاست بہاول پور پر قبضہ کرنے کے بعد ان کا پاکستان پر بالادستی کا منصوبہ ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ پاکستان نے نظریاتی طور پر وہ اب تک تسلیم نہیں کرتے

تھے اور ان کے لیڈر متواتر یہ بیان دے رہے تھے کہ قیم مارضی ہے۔ شاطر ہندو قیادت نے اس مقصد کے لیے ریاست بہاول پور کے وزیر اعظم مشتاق احمد گورمانی (۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء) اور امیر آف بہاول پور کے بہنوئی اور چچازاد بھائی کرنل معتصم باللہ عباسی (۱۹۱۶ء تا ۱۹۹۱) کو راہ بریگانیر کے توسط سے بریکانیر کے راج محل میں ملاقات کی دعوت دی۔ یہاں پہیل نے ریاست کی ان دونوں اعلی شخصیات سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں اور ان کے توسط سے نواب آف بہاول پور کو ہندوستان سے الحاق کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ بقول کرنل معتصم باللہ انہوں نے پٹیل پر واضح کیا کہ نواب صاحب کسی بھی صورت میں ہندوستان سے الحاق پر راضی نہ ہوں گے کیونکہ ان کے قائد اعظم سے بڑے گہرے روابط ہیں۔ مزید یہ کہ وہ اسلامی ذہن کے مالک ہیں۔ یہ کہ کر وہ تو واپس بہاول پور آ گئے لیکن گورمانی صاحب پٹیل کے پاس رہ گئے۔ غالباً وولاچ میں آ گئے کیونکہ واپسی پر ایک بھاری بھرکم بریف کیس ان کے ہمراہ تھا۔ کانگریسی اعلیٰ قیادت نے ان دونوں شخصیات کو ایک بار پھر دہلی کے وائسر ریگل لاج میں بلایا جہاں ان کی ملاقات نہرو اور پٹیل سے ہوئی تھی۔ جہاں اس سکیم کو قابل عمل بنانے کے لیے اور نواب آف بہاول پور کے لیے پر کشش بنانے کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی کہ اگر امیر آف بہاول پور ہندوستان سے الحاق پر رضامند ہو جائیں تو ریاست ہائے بہاول پور، بیکانیر، جیسلمیر اور راجپوتانہ کی بعض ملحقہ ریاستوں کا علیحدہ انتظامی یونٹ بنا کر ان پر امیر آف بہاول پور کو آئینی سربراہ بنایا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ ان کی مراعات اور ذاتی جائیداد کو ہر قسم کا تحفظ دیا جائے گا (۱۰) ۔ اس دوران نواب صادق محمد خاں خامس پاکستان سے قریبی تعلقات کا فرمان جاری کرنے کے بعد علاج و معالجہ کی فرض سے انگلستان جاچکے تھے۔ یعنی ریاست کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی سازش آپ کی غیر موجودگی میں کی جارہی تھی۔ غالباً ان کی واپس پر گورمانی نے اپنے شاطرانہ انداز سے نواب صاحب کو رام کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جس کے جواب میں نواب

صاحب نے اپنا قطعی فیصلہ سنایا کہ " میری ریاست کا سامنے کا دروازہ پاکستان میں کھلتا ہے، لہذا وہ ایک شریف آدمی کی حیثیت سے اس دروازے کو استعمال کرنا پسند کریں گے (۱۱)"۔

اس کے فوراً بعد تین نومبر ۱۹۴۷ء کو نواب صادق محمد خان خامس نے ایک اعلان کے ذریعے ریاست بہاول پور کا الحاق فیڈریشن آف پاکستان کے ساتھ کر دیا۔ جس کے تحت پاکستان کے گورنر جنرل، وفاقی اسمبلی، فیڈرل کورٹ اور دیگر وفاقی اداروں کو ریاست کے اندر وفاقی معاملات سے متعلق تمام امور کی انجام دہی کے لیے قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے تحت اختیارات منتقل کر دیئے۔ اس اعلامیہ کے مطابق امیر آف بہاول پور کو اپنی ریاست میں حاصل ہونے والے تمام تر اختیارات، حقوق اور مراعات بر قرار رہیں گے اور ریاست میں مروجہ قوانین کو ہر قسم کا تحفظ حاصل ہو گا۔ امیر آف بہاول پور کے اس اعلامیہ کو معاہدہ الحاق کی حیثیت دیتے ہوئے امیر آف بہاول پور کے دستخطوں کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے پانچ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنے دستخط ثبت کر کے اس کی توثیق کی (۱۳) ۔ سننے میں آتا ہے کہ ریاست بہاول پور کے معاہدہ الحاق کے سلسلے میں قائد اعظم جیسے با اصول اور آئینی شخص نے نواب صادق خامس کو اس بات کی فراخ دلانہ پیش کش کی تھی کی وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کی شرائط تحریر کہ ناپسند کریں لکھ دیں۔ انہیں اسے قبول کرنے میں کسی قسم کا کوئی تامل نہ ہو گا۔ غالباً یہ سب کچھ نواب صاحب کا اپنی ریاست کے الحاق کے سلسلے میں دی جانے والی سب سے بڑی قربانی کا اعتراف تھا جسے قائد اعظم نے سراہتے ہوئے انہیں اپنے طور پر شرائط تحریر کرنے کا اختیار دیا(۱۳) ۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو حکومت پاکستان اور امیر آف بہاول پور کے مابین ایک اور معاہداتی شیڈول جسے منی معاہدہ الحاق کا درجہ حاصل ہے پر دستخط ہوئے جس میں ریاست کے دفاع، بیرونی معاملات اور مواصلات کے سلسلے میں قانون سازی کے اختیارات وفاقی مقعہ کو

آنویض کیے گئے۔ اس معاہدہ پر گورنر جنرل خولہ ناظم الدین (۱۹۴۸ء تا ۱۹۱۵ء) نے دستخط کیے (۱۴) - ۱۷ جنوری ۱۹۴۹ء کو وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان (۱۹۴۷ء تا ۱۹۱۵ء) اور امیر آف بہاول پور کے مابین ریاست میں مزید وفاقی قوانین کے اطلاق کے لیے بعض تفصیلات طے ہوئیں۔ جن کے نتیجے میں 19 جنوری ۱۹۴۹ء کو امیر آف بہاول پور اور حکومت پاکستان کے مابین ایک اور معاہدہ ہوا جس کی رو سے قرار پایا کہ آئندہ سے امیر آف بہاول پور کا مقام ایک آئینی سربراہ کا سا ہوگا۔ تاہم اہم معاملات اور پالیسی امور کے سلسلے میں اور اعلیٰ عہدوں پر تعیناتی کے ضمن میں ان سے رابطہ رکھا جائے گا۔ اس کی دوسری شق کے مطابق امیر آف بہاول پور اپنے ذاتی اخراجات کے لیے مختص شدہ رقم تک محدود رہیں گے۔ اس کی تیسری شق کے مطابق موجودہ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر ۸ مارچ ۱۹۴۹ء کو اپنی حکومت کے پچیس سالہ دور حکومت کی سلور جوبلی کے موقع پر مزید آئینی اصلاحات کا اعلان کریں گے، جس میں وہ اپنے عوام کو حکومتی معاملات میں شریک کرنے کا لائحہ عمل پیش کریں گے۔ اس معاہدے کی چوتھی شق کے مطابق خان بہادر نبی بخش خان سابق ریونیو منسٹر کے سابقہ ریکارڈ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے ریاست میں داخلہ اور ملازمت کے حصول پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ معاہدے کے پانچویں دفعہ کے تحت، امیر آف بہاول پور کے باڈی گارڈز فر دستے کے لیے پانچ لاکھ روپے سالانہ مقرر کیے گئے۔ تاہم پاکستانی فوج کے جنرل آفیسر کمانڈ کو اس کی ٹرمینگ، تعداد، معائنہ اور اسلحہ کی نوعیت سے متعلق اختیار دیا گیا۔ اس معاہدے کی چھٹی شق کے تحت حکومت بہاول پور کی طرف سے مجوزہ بارڈر کانسٹیبلری کے بارے میں طے ہوا کہ اس منصوبے پر عملدرآمد حکومت پاکستان سے باہمی مشورے کے بعد عمل میں لایا جائے گا۔ اس دفعہ سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ پاکستان ڈیزرٹ رینجرز کی تشکیل کا سہرا ریاست بہاول پور کے سر جاتا ہے۔ اس کی ساتویں دفعہ کے مطابق ریاست کی طرف سے ایک کروڑ روپے سالانہ کی رقم حکومت

پاکستان کو دفاع کے مقصد کے لیے مختص کی گئی۔ واضح ہو کہ ۱۹۴۹ء میں ایک کروڑ سالانہ کی رقم اتنی زیادہ تھی کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ریاست بہاول پور کا وہ واحد انتظامی یونٹ تھا جو مرکزی محاصل کے علاوہ حکومت پاکستان کو ایک کروڑ روپے سالانہ کی ادائیگی کرتا تھا جب کہ دوسرے انتظامی یونٹ مرکزی حکومت سے امداد پاتے تھے (۱۵)۔ اس معاہدے کی نویں اور آخری شق کے تحت کسٹم کے قوانین کا مرکزی حکومت کی طرف سے ریاست میں عملاً اطلاق کیا گیا۔ اس معاہدے پر ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء کو امیر آف بہاول پور اور گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے دستخط ثبت ہوئے (۱۶)۔

۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو امیر آف بہاول پور کی طرف سے مرکزی حکومت سے تعلقات سے متعلق ایک اور اعلامیہ جاری ہوا جس کی دفعہ نمبر ا کے مطابق امیر آف بہاول پور نے اپنے انتظامی اختیارات اپنے وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو تفویض کرنے اور خود کو ایک آئینی حکمران کی حیثیت دینے کا اعلان کیا۔ تاہم انہیں اہم معاملات اور اعلی عہدوں پر تعیناتی سے متعلق معاملات سے آگاہ رکھنا ضروری ہو گا۔ اس بیان میں انہوں نے اپنی پچیس سالہ حکمرانی کی مدت کے پورا ہونے پر ۸ مارچ ۱۹۵۰ء کو مزید اصلاحات جاری کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس اعلان کی تیسری شق میں آپ نے اپنے باڈی گارڈز دستے کو نصف کرنے اور بقیہ نصف کے تمام اخراجات خود اپنے صرفِ خاص سے پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس معاہدے کی چوتھی شق کے مطابق بہاول پور حکومت کی طرف سے تشکیل پانے والے بارڈر پولیس کے تمام تر اخراجات امیر آف بہاول پور نے اپنی جیب خاص سے ادا کرنے کا اعلان کیا۔ معاہدہ کی چھٹی شق میں امیر آف بہاول پور نے پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں ریاست خیر پور گروپ کے ساتھ شرکت کرنے اور اپنے نمائندہ کو خود نامزد کرنے کا فیصلہ کیا (۱۷)۔

پھر ۳۰راپریل ۱۹۵۱ء کو ایک اور ضمنی معاہدہ الحاق مرتب ہوا جس کی پہلی دفعہ کے تحت امیر آف بہاول پور نے قطعی طور پر مرکزی قانون سازی سے متعلق شیڈول کے حصہ اول اور حصہ دوم سے متعلقہ امور پر قانون سازی کا اختیار وفاقی مقننہ کو دے دیا جبکہ اس معاہدہ کے تیسرے حصے میں درج شدہ امور مکمل طور پر ریاتی متقفہ کے سپرد کیے گئے۔ اس طرح یہ ایک زیادہ واضح معاہدہ تھا جو امیر آف بہاول پور نے مرتب کیا تھا۔ اس کی تیسری شق کے تحت گورنر جنرل پاکستان اور وفاقی مقننہ کو مرکزی امور کے سلسلے میں ریاست پر بالا دستی حاصل ہوئی۔ اس معاہدہ پر بھی امیر آف بہاول پور اور گورنر جنرل پاکستان نے دستخط کیے (۱۸)۔

یکم مارچ ۱۹۵۲ء کو امیر آف بہاول پور نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے ریاست میں حکومت خود اختیاری اور ذمہ دارانہ نظام حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے تحت ریاست میں عبوری آئین ۱۹۵۲ء کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔ اس آئین کی رو سے ایک کابینہ تشکیل دی جانی تھی جسے منتخب عوامی نمائندوں پر مشتمل مجلس مقننہ کے سامنے جواب دہ ہونا تھا۔ اس آئین میں امیر آف بہاول پور کے آئینی اختیارات کی بھی توضیح کر دی گئی تھی۔ اپنے اعلان میں امیر آف بہاول پور نے صراحت کی کہ وہ ایک آئینی سربراہ کی حیثیت سے اپنے اختیارات کی انجام دہی میں معاونت اور مشورہ کے لیے گورنر جنرل سے مشورے کے بعد ایک تجربہ کار ایڈوائزر کا تقرر کریں گے۔ کابینہ اور امیر آف بہاول پور یا ان کے ایڈوائزر کے مابین اختلاف رائے کی صورت میں حکومت پاکستان سے مشورہ طلب کیا جائے گا جس کے مطابق عمل ہو گا۔ آپ کے اس اعلان کو معاہدہ الحاق ریاست بہاول پر ۱۹۵۲ء کا نام دیا گیا۔ اس پر امیر آف بہاول پور اور گورنر جنرل غلام محمد نے اپنے دستخط علی الترتیب ۲۷ مارچ اور ۱۱ر اپریل ۱۹۵۲ء کو ثبت کیے۔ واضح ہو کہ عبوری دستور ریاست بہاول پور ۱۹۵۲ء کو صرف اس وقت تک نافذ العمل رہنا تھا جب تک پاکستان کا دستور نہ بن جاتا۔ پاکستان کے دستور کے

نفاذ کے ساتھ ہی ریاست کا دستور ختم ہونا قرار پایا جس کی وضاحت درج بالا معاہدہ میں کر دی گئی تھی (۱۹)۔

امیر آف بہاول پور کی ذاتی پنشن، جائیداد اور دیگر مراعات بشمول گدی نشینی کو تحفظ دینے کے لیے حکومت پاکستان کی ضمانت کے ساتھ ایک اور معاہدہ ۱۱ اپریل ۱۹۵۲ء کو گورنر جنرل پاکستان اور امیر آف بہاول پور کے درمیان قرار پایا جو چار آرٹیکلز اور متعدد دفعات پر مشتمل تھا۔ اس کے مطابق امیر آف بہاول پور ۲۹،۵۰۰۰۰ (انتیس لاکھ پچاس ہزار روپے سالانہ بطور پنشن ریاستی محاصل سے وصول پانے کے مجاز قرار پائے۔ یہ رقم ہر قسم کے ٹیکسوں سے متثنیٰ تھی۔ مذکورہ رقم ہر سال چار برابر اقساط میں واجب الادا تھی۔ آرٹیکل نمبر کی رو سے امیر آف بہاول پور کو اپنے تمام ہیرے، جواہرات، زیورات شیئرز، سیکورٹیز اور دیگر تمام نجی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی ملکیت کا حق دیا گیا بشرطیکہ وہ معاہدہ کے نفاذ کی تاریخ سے ریاست کی ملکیت نہ رہی ہو۔ مذکورہ بالا تمام املاک کی فہرستیں امیر آف بہاول پور کو معاہدہ کے نفاذ کے تین ماہ کے اندر اندر حکومت پاکستان کو پیش کرنا تھیں۔ کسی بھی نجی یا ریاستی املاک کی ملکیت سے متعلق اختلاف کی صورت میں گورنر جنرل آف پاکستان کے فیل کو قطعی حیثیت حاصل تھی۔ آرٹیکل نمبر س کے تحت امیر آف بہاول پور اور ان کے خاندان کو ریاست کے اندر اور بیرون ریاست حاصل ہونے والی تمام تر مراعات، شان وشوکت اور اعزازات بر قرار رکنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آرٹیکل نمبر کی رو سے امیر آف بہاول پور کو حاصل شدہ تمام نجی حقوق، مراعات، القابات اور ریاست کی گدی نشینی کے تمام حقوق کو مروجہ قوانین کے مطابق جاری رہنے کی ضمانت دی گئی۔ اس معاہدے پر حکومت پاکستان کی طرف سے گورنر جنرل غلام محمد اور ایس۔ ایم عباسی امیر آف بہاول پور نے دستخط کیسے (۲۰)۔

آخری معاھدہ ریاستی افواج کے پاکستانی فوج میں انضمام سے متعلق تھا۔ اس کی پہلی دفعہ کے تحت ریاست کی طرف سے دفاع کے نام پر ادا کی جانے والی ایک کروڑ روپے سالانہ کی رقم کی ادائیگی کی سابقہ شق کو ختم کر دیا گیا۔ دوسری دفعہ کے مطابق طے پایا کہ ریاست بہاول پور سے وصول کیے جانے والے مرکزی ٹیکسوں کو بالکل اسی طرح سے مرکز اور ریاست کے مابین تقسیم کیا جائے گا جس طرح سے پاکستان کے دوسرے صوبوں میں کیے جاتے ہیں۔ معاہدہ کی تیسری دفعہ کی رو سے ریاستی افواج کو پاکستانی افواج میں ضم کر دیا گیا تاہم امیر آف بہاول پور کے باڈی گارڈ دستے کو ریاست بہاول پور کی فوج کی حیثیت حاصل رہی جس کی تعداد اور انتظام وانصرام حسب سابق قائم رہا۔ اس کی چوتھی دفعہ کے تحت بہاول پور کی افواج کے یونٹوں کے نام حسب سابق برقرار رہے اور انہیں امیر آف بہاول پور کی طرف سے حاصل ہونے والے کلر برقرار رکھے گئے۔ اس معاہدہ کی پانچویں دفعہ کے مطابق امیر آف بہاول پور حسب سابق ان یونٹوں کے کرنل انچیف رہے۔ چھٹی شق کی رو سے امیر آف بہاول پور کے بادی گارڈ ز دستے کے لیے مختص کی جانے والی سالانہ پانچ لاکھ روپے (۵۰۰۰۰۰) کی رقم کے علاوہ مزید آڑھائی لاکھ روپے (۲۵۰۰۰۰) سالانہ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کی غرض سے ریاستی محاصل سے امیر آف بہاول پور کو ادا کرنے پر اتفاق کیا گیا۔ اس معاہدے کی آخری شق کے مطابق ریاست کی حدود میں تعینات افواج پاکستان کے تمام یونس کو پابند کیا گیا کہ وہ امیر آف بہاول پور کے شایان شان ان کی عزت افزائی کا حتی المقدور خیال رکھیں گے اور انہیں اہم تقاریب کے موقع پر ان کی خواہش پر گارڈ آف آنر پیش کریں گے۔ اس معاہدے پر حکومت پاکستان کی طرف سے ریاستوں اور سرحدی امور کے سیکریٹری کرنل عبد الرحیم خان اور امیر آف بہاول پور نے ۲۴ر اپریل ۱۹۵۲ء کو دستخط کیسے (۲۱)۔

یہاں پر یہ بات واضح ہو کہ نواب صادق محمد خان خامس کو اپنی فوج سے بڑی گہری وابستگی تھی۔ انہیں اکثر سپاہیوں کے نام تک یاد تھے۔ وہ بہاول پور کی فوج کو اپنے زیر کمان رکھنا چاہتے تھے۔ البتہ اس کی خدمات ایک امدادی فوج کی حیثیت سے دفاع پاکستان کے لیے وقف کرنے کو دلی طور پر آمادہ تھے۔ مگر ریاست کی افواج کو پاکستانی فوج کا ایک حصہ بنانے کے لیے انتہائی غیر مناسب طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے وزیر اعظم پاکستان کے ایماء پر اک معاہدہء الحاق مرکزی حکومت کی طرف سے تیار کر کے وزیر اعظم، ریاست کرنل ڈریگ کو بھجوایا گیا۔ اسے ہدایت کی گئی کہ اگر نواب صاحب اس پر دستخط کرنے سے انکار کریں تو انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ کرنل ڈرنگ کسی پیشگی اطلاع کے بغیر صادق گڑھ پیلس میں داخل ہوا اور نواب صاحب کے سامنے افواج بہاول پور کے انضمام کا معاہدہء دستخط کے لیے رکھ دیا۔ اس موقع پر نواب صاحب نے کرنل ڈرنگ کو بہت برا بھلا کہا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کا حکم ہے۔ اگر آپ نے اس پر دستخط نہ کیے تو آپ کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس پر نواب صاحب نے بذریعہ فون پاکستان کی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل گریسی سے رابطہ کیا، تو اس نے بھی اس کی تصدیق کی۔ نواب صاحب کو اپنی قربانیوں کے بدلے میں حکومت پاکستان سے اس قسم کے محسن کشن رویے کی قطعا کوئی امید نہ تھی۔ چنانچہ صورتحال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے آپ نے اس معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ کرنل معتصم باللہ عباسی کے مطابق جس روز ریاستی فوج کو پاکستانی فوج میں ضم کرنے کی تقریب منعقد ہوئی اور ریاست بہاول پور کی فوج کا جھنڈا لپیٹ کر پاکستانی فوج کے کمانڈر کے حوالے کیا گیا تو اس موقع پر نواب صاحب اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے۔ وہ تقریب کے اختتام پر فوراً اپنے کمرے میں پہنچے اور انتہائی بے بسی کے عالم میں دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا(۲۲)۔

یکم مارچ ۱۹۵۲ء کے امیر آف بہاول پور کے اعلامیے کے نتیجے میں ریاست میں پہلے عام انتخابات ۲۱ مئی ۱۹۵۲ء، کو منعقد ہوئے جس کے نتیجے کے طور پر اس مئی ۱۹۵۲ء کو مخدوم زادہ سید حسن محمود (۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۴ء) نے ریاست کے پہلے اور آخری جمہوری وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا (۲۳) ۔ یہ دور مجموعی طور پر فلاحی و جمہوری روایات و ترقیات کا سنہری زمانہ تھا لیکن پاکستان کے ایک انتظامی یونٹ کی حیثیت سے یہ دور انتہائی مختصر ثابت ہوا۔ ۲۴ / اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جب گورنر جنرل غلام محمد نے اپنے آمرانہ اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے حکومت کو برطرف کر دیا اور ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا(۲۳) ۔ تو اس آئینی بحران کے نتیجے میں امیر آف بہاول پور نے مرکزی حکومت کے مشورے سے ۲ نومبر ۱۹۵۴ء کو بہاول پور اسمبلی اور وزارت کو برطرف کر دیا اور ریاست بہاول پور کے عبوری آئین ۱۹۵۲ء کے تحت تمام اختیارات اپنے مشیر اعلیٰ عبد الرشید خان کے توسط سے خود سنبھال لیے (۲۵) ۔ اسی دوران مرکز میں ملک کے دونوں حصوں کے مابین مقننہ میں نمائندگی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اور پاکستان کے مستقبل کے دستور کی تیاری میں رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے گورنر جنرل ملک غلام محمد کی تحریک پر وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے وحدت مغربی پاکستان کے منصوبے کا اعلان ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو پیش کیا۔ جسے سرحد، پنجاب اور سندھ کی اسمبلیوں نے منظور کر لیا اور مارچ ۱۹۵۵ء میں گورنر جنرل نے اپنے ایک آرڈیننس کے ذریعے ون یونٹ کے قیام کے اختیارات خود حاصل کر لیے لیکن اسی دوران گورنر جنرل کے اس اقدام کو فیڈرل کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا تو فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل کے اس فعل کو غیر دستوری قرار دے کر ون یونٹ سے متعلق فیصلے کا اختیار نئی دستوریہ کو دے دیا۔ بالآخر ون یونٹ سے متعلق حتمی بل نئی دستوریہ کی تشکیل کے بعد جولائی ۱۹۵۵ء میں چوہدری محمد علی وزارت کے دوران پیش ہوا جو ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کے اجلاس میں پاس کیا گیا جس کی رو سے ۱۴/ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ون یونٹ وجود میں آ

گیا۔ اس بل کی رو سے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ایک انتظامی یونٹ میں مدغم کر دیا گیا جس کے نتیجے کے طور پر ۱۴/ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ریاست بہاول پور کو اس کی رائے عامہ کے منشاء کے برخلاف صوبہ مغربی پاکستان میں مدغم کر دیا گیا(۲۶)۔

ون یونٹ کے قیام کے بعد نہ صرف یہ کہ ریاست بہاول وپر کے سوا دو سو سالہ عہد کا خاتمہ ہو گیا بلکہ اس سے بہاول پور میں ترقی کے وہ تمام منصوبے جو جمہوری حکومت نے شروع کیے تھے ٹھپ ہو کر رہ گئے اور بہاول پور کو ایک کمشنری کا درجہ دے کر ڈیرہ غازیخان کے موجودہ علاقے کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ فوری طور پر ون یونٹ کے قیام کے بعد ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین مساوی نمائندگی کا مسئلہ حل ہو گیا اور پاکستان جو کافی عرصہ سرزمین بے آئین تھا حل ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء میں ملک کو بدستور مل گیا۔ مزید یہ کہ دستور مرتب ہونے کے نتیجے میں پاکستان کو برطانوی ڈومینین سٹیٹس کی بجائے "اسلامی جمہوریہ پاکستان کا درجہ حاصل ہوا (۲۷)۔ لیکن جلد ہی ون یونٹ سکیم بھی ملک کے دونوں حصوں کے عوام کو خوش نہ رکھ سکی اور اس کی تنسیخ کے لیے کوششیں کی جانے لگیں۔ بالآخر یحیی خان نے برسر اقتدار آنے کے بعد مارشل لاء کی چھتری کے سائے میں یکم اپریل ۱۹۷۰ء کو وحدت مغربی پاکستان کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس موقع پر بہاول پور کا سابقہ انتظامی یونٹ بحال کرنے کی بجائے اس کو صوبہ پنجاب کے ایک ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا۔ اگرچہ یہاں کے لوگوں نے بہاول پور کی صوبائی بحالی کے لیے ایک زبردست تحریک چلائی لیکن جلد ہی اس تحریک کو مارشل لاء حکومت کے تشدد کا نشانہ بنایا (۲۸)۔ اگر ون یونٹ کے خاتمے کے بعد بہاول پور کو بھی ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء سے اپنی سابقہ حالت پر ایک علیحدہ انتظامی یونٹ کی حیثیت دی جاتی تو حکومت کے اس اقدام سے یہ علاقہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا۔ اس علاقے کے وسائل مقامی طور پر استعمال کیے جاتے اور بہاول پور کے عوام احساس محرومی کا شکار نہ ہوتے۔

حوالہ جات وتعلیقات

: The Government of India, Memorandum on the Indian States,

The Punjab States Agency. The 1Delhi, 1926, P-165.

2list of Ruling Princess, Calcutta, 1924, P-2

Sir William gee Warner, The Native States of India, London, 1900,

3P-6 . 3

(۴) لیری کولنس ودامنگ لیپیر، آدھی رات کی آزادی، سری نگر بہن ندارد، ص ۱۵۲۔

Richard Symand, The Making of Pakistan, Islamabad, 1976, P: 90-

591

(۶) حکومت بہاول پور، فرمان مبارک نواب صادق محمد خان خامس، بہاول پور گزٹ، ۲۷

/ اگست، ۱۹۴۷، ص ۳۰۲

Dr. Ishifaq Hussain Qureshi, A short History of Pakistan, Karachi,

71967 P-232. Ishtig.

(۸) محمد طاہر، خطہ بہاول پور، ایک تاریخ ایک سر گزشت، سہ ماہی الزبیر شمار نمبر ۳، ۲۰۰۱، اُردو اکیڈمی بہاول پور جس ۸۷

(۹) محمد انوار نبی قریشی، مختصر تاریخ بہاول پور، لاہور، ۱۹۳۱، ص ۱۲۰

(۱۰) انٹرویو، کرنل معتصم باللہ عباسی، ۵ جون ۱۹۹۰ء

(۱۱) بریگیڈیر سید نذیر علی شاہ، صادق نامہ، لاہور، ۱۹۷۳، ص ۹۱، ۹۲

(۱۲) دفتر دستاویزات بہاول پور، معاہدہ الحاق ریاست بہاول پور، ۱/ ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۷، کل صفحات ۳

(۱۳) قائد اعظم نے جودھپور اور جیسلمیر کے مہاراجوں کو بھی دہلی میں ملاقات کے دوران یہ پیش کش کی تھی کہ وہ جو رعائتیں اور سہولتیں چاہتے ہوں لکھ دیں، میں دستخط کیے دیتا ہوں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: لیری کونس وو دامنگ لیپیر، آدھی رات کی آزادی، ص ۱۵۱

(۱۴) دفتر دستاویزات بہاول پور، شیڈول مشمول تفویض اختیارات، ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء، صفحات ۴

(۱۵) معاہدے کی اس شق سے متعلق امیر آف بہاول پور متفق نہ تھے۔ وہ اسے اپنی ریاست کے وسائل اور عوام پر ایک بھاری بوجھ تصور کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بارہا لیاقت علی خان سے مراسلت بھی کی۔ خود حکومت پاکستان کے نامزد کردہ ریاست بہاول پور کے وزیر اعظم کرنل ڈرنگ نے بھی لیاقت علی خان سے احتجاج کیا کہ وہ ریاستی عوام پر ایک کروڑ روپے سالانہ کی ادائیگی کو زیادتی کے مترادف سمجھتا ہے۔ مزید بر آں حکومت پاکستان ریاست سے جو محصولات وصول کرتی ہے۔ ان سے بھی کوئی حصہ ریاست کو نہیں دیا جاتا۔ مزید بر آں، مرکزی حکومت نے ریاست کو تقریباً چار لاکھ مہاجرین کی بحالی اور آبادکاری کے سلسلے میں بھی کوئی امداد نہیں کی۔ ریاست بہاول پور پاکستان کا ایک یونٹ ہونے کی حیثیت بالکل اسی طرح کے سلوک اور امداد کی مستحق ہے جس قسم کی امداد پاکستان کی دوسری اکائیوں کو دی جا رہی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: محافظ خانہ بہاول پور میں وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ امیر آف بہاول پور اور کرنل ڈرنگ کی باہمی خط و کتابت کا ریکارڈ۔

(۱۶) محافظ خانہ بہاول پور ضمنی معاہدہ الحاق ریاست بہاول پور، ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء، صفحات ۳

(۱۷) محافظ خانہ بہاول پور، اعلامیہ نواب صادق محمد خاں خامس، ۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء

(۱۸) ضمنی معاہدہ الحاق ریاست بہاول پور ۱۹۵۲ء

(۱۹) ضمنی معاہدہ الحاق ریاست بہاول پور ۱۹۵۲ء

(۲۰) ضمنی معاہدہ الحاق ریاست بہاول پور، ۱۱راپریل ۱۹۵۲ء

(۲۱) محافظ خانہ بہاول پور، ضمنی معاہدہ الحاق ریاست بہاول پور ۲۴راپریل ۱۹۵۲ء

(۲۲) انٹرویو، کرنل معتصم باللہ عباسی ۱۰ جون ۱۹۹۰ء

(۲۳) ۲۹ مئی ۱۹۵۲ء کو امیر آف بہاول پور نے اپنے فرمان کے ذریعے مخدوم زادہ سید حسن محمود کو چیف منسٹر ریاست بہاول پور مقرر کیا دیکھیے، گورنمنٹ گزٹ بہاول پور، ۲۹ مئی ۱۹۵۲، نمبر ۲۷، جلد ۸۸، ص ۱

(۲۴) سید نور احمد، مارشل لاء سے مارشل لاء تک، لاہور، ۱۹۶۶، ص ۴۲۷

(۲۵) مخدوم زادہ سید حسن محمود، میر اسیاسی سفر، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۰۰

(۲۶) مسعود حسن شہاب، بہاول پور کی سیاسی تاریخ اردو اکیڈمی بہاول پور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۵۴

27. Dr.Ishtiaq Hussain Qureshi, A short History of Pakistan, Karachi, 1967, P-254

(۲۸) صاحبزادہ محمد قمر الزمان عباسی، بغداد سے بہاول پور، لاہور، ۲۰۰۲ء ص ۱۸۲

ریاست بہاول پور کے علی گڑھ سے تعلقات کا جائزہ

The Bahawalpur state rendered great services for the Aligarh Movement since its beginning. In 1870 the state provided fund to this educational institution This was the time when Sir Syed was planning the M.A.O. school The last three Nawabs of Bahawalpur helped this Muslim institution. They have personal relations to Sir Agha Khan, Sir Syed and Sir Ras Mahmood. During the period of last Nawab Saudisz Muhammad Khan Abbasi-V (1924-1955), the state provided some about 3 Lac rupees for the Muslim university Aligarh. Nawab Sir Sadiq Muhammad Khan Abbasi-V presided the convocation of Aligarh University in 1930. At this function he also donated one Lac rupees to the university.

تقسیم سے قبل بر صغیر پاک و ہند کی مسلم ریاستوں میں ریاست بہاول پور اپنی سرپرستی کی وجہ سے شہرت رکھتی تھی۔ خلفائے بنو عباس سے اپنے نسبی تعلق کے پیش نظر امیران بہاول پور کو اپنی مذہبی و علمی سیادت کا ہمیشہ سے پاس رہا۔ اسی ناطے اُنہوں نے نا صرف ہر خطے کے نامور علمائے کرام کو پذیرائی بخشی بلکہ اُن کی معاونت سے ریاست کے طول و عرض میں مدارس و مکاتب قائم کیے۔ حتی کے جب 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد برطانوی ہند میں مسلمانوں کے تعلیمی اوقاف کی ضبطی سے اسلامی علوم و فنون کی ترویج انحطاط کا شکار ہوئی تو ریاست بہاول پور میں دینی علوم کی اشاعت بدستور جاری و ساری رہی۔ یہی وہ دور تھا جب خصوصیت سے علمائے دیوبند اور مدرسہ سہارن پور کے علمائے

کرام کے علاوہ دہلی، ٹونک اور پنجاب(1) کے علمی خانوادے اپنے علم و دانش سے اس خطے کو منور و تاباں کرنے میں مصروف تھے۔ اس پس منظر میں جب سر سید احمد خاں(1817ء تا1898ء) نے برصغیر کے مسلمانوں کے نجات دہندہ کی حیثیت سے تعلیم اور صرف تعلیم کا مقصد دیا تو خطہ بہاول پور کے عوام اور حکمرانوں نے نا صرف جدید تعلیم کو لبیک کہتے ہوئے نئی منزل متعین کی بلکہ علی گڑھ کے ادارے کے قیام کے ساتھ ہی اس سے اپنے مراسم قائم کیے اور مقدور بھر اس کی مَالی معاونت کا فریضہ بھی ادا کیا۔ باقاعدہ طور پر علی گڑھ اور دربار بہاول پور کے مابین تعلقات کا آغاز1870ء میں اُس وقت ہوا، جب مسلمانوں کے اس عظیم تعلیمی ادارے کے قیام کے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ چنانچہ فروری 1870ء میں ایک وفد ڈیرہ نواب کے قدیم محل میں پہنچا۔ اگرچہ اس وقت نواب صادق محمد خاں رابع (1879ء تا 1899ء) کمسن تھے اور ریاست کی نگران عبوری حکومت(1866ء تا باشرت کائی سا1878) انگریز پولٹیکل ایجنٹ میجر نمین(1866 - 1874) کی نگرانی میں قائم تھی، جو بیرون ریاست نے تعلیمی و سماجی اداروں کو چندے دینے کی روادار نہ تھی اور ایسے اخراجات کو ریاستی خزانے کے لئے غیر ضروری اصراف تصور کرتی تھی۔ تاہم اس موقع پر کمسن نواب کی والدہ حضرت مَائی صاحب اَور ان کے دَرباریوں نے اس وفد کی پذیرائی کی بلکہ نواب صاحب کی والدہ کے حکم پر اُن کے نجی مصارف میں سے تین ہزار روپے کی امداد فراہم کی گئی۔(2) ریاستی اخبار" صادق الاخبار کی26 فروری1870ء کی اشاعت میں اس وفد سے متعلق سید احمد خاں کے وفد کے عنوان سے تفصیلی خبر شائع کی گئی، جس سے ریاستی عوام پہلی بار علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے آگاہ ہوئے۔ واضح ہو کہ ریاست بہاول پور کا مذکورہ بالا ہفت روزہ اخبار جو 1867ء سے شائع ہو رہا تھا، میں وقتاً فوقعاً علی گڑھ سے متعلق مضامین اور خبروں کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ مثلاً یکم تمبر 1887ء کے اخبار میں علی گڑھ مدرسہ" کے عنوان سے شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ خاں

(1832ء تا 1915ء) کا مضمون شائع کیا گیا۔(3) اس اخبار نے علی گڑھ سے معلق معلومات کی اشاعت سے بہاول پور کے عوام میں تحریک علی گڑھ اور اُس کے مقاصد کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا، جس سے اس خطے کے عوام میں تحریک پاکستان سے وابستگی پید اہوئی۔

نواب صادق محمد خاں رابع کے دور میں ریاست بہاول پور میں تحریک علی گڑھ کے اثرات جدید تعلیمی اداروں کے قیام کی صورت میں مرتب ہوئے۔ اس دوران محکمہ تعلیم کا قیام عمل میں آیا۔ تعلیم کے اشاعت و فروغ کے لئے علی گڑھ کی "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی طرز پر ریاست کے عمائدین اور اہلِ علم پر مشتمل " 1882ء میں ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی گئی،(4) جس کی سفارشات کو بروئے کارلاتے ہوئے ریاست میں تعلیمی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ اس کے مطابق ورنا کیولر اور اینگلو ورنا کیولر قسم کے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ ان میں سینتیس پرائمری سکول، سات عمل سکول، ایک ہائی سکول اور کالج شامل تھے۔(5) جب کہ اساتذہ کی تربیت کے لئے مدرستہ المعلمین" (نارمل سکول) 1871ء سے قائم تھا۔(6) علاوہ ازیں دینی علوم کی ترویج کے لئے دس مدارس عربیہ، (7) تعلیم نسواں کے لیے ایک مدرسہ (8) اور فنی تعلیم کی ترویج کے لیے صادق انڈسٹری سکول کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔(9) واضح ہو کہ ریاست میں یہ تعلیمی ترقی 1866ء سے 1899ء کے درمیانی عرصے کے دوران ہوئی۔ یہی وہ دور ہے جب کہ ایک طرف سر سید احمد خاں ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کوشاں تھے، تو دوسری طرف ریاست بہاول پور ایک صغیر پاکستان کی صورت میں اپنے علاقے میں جدید تعلیم کے اداروں کی تکمیل میں مصروف تھی ان میں سب سے اہم 1882ء میں قائم ہونے والا ایمرٹن ہائی سکول تھا،(10) جسے 1886ء میں کالج کے درجہ پر ترقی دے دی گئی۔(11) اس طرح اس خطے میں ثانوی تسلح پر جدید تعلیم کا آغاز مڈن اینگلو اور نینٹل ہائی

سکول علی گڑھ کے قیام (1875ء) کے ٹھیک سات سال بعد اور کالج کی سطح پر تعلیمی سہولیات کا آغاز ایم۔ اے۔ او کالج (1877ء) سے ٹھیک نو سال بعد عمل میں آیا۔

یہاں ریاست بہاول پور کے صادق ایجرٹن کالج کا تذکرہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے موجودہ خطہ پاکستان میں قائم ہونے والے کالجوں کی فہرست میں تیسرے کالج کا درجہ حاصل ہے۔ جس کی تشکیل زمانی اعتبار سے گورنمنٹ کالج لاہور اور فارمن کرسچن کالج لاہور کے بعد ہوئی۔ واضح ہو کہ اس وقت تک سندھ، بلوچستان اور سرحد کے علاقہ جات کالج کی سطح کے تعلیمی اداروں سے یکسر محروم تھے۔ (12) یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام مسلم ریاستوں میں بہاول پور کے ایس ای کالج کا قیام ریاست حیدر آباد دکن میں قائم ہونے والے کالج کے ساتھ ہوا۔ (13) جب کہ ہندوستان کی دیگر مسلم ریاستیں اور اکثر ہندو مقامی ریاستیں کالج کی سطح کے تعلیمی اداروں سے تہی دَست تھیں۔

یقیناً نواب صادق محمد خاں رابع کے دور میں ریاست بہاول پور میں جدید تعلیمی کا قیام اور کالج کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کی ترویج کا سبب علی گڑھ سے کر بہاول پور کے تعلقات کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان تعلقات کو نواب مذکورہ کی وفات کے بعد اُن کے جو اں سال جانشین نواب محمد بہاول خاں خامس (1903ء تا 1907ء) نے بھی بدستور قائم رکھا۔ حتیٰ کہ نواب مذکورہ کی علی گڑھ سے وابستگی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ ایکسن کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ آپ نے اس دوران 8 اگست 1901ء کو علی گڑھ کالج ہسپتال فنڈ کے لیے دس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ (14) اور ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کے لیے ریاستی خزانے سے دو ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ مقرر کی گئی۔ (15) اس سالانہ امداد میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ قیام پاکستان تک جاری رہا۔ نواب محمد بہاول سے خاں خامس کے دور میں ریاست میں مزید تعلیمی ترقی ہوئی۔ آپ نے 1904ء میں ہائی سکول اور کالج کے طلباء کے لیے اقامت گاہیں قائم کیں، (16) جن کا نظام علی گڑھ کالج کے ہاسٹل کی طرز کا

تھا۔ نواب مذکورہ نے کالج کے لیے ایک شاندار عمارت کی تعمیر کی منظوری دی،(17) جس کی تعمیل 1918ء میں ہوئی۔ (18) آپ کے ولی عہد نواب صادق محمد خاں خامس کی کم سنی کی وجہ سے ریاست کا نظم و نسق کونسل آف ریجنسی کے سپرد کر دیا، جس کے سربراہ مولوی سر رحیم بخش (1907 تا 1924ء) تھے۔ یہ عبوری حکومت سترہ برس19241907 t, ء)تک ریاستی نظم و نسق کی نگران رہی۔(19) اس دور میں علی گڑھ سے دربار بہاول پور کے تعلقات ایک تسلسل سے قائم رہے۔ خصوصاً جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے لیے لاکھوں روپے کے فنڈ کی ضرورت تھی تو اس موقع پر ریاست بہاول پور نے بڑھ چڑھ کر اَپنا حصہ دیا۔

علی گڑھ کی تاریخ میں سال 1911ء کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ سال تھا جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کی تحریک سر آغا خاں (1878ء تا 1957ء) کی قیادت میں پورے شدومد سے جاری تھی۔ وہ اپنی قد آور شخصیت اور سیاسی رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے میں لاکھ روپے کا فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع کر چکے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے دربار بہاول پور سے بھی بھرپور معاونت کی درخواست کی، جس کا اندازہ اُن کی طرف سے جنوری سے مارچ 1911ء کے دوران لکھے جانے والے چار خطوط سے لگایا جاسکتا ہے جو ریاست بہاول پور کے ریکارڈ آفس میں محفوظ ہیں۔ ذیل میں ان خطوط کا لب لباب اور ان کے جواب میں ریاست بہاول پور کی طرف سے علی گڑھ کو امداد کی فراہمی کے سلسلے میں کیے جانے والے عملی اقدامات کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں تحریر کیا جانے والا پہلا خط 26 جنوری 1911ء کو 109 -پن اسٹریٹ کلکتہ سے ریاست بہاول پور کی عبوری حکومت کے صدر مولوی سر رحیم بخش کو تحریر کیا گیا، جس میں اُن سے استدعا کی گئی کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے معقول رقم کا عطیہ دیں۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ خط سر آغا خاں کی ایما پر آپ کی طرف سے مولانا شوکت علی (متوفی 1938ء) نے

تحریر کیا تھا۔(20)واضح ہو کہ سر آغاخاں کی قیادت میں علی گڑھ کے دیگر زعما کی طرح علی بر اوران بھی یونیورسٹی کے قیام کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ مسلم یونیورسٹی کی امداد کے لیے بہاول پور کی کونسل آف ریجنسی کے صدر مولوی رحیم بخش کو دوسرا خط گیارہ فروری 1911ء کو بنارس سے سر آغاخاں کی ہدایت پر مولانا شوکت علی نے ارسال کیا، جس میں مطلع کیا گیا کہ آغاخاں اسی روز یعنی گیارہ فروری کی صبح کو وائسرائے سے ملاقات کے لیے کلکتہ روانہ ہو چکے ہیں تاکہ اُس سے یونیورسٹی کے قیام سے متعلق گفت و شنید کی جائے۔ اس خط میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ آغاخاں اس مقصد کے لیے ہیں لاکھ روپے اکٹھا کرنے کی مہم شروع کر چکے ہیں۔ نواب رام پور کی طرف سے اڑھائی لاکھ روپے کی ادائیگی کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس سے متعلق سر دست اُنہوں نے معذرت کی ہے کیوں کہ اس سال منعقد ہونے والے دہلی دربار کے موقع پر (دسمبر 1911ء) کافی اخراجات اٹھیں گے۔ اس لیے دربار بہاول پور سے درخواست ہے کہ وہ یونیورسٹی فنڈ میں اڑھائی لاکھ روپے کا عطیہ دیں۔ واضح ہو کہ خود ریاست بہاول پور کو بھی دربار دہلی کی تقریب میں شرکت کے لیے لاکھوں روپے کے اخراجات کرنا تھے۔ مولانا شوکت علی نے اس خط میں یہ بات بھی تحریر کی تھی کہ سر آغاخاں 24 اور 25 فروری 1911ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کی تشکیل کے لیے فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں لاہور میں اجلاس منعقد کریں گے جن میں بہاول پور کی طرف سے اُن کی شمولیت ضروری ہے۔(21)

ریاست بہاول پور کے صادق الاخبار کی اشاعت مورخہ 2 مارچ 1911ء سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس قومی مسئلہ پر منعقد ہونے والی دوروزہ میٹنگ میں جو آغاخاں کی صدارت میں لاہور میں منعقد ہوئی، ریاست بہاول پور کی طرف سے سر رحیم بخش نے شرکت کی،(22) بلکہ اس کے ساتھ ہی مارچ 1911ء میں دربار بہاول پور کی طرف سے ڈیڑھ لاکھ روپے کا عطیہ بھی فراہم کر دیا گیا۔ جس کے شکریے کے طور پر 7 مارچ 1911ء کو آغاخاں نے مالا بار ہل بمبئی سے سر رحیم بخش کو خط

تحریر کیا۔ یہ خط آغاخاں نے اپنے ہاتھ سے لکھا جس کے آخر میں اُن کے دستخط ثبت ہیں۔(23)اس کے دو دن بعد مورخہ 9مارچ 1911ء کو سر آغاخاں نے ایک اور خط مالا بار بل بمبئی سے ہی روانہ کیا۔ جس میں ڈیڑھ لاکھ روپے عطیہ دینے پر دوبارہ شکریہ ادا کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی مزید پچاس ہزار روپے دینے کی درخواست کی گئی۔(24) یہاں پر واضح ہو کہ ریاست بہاول پور کے ماخذات میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو فراہم کیے جانے والے عطیے کی مالیت سے متعلق متضاد بیانات ملتے ہیں، مگر آغا خاں کے خط سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ریاست بہاول پور نے مارچ 1911ء میں یونیورسٹی کو ڈیڑھ لاکھ روپے کا بیش بہا عطیہ فراہم کیا تھا۔ دسمبر 1916ء میں ایک اور پیش رفت یہ ہوئی کہ دربار بہاول پور کی طرف سے علی گڑھ کالج کو فراہم کی جانے والی سالانہ امداد میں مزید دو ہزار روپے کا اضافہ کر دیا گیا۔(25)

سابق ریاست بہاول پور کے محافظ خانہ میں متعدد ایسی دستاویزات کا ریکارڈ موجود ہے، جن سے اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ جب کبھی علی گڑھ کو کسی ہنگامی مالی معاونت کی ضرورت پیش آتی تو اس کے عمائدین بلا حیل و حجت دربار بہاول پور سے رجوع کرتے اور ایسے مواقع پر انہیں کبھی مایوسی نہ ہوتی۔ مثلاً 1912ء کے دوران علی گڑھ کے آنریری سیکرٹری مولوی مشتاق حسین وقار الملک (1841ء تا 1917ء) کی طرف سے ریاست بہاول پور کو تحریر کیے جانے والے تین خطوط کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی انتظامیہ ایم۔ اے۔ او کالج کے اکاؤنٹنٹ شاہ مصطفی احمد کو اکاؤنٹس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ بھیجنا چاہتی تھی تاکہ اس تربیت کی بدولت وہ علی گڑھ کے ادارے اور خصوصاً مستقبل میں قائم ہونے والی مسلم یونیورسٹی کے مالیاتی اُمور کو بہتر انداز میں چلا سکیں۔ کیوں کہ اُن کے بیرون ملک سفر اور دو سالہ ٹریننگ پر کافی سرمایے کی ضرورت تھی، اس لیے صاحبزادہ آفتاب احمد نے دسمبر 1911ء میں بہاول پور کی عبوری حکومت کے صدر مولوی سر رحیم

بخش سے ملاقات کی۔ اور 18 فروری 1912ء کو یاددہانی کے لیے سینٹرل سٹینڈنگ کمیٹی علی گڑھ کے لیٹر پیڈ پر خط بھی لکھا۔ (26) اس قسم کا ایک اور خط شیخ محمد عبد اللہ نے بھی دربار بہاول پور کو روانہ کیا۔ جب کہ علی گڑھ کے آنریری سیکرٹری وقار الملک نے اس مقصد کے لیے 23 فروری 1912 کو ایک خط بذریعہ ڈاک روانہ کیا، (27) جب کہ اس تاریخ کو اپنے سفارشی خط کے ساتھ شاہ مصطفی احمد کو بہاول پور روانہ کیا۔ اس سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

اگر شاہ صاحب مذکور کی مدد جناب فرماسکیں تو یہ ایک ایسا کام ہو گا جس سے ایک ہونہار اور شریف فرد قوم کی حاجت بر آری ہو گی۔ اُمید ہے کہ مسلم قوم کے واسطے، اس کالج کے واسطے اور مسلم یونیورسٹی کے واسطے نہایت ضروری ہو گا۔ شاہ صاحب اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ولایت سے واپس آئے تو بہ حیثیت اپنے پیشہ کے یونیورسٹی کے واسطے نہایت کارآمد شخص ثابت ہوں گے اور نہ صرف درستی و تکمیل حسابات میں اُن سے مدد ملے گی بلکہ۔۔۔" (28)

ظاہر ہے کہ قومی مقاصد کے لیے علی گڑھ کے عمائدین کی اس محبت اور اپنائیت سے امداد کی وصولی کا یہ انداز صرف مسلم ریاست بہاول پور سے ہی ممکن تھا جسے تقسیم سے قبل اس محلے میں برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں اور اُن کے تعلیمی و معاشرتی اداروں کی سرپرستی کا بڑا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ ریاست بہاول پور اور علی گڑھ کے درمیان تعلقات اُس وقت عروج پر پہنچے جب نواب صادق محمد خاں خامس (1924ء تا 1955ء) تخت نشین ہوئے۔ یہی وہ نواب تھے جنہیں بجا طور پر محسن پاکستان" کے خطاب سے معنون کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے دوسو میں 220 سالہ جدی پشتی اقتدار کو استحکام پاکستان کے نام پر نثار کر دیا اور اپنی 45,588 مربع کلومیٹر ریاست کا پاکستان سے الحاق (3 اکتوبر 1947ء) کر کے اس کے چاروں صوبوں کے مابین جغرافیائی وحدت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ (29) یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تقسیم

کے وقت ریاست بہاول پور کی جغرافیائی و دفاعی اہمیت کے پیش نظر امیر آف بہاول پور کو کانگریسی قیادت کی طرف سے اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی ہر ممکنہ پیش کش کی گئی تھی، ہمگر آپ نے ہر ترغیب و تحریص کو ٹھکراتے ہوئے ایک مضبوط اور مستحکم پاکستان کی بنیاد کو استوار کرنے میں مدد فراہم کی۔(30) علاوہ ازیں نوزائیدہ مملکت پاکستان کو معاشی مسائل سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے ہر قسم کی معاونت کی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وسیع تر قومی مفاد کے لیے ایثار و قربانی کا یہ جذبہ انہیں ورثے میں ملا تھا، جس کی آبیاری وہ علی گڑھ کی بیش بہا امداد کی صورت میں ایک عرصے سے کر رہے تھے۔ اس طرح یہ اعزاز صرف نواب صادق محمد خاں خامس کو حاصل ہے کہ آپ نے علی گڑھ کی امداد کے سلسلے میں اپنے تمام پیشروؤں پر سبقت حاصل کی۔ آپ کی تخت نشینی کے فوری بعد جب دسمبر 1925ء میں علی گڑھ کا وفد ملاقات کے لیے بہاول پور پہنچا تو آپ نے نہ صرف ارکان وفد کی پذیرائی کی بلکہ علی گڑھ کالج کی پر پچاسویں جیوبلی کے انعقاد کے لیے پچیس ہزار روپے مرحمت فرمائے۔(31)

ریاست بہاول پور کو سب سے بڑا اعزاز یہ حاصل ہے کہ اُس کے آخری حکمران نواب صادق محمد خاں خامس نے 3 دسمبر 1930ء کو علی گڑھ کے عمائدین کی خصوصی درخواست پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کی۔(32) اس موقع پر جب آپ 3 دسمبر کی صبح کو بذریعہ اسپیشل ٹرین علی گڑھ پہنچے تو آپ کا استقبال نواب سر راس مسعود جنگ (1889ء تا 1937ء) وائس چانسلر، یونیورسٹی کورٹ کے اراکین، معززمین ضلع اور کالج کے سابق طلباء نے بڑی گرم جوشی سے کیا۔(33) یونیورسٹی کور نے سلامی دی، بینڈ نے ریاست بہاول پور کا قومی گیت بجایا، جب کہ یونیورسٹی کی طرف سے گن کے سترہ فائروں سے سلامی دی گئی۔ نواب صاحب کو ایک شاندار جلوس کے ساتھ اسٹیشن سے لٹن لائبریری لایا گیا۔ اور وہاں سے جلوس کی شکل میں اسٹریچی ہال میں لایا گیا،

جہاں حاضرین نے سرو قد کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ نواب صاحب کے کرسی صدارت پر رونق افروز ہونے کے بعد پرو وائس چانسلر نے یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد نواب صادق محمد خاں خامس تالیوں کی گونج میں صدارتی خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے جو خاصا طویل تھا، تاہم اس کے چیدہ چیدہ نکات تحریر کیے جاتے ہیں:

مسٹر وائس چانسلر، یونیورسٹی کے معزز اراکین اور محترم خواتین وحضرات!

"میں اسے اپنی قدر افزائی سمجھتا ہوں کہ مجھے علی گڑھ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں بحیثیت صدر مدعو کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ عباسیوں کے جلیل المنزلت خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے جن کا عہد عظیم الشان تعلیمی ترقی اور معارف نوازی کے سلسلے میں محتاج بیان نہیں۔۔۔۔ میرے لیے ضروری ہے کہ مسلمانان ہند کے اس مرکزی دارالعلوم کی ترقی میں گہری دلچسپی لوں۔۔۔۔۔ یہ قدرت کا ایک کرشمہ تھا کہ مسلمانان ہند میں سرسید احمد خاں جیسے دل ودماغ کا ایک شخص پیدا ہوگیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ اس افسوسناک صورت حال کا جس میں اُن کے برادرانِ ملت مبتلا ہیں واحد علاج یہ ہے کہ ایک نظام تعلیم مرتب کیا جائے جو انہیں نہ صرف سیاسی اعتبار سے باخبر اور اقتصادی پہلو سے مضبوط بنا دے بلکہ وہ انہیں اس قابل بھی کر دے کہ وہ اپنے مذہب وتمدن کے تاریخی خزانے محفوظ رکھ سکیں"..

اپنے خطبہ کے دوران آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر راس مسعود صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

قوم کی غیر معمولی خوش قسمتی ہے کہ یونیورسٹی کے معاملات کی باگ آپ کے سپرد کی گئی ہے۔ مجھے کامل اعتماد ہے کہ آپ مسلم ہند کی اس نسل کے لیے اپنے آباؤاجداد کے اعلیٰ نصب امین کے قابل ستائش مظہر ثابت ہوں گے مجھے امید ہے کہ آپ کی قیادت اور رہنمائی میں یہ یونیورسٹی ایسی عظمت

اور شان حاصل کرے گی کہ اس سے زمانہ حاضرہ کی تمام ضروریات ... پوری ہوجائیں گی اور تعلیم نسواں پر بھی معقول توجہ مبذول کی جائے گی۔ آخر میں امیر آف بہاول پور نے یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلباء کو نصیحت کی کہ:

لازم ہے کہ آپ کو دنیاوی مشاغل کے ساتھ ساتھ صداقت اور محاسن کی جستجو جو قوم کی روح رواں ہیں کو ترک نہیں کر دینی چاہیے۔ یہ دار العلوم آپ کو ایسے وقت دُنیا میں بھیج رہا ہے جب کہ آپ کے ملک میں اہم ترین انقلاب ہو۔ یہ زیادہ تر آپ پر منحصر ہے کہ یہ انقلاب ترقی، ذہنی آزادی اور ملک کی معاشرتی اور اقتصادی نشو و نما کا موجب بنے اور افتراق و انشقاق اور زوال کا باعث ثابت نہ ہو... آپ کا دار العلوم آپ سے توقع رکھتا ہے کہ آپ آپنے فرائض قابلیت اور انہماک سے سر انجام دیں میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ ہر معاملہ میں اپنی صحیح قوت فیصلہ سے کام لیں گے.... اور ہر معاملہ کو ضبط اور نظام کے ساتھ حل کرنے میں کوتاہی نہ کریں گئے۔(34)

نواب صادق محمد خاں خاص کے اس خطبہ کے بعد نواب مسعود جنگ بہادر نے آپ کی طرف سے ایک لاکھ روپے کے عطیہ کا اعلان کیا اور اس گرانقدر امداد کا مسلم یونیورسٹی اور حاضرین کی طرف سے شکریہ ادا کیا، جس کے بعد تقسیم اسناد کی کارروائی ختم ہوئی۔(35)

اس روز تین دسمبر 1930ء کو ہی ساڑھے تین بجے سہ پہر نواب آف بہاول پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی ہمراہی میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر واقع ”سلطان جہاں منزل“ تشریف لائے۔ اس موقع پر صوبہ یوپی کی مجلس قانون ساز کے رکن خان بہادر مولوی عبید الرحمن خاں نے آپ کی خدمت میں ایک طویل سپاس نامہ پیش کیا، جس میں امیر آف بہاول پور کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور کانفرنس کے مقاصد، اُس کی ضروریات اور مختلف شخصیات کی طرف سے ملنے والی امداد کا تذکرہ کیا اور نواب صاحب سے مالی اعانت کی درخواست کی۔ کانفرنس کے انقام پر

ریاست بہاول پور کی سابقہ کونسل آف ریجنسی کے صدر مولوی سر رحیم بخش نے نواب صاحب کی خدمت میں ایڈریس ایک کاسکیٹ میں پیش کیا۔ اس کے بعد کانفرنس کی تمام مطبوعات مجلد صورت میں ایک کشتی میں رکھ کر پیش کی گئیں۔ سپاس نامہ کے جواب میں ہز ہائی نس نے جوابی خطبہ دیا اور اس شاندار خیر مقدم پر کانفرنس کے غریب طلباء کو تعلیمی وظائف دینے والی " انجمن الغرض " (The Duty Society) کو ایک ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی علی گڑھ میں نواب صادق محمد خاں خامس کی صدارت میں منعقد ہونے والی یادگار تقاریب اختتام پذیر ہوئیں۔(36)
نواب صادق محمد خاں خاس کے دور میں علی گڑھ کو سالانہ چندے کے علاوہ وقتاً فوقتاً بھی خطیر امداد فراہم کی جاتی رہی۔ ان قابل قدر خدمات کے اعتراف میں 29 ستمبر 1939ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا چار رکنی وفد جو ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان وائس چانسلر ڈاکٹر اے۔ بی علیم پرو وائس چانسلر، خان بہادر عبید الرحمن شروانی اور عظمت الہی زبیری پر مشتمل تھا۔ بہاول پور پہنچا۔ اسی روز قبل از دوپہر صادق گڑھ پیلس کے دربار ہال میں نواب صاحب کو ایل۔ ایل۔ ڈی (Doctor of Laws) کی اعزازی ڈگری پیش کرنے کی تقریب منعقد ہوئی۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ڈگری پیش کرنے کے بعد ایک تقریر کی، جس میں خاندان بنو عباس کی علمی سرپرستی کا تذکرہ کرتے ہوئے نواب صادق محمد خاں خامس کی طرف سے مسلم یونیورسٹی کو عطا کی جانے والی شاہانہ امداد کا اعتراف کیا۔ نواب صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں ڈگری کی پیش کش کو مسرت کے ساتھ قبول فرمایا اور مسلم یونیورسٹی کو ہمیشہ اپنی سرپرستی کا یقین دلایا۔ آپ نے اس تقریب کے بعد علی گڑھ کے معزز وفد کو اپنی ہمراہی میں لنچ دیا، جس میں جملہ وزرائے ریاست نے بھی شرکت کی۔ لنچ کے بعد وفد کے ارکان کو پولیٹیکل سیکرٹری کی معیت میں اسٹیشن بغداد الجدید بہاول پور روانہ کیا گیا جہاں سے وفد بذریعہ ٹرین شام چھ بجے دہلی کے لئے روانہ ہوا۔(37) یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ اعزاز

صرف ریاست بہاول پور کے آخری حکمران کو ہی حاصل ہے کہ انہیں علی گڑھ سے پیشتر پنجاب یونیورسٹی کے وفد نے بھی خود صادق گڑھ پیلس (امیر آف بہاول پور کی رہائش گاہ پہنچ کر ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری 25 مارچ 1934ء کو پیش کی تھی۔ (38) اس طرح وہ پہلے نواب ہیں جنہیں برصغیر پاک وہند کی دو بڑی یونیورسٹیوں کی طرف سے اس اعلیٰ اعزاز سے نوازا گیا۔

یہی نہیں بلکہ نواب بہاول پور علی گڑھ یونیورسٹی کے ہم عصر عمائدین سے ذاتی مراسم رکھتے تھے اور انہیں اہم نجی تقاریب پر مدعو کیا جاتا تھا۔ مثلاً مارچ 1945ء میں ولی عہد عباس عباس (1924ء تا 1988ء) بعد ازاں امیر آف بہاول پور اور سابق گورنر پنجاب کی شادی کی تقریب پر علی گڑھ سے لیفٹنٹ کرنل سر ضیاء الدین احمد (1877ء تا 1948ء) اور سر سید رضا علی کو خصوصیت سے مدعو کیا گیا اور یہ دونوں معززین 22 مارچ 1945 کو اس تقریب میں شرکت کے لیے بہاول پور پہنچے۔ (39) یہی نہیں بلکہ نواب مرحوم نے علی گڑھ کے تحت قائم ہونے والے ہر ادارے کی معاونت کو اپنا شعار بنایا۔ حتیٰ کہ 1945ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے آئنلنک ملٹری انسٹی ٹیوٹ کو بھی دس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ (40) انہی گہرے مراسم کی بناء پر ہر آزمائش کے وقت علی گڑھ کے اکابرین ریاست بہاول پور سے رجوع کرتے تھے۔ اس قسم کی ایک پریشانی 1945ء میں اُس وقت پیش آئی جب ہندوستان میں عموماً اور صوبہ یو۔ پی میں خصوصاً غلہ کی قلت سے قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی اس کے پس پشت در اصل دوسری جنگ عظیم کے اثرات تھے۔ اس صورت حال میں علی گڑھ کو اپنے طلباء اور اساتذہ کی غذائی ضرورت پوری کرنے کے لیے انتہائی دشواری کا سامنا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین نے وزیر اعظم ریاست بہاول پور آر۔ ایم۔ کرافٹن) تقرر 1942ء) کو ایک ہزار من گندم کی فراہمی کے لیے 6 مارچ 1945ء کو ایک خط

روانہ کیا۔ چنانچہ اس کے جواب میں فوری طور پر 13 مارچ 1945ء کو ایک کوآپریٹو سوسائیٹی کے توسط سے صادق آباد سے بذریعہ ٹرین ایک ہزار من گندم روانہ کر دی گئی۔(41)

علی گڑھ سے ریاست بہاول پور کے تعلقات صرف یہیں تک محدود نہ تھے بلکہ متعدد بار ریاست کی اعلیٰ ملازمتوں پر علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل حضرات کو تعینات کیا گیا۔ خود بہاول پور کی وزارت تعلیم کے منصب پر نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں کرنل مقبول حسن قریشی (1898ء تا 1987ء) تعینات رہے جنھوں نے علی گڑھ سے ایم۔ اے ایل ایل بی کیا تھا۔(42)

علی گڑھ سے تعلق قائم رکھنے کے لیے وہ ایک عرصہ تک وہاں کی کنٹین کا ٹھیکہ بھی لیتے رہے جسے وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے سے چلاتے تھے۔ اس طرح نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں علی گڑھ اور بہاول پور کے مابین تعلیمی روابط اس طرح بڑھے کہ ریاست بہاول پور کے قدیم تعلیمی ادارہ صادق ایجرٹن کالج (قائم کردہ 1886ء) میں ایک تسلسل کے ساتھ علی گڑھ کے گریجوئیٹس اور سابق اساتذہ کو پروفیسرز اور پرپل مقرر کیا جاتا رہا۔(43) ان شخصیات کا فرداً فرداً ذکر علیحدہ موضوع کا متقاضی ہے جن کے تجربہ علمی سے جہاں ایک طرف اس خطے کے عوام نے اپنی تشنگی بجھائی وہاں دوسری طرف ان کے وجود مسعود کی بدولت اعلیٰ انسانی اقدار اور تہذیبی روایات کو فروغ ملا۔ یہی نہیں بلکہ علی گڑھ سے وابستہ علمی روابط کی پاسداری کے لیے وہاں کی شخصیات کو ایس ای کالج میں توسیعی لیکچرز دینے اور سالانہ جلسہ ہائے تقسیم اسناد (convocations) کے مواقع پر خطبات پیش کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ مثلاً 1943ء اور دوبارہ 1945ء کے دوران ڈاکٹر ضیاء الدین نے اپنے خطبات پیش کیے۔ جب کہ 1944ء میں ڈاکٹر ہادی حسن نے خطاب کیا۔(44)

ریاست بہاول پور اپنے تعلیمی نظام کے لیے شروع سے ہی علی گڑھ کو قابل تقلید سمجھتی تھی حتیٰ کہ قیام پاکستان کے کافی عرصہ بعد تک بہاول پور اایس ای کالج کے لیے مسلم یونورسٹی علی گڑھ کے نظام

کو ہی معیار تصور کیا جاتا تھا۔ طلباء کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کی طرح یونیفارم مقرر تھی۔ طلباء کی عمومی اور انفرادی نگرانی کے لیے "Proctorial and Intorial System" رائج تھا۔ نیز فوجی تربیت، ہر طالب علم کے لیے کھیلوں میں شرکت اور نماز کی ادائیگی لازمی تھی۔ علاوہ ازیں علی گڑھ کی طرز پر مباحثہ بات اور تعلیمی کانفرنسوں کا انعقاد باقاعدگی سے ہوتا تھا۔(45)

ریاست بہاول پور اور اُس کے عوام کا تحریک علی گڑھ اور اُس کے اداروں سے وابستگی کا سلسلہ قیام پاکستان تک قائم رہا۔ حتی کہ مارچ 1947ء میں آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کا انعقاد حکومتی سرپرستی میں دار الحکومت بہاول پور میں عمل میں آیا۔ اس ضمن میں ریاست کے محکمہ اطلاعات کی طرف سے 13 فروری 1947ء کو ایک اشتہار کے ذریعے مقالہ جات ارسال کرنے کی اطلاع دی گئی۔ کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالہ جات کے لیے ہدایت تھی کہ وہ خصوصیت سے خواتین کی تعلیم وصحت، علمی، ادبی، تاریخی، فنی اور اقتصادی عنوانات سے متعلق ہوں۔ نیز کانفرنس کے موقع پر قلمی مخطوطات، نوادرات، مصنوعات اور ایجادات کی نمائش کا اہتمام بھی تھا۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی، اس کے صدر میجر شش الدین محمد (متوفی 1968) وزیر تعلیم تھے اور اراکین میں ایس ای کالج کے پروفیسر معین الدین حسن قریشی (علیگ)(1939, 1954ء) اور پروفیسر ڈاکٹر شجاع الدین ناموس (1927ء1950) شامل تھے۔ (46) واضح ہو کہ نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو بارہ سو روپے سالانہ کی امداد بھی قیام پاکستان تک دی جاتی رہی۔ (47) ریاست بہاول پور اور اس کے عوام کی اس والہانہ وابستگی اور خدمات کے اعتراف میں علی گڑھ کے تمام تعلیمی شعبہ جات میں ریاستی طلباء کے لیے نشستیں مختص تھیں۔ جن پر ہر سال اہل طلباء کو نامزد کر کے وظائف پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بھیجا جاتا تھا۔(48) یہ سلسلہ قیام پاکستان تک جاری رہا۔ ریاست بہاول پور کے متحد

وطلب علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہوئے۔یہی وہ طلباء تھے جنہوں نے بعد ازاں ریاست میں جمیعت المسلمین "کے نام سے مسلم لیگ کی شاخ قائم کی اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ کیا ۔(49)یہی وجہ ہے کہ ریاست میں کانگریس اپنی تمام تر ریشہ دوانیوں کے باوجود ریاستی عوام میں کوئی رسوخ حاصل نہ کر سکی۔ نتیجتاً برصغیر پاک وہند کی تقسیم کے ساتھ ہی ریاست بہاول پور کے آخری نواب صادق محمد خاں خامس عباسی نے عوامی تائید وحمایت سے بلا پس وپیش پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔

حوالہ جات و تعلیقات

1-مثلاً پنجاب کے ایک عالم حفظ الاسلام (متولی 1802ء) کا خاندان ریاست کے آخری دور تک علمی و دینی خدمات پر مامور رہا۔ اس طرح مغلیہ خاندان کے مرزا محمد اشرف گور گانی (1865ء تا 1922ء) ایس۔ای۔ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ جب کہ مولوی خلیل احمد سہارن پوری (1852ء 1927ء) 1889ء تک بہاول پور کے پہلے مدرسہ عربیہ اور ایس ای کالج کے شعبہ علوم اسلامیہ کے مہتمم رہے تفہ تفصیل کے لیے دیکھیے:

(i) مولوی محمد اعظم، جواہر عباسیہ (فارسی مخطوطہ)، قلعہ ڈیراور، 1838ء۔

(ii) مرزا محمد اشرف گور گانی و مولوی محمد دین، صادق التواریخ، بہاول پور، 1899ء، ص 1۔

(iii) محمد عاشق الہی و مولنا میں تھی، تذکرۃ الخلیل، کراچی ہن ندارد، ص 125۔

2-حکومت بہاول پور، صادق الاخبار، 26 فروری 1870ء مطبع صادق الانوار پریس، بہاول پور، ص 2۔

3۔صادق الاخبار، یکم تمبر 1887ء، ص 4۔

4۔صادق الاخبار، 8 جون 1882ء ص 4۔

5۔ریاست بہاول پور کے تعلیمی اداروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے:

ڈاکٹر محمد طاہر، ریاست بہاول پور کا نظم مملکت (1866ء تا 1947ء)، بزم ثقافت ملتان، 2010، صفحات 511-638

6۔صادق الاخبار، 25 ستمبر 1871ء، ص 3۔

7۔سید نواز شاہ گردیزی، رپورٹ سررویہ تعلیم 99-1898ء، غیر مطبوعہ، دفتر دستاویزات بہاول پور ص ص 8-9-

8-صادق الاخبار،2اکتوبر1884ء، ص5۔

9-صادق الاخبار،13مارچ1884ء ص6۔

10-صادق الاخبار،20اپریل1882ء، ص ص5-6-

11-پروفیسر منور علی خاں، ایس ای کالج کے سو سال(1886ء1986ء)، بہاول پور، 1986، صص19-20

12-ریاست بہاول پور کا قلم مملکت ہیں539۔

13۔ کو چادر گھاٹ باغ حیدر آباد میں اسلامیہ نظام حیدر آباد نے کیا۔23اپریل1885وصادق الاخبار7مئی ۱۸۸۵ص ۷

The Bahawalpur Government, The AdministrationReport of

Bahawalpur, 1902, p. 11. 14Bahawalpur Sate 1901-02,

15۔ محمد عزیز الرحمن، حیات محمد بہاول خاں خاص،1939ء، بہاول پور ص103۔

16۔نواب محمد بہاول خاں خامس نے18 ستمبر1905ء کو کالج اور اس کے ہاسٹل کی تعمیر کی منظوری دی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: حیات محمد بہاول خاں خامس ص149۔

The Administration Report of Bahawalpur State -17 1905-06, p. 8.

The Bahawalpur Government, The Chief Events of -18

Bahawalpur State, for the year ending 31st March 1918, M.S.

Preserved in Bahawalpur Archieves, p. 9. Nazeer Ali, Sadiq

Namah, 1966, Lahore, p. 72. -19

20۔ مولانا شوکت علی نے یہ خط سر آغا خاں کے سیکریڑی کی حیثیت سے تحریر کیا۔ خط کے

مندرجات کے لیے دیکھیے:

Bahawalpur Archieves, File Consisting of Ninety One -21 Important Letters In English, Letter No. 31, Dated 26 January 1911.

File Consisting of Ninety One Important Letters in English, Letter No. 32, Dated 7 March 1911. 1911 مارچ 2 صادق الاخبار، 2 ہیں

File Consisting of Ninety One Important Letters in -23 English, Letter No. 33, Dated 7 March 1911. File Consisting of Ninety One Important Letters in

English Letter No. 34, Dated 9 March 1911

25- محمد عزیز الرحمن، رنج صادق، 1937ء، پالم پور ص 78۔ File Consisting of

Ninety One Important Letters in -26 English, Letter No. 56, Dated 18 February 1912

27۔ دفتر دستاویزات بہاول پور، فائل مشمولہ اہم اُردو خطوطہ، خط نمبر 7، مورخہ 23 فروری 1912 ء۔

28۔ فائل مشمولہ اہم اردو خطوط، خط نمبر 8، مورخہ 23 فروری 1912ء۔

29۔ سید نذیر علی شاہ، صادق نامہ، اردو ترجمہ صدیق طاہر، لاہور، 1973ء ص 95۔30

30۔ کانگریسی قیادت نے اس سلسلے میں ریاست بہاول پور کے وزیر اعظم نواب مشتاق احمد گورمانی (1947-1948)ء) اور امیر آف بہاول پور کے بہنوئی اور چچازاد بھائی کرنل معتصم یا اللہ عباسی

(1914 تا 1991ء) کے توسط سے نواب صادق محمد خاں خاص کو اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی صورت میں کئی مراعات کی یقین دہانی کرائی تھی۔ خود جواہر لال نہرو (1989ء تا 1964ء) نے لندن میں اور ان کی بہن وجے لکشمی نے صادق گڑھ پیلس میں امیر آف بہاول پور کو اس سلسلہ میں آمادہ کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے محمد طاہر خطہ بہاول پور ۔ایک تاریخ، ایک سر گزشت، ازبیر سہ ماہی، اردو اکیڈمی بہاول پور، 2001، ص ص90-91-

31۔ جج صادق، ص79۔

32-صادق الاخبار، 11 دسمبر 1930ء ص1۔

33-صادق الاخبار، 18 دسمبر 1930ء ص1۔

34-علی گڑھ یونیورسٹی کے 1930ء کے کانووکیشن کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مولوی محمد دین، میونسیل گزٹ لاہور کا صادق نمبر،

لاہور، 1930 صفحات7460

35-صادق الاخبار، 18 دسمبر 1930ء، ص1 –

36-میونسپل گزٹ لاہور کا صادق نمبر، ص74۔

37-صادق الاخبار 5 اکتوبر 1939ء میں6۔

38-صادق الاخبار، یکم مارچ 1934ء، ص8

39-صادق الاخبار، 29مارچ 1945ء، ص4۔

The Administration Report of Bahawalpur State -40

1901-02, p. 11..

41 -فائل مشمولہ اہم اردو خطوط، خط نمبر 85، 6مارچ 1945ء۔

42۔ میونسپل گزٹ لاہور کا صادق نمبر ص118۔

43۔ ایس۔ اسی کالج بہاول پور میں خدمات انجام دینے والے پروفیسرز اور پرنسپلز جولی گڑھ یو نیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے یا وہ علی گڑھ کے ادارے میں بطور اساتذہ خدمات سر انجام دے چکے تھے کی

فہرست درج ذیل ہے:

1۔ پرنسپل مشتاق احمد زاہدی (عرصہ تعیناتی1922ء تا1935ء)۔

2۔ پروفیسر پیرزادہ عبد الرشید(1942ء1949ء) سابق پروفیسر انگریزی علی گڑھ یونیورسٹی

3۔ پروفیسر انعام اللہ خان سابق پروفیسر انگریزی علی گڑھ یونیورسٹی۔ پرنسپل مسٹر ائی،ہی۔ڈکٹسن (1950 1951ء) سابق پروفیسر انگریزی علی گڑھ یونیورسٹی۔

4۔ پرنسپل جی۔ ایم۔ دین مرزا (عرصہ تعیناتی 1971ء)

5۔ پرنسپل سید عصمت علی شاہ (1971ء تا1972ء)۔

6۔ پرنسیل منور علی خان شعبہ تاریخ (1972ء تا1979ء) آپ کی پیدائش بھی ضلع علی گڑھ میں ہوئی۔

8۔ پروفیسر و پرنسپل سید اشرف علی شاہ شعبہ جغرافیہ (1954 1969ء،1979ء)

9۔ پروفیسر و پرنسپل غفر اللہ خاں (1952 1990 t ,ء) علی گڑھ پولی ٹیکنیک کے سابق لیکچرار فزکس۔

10۔ پروفیسر اقبال صدیق پروفیسر فزکس و کیمسٹری (ء1927, تا1959ء)

11۔ پروفیسر محمد انوار الحسن پروفیسر معاشیات (1926ء تا1953ء)

12۔ پروفیسر محمد نصیر انصاری (1968, 1944ء)

13۔ پروفیسر رفیق علی خاں شعبہ انگریزی(1950 تا1977ء)

14۔ پروفیسر توقیر احمد صاحب شعبہ فزکس(1959 1978ء)

15۔سید رحمت اللہ شاہ شعبہ عربی(1950ء تا1971ء)

16۔ پروفیسر معین الدین حسن قریشی شعبہ انگریزی(1939 تا1943ء)

17۔ پروفیسر ڈاکٹر ایس۔ محمد ساجد شعبہ ریاضی(1940-1955ء)

18۔روفیسر مولوی محمد دین(تعیناتی1899ء)ان حضرات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر منور علی خاں، ایس ای کالج کے سو سال صفحات84 تا95۔

19- The Administration Report of Bahawalpur State

20- The Administration Report of Bahawalpur State 1949-50, p. 56.

21-صادق الاخبار گزٹ،13 فروری 1947ء، ص2۔

22۔ میونسپل گزٹ لاہور کا صادق نمبر میں 55۔

23۔صادق الاخبار گزٹ،12 اپریل 1945ء، ص5۔

24۔ریاست بہاول پور میں جمعیت المسلمین کے نام سے مسلم لیگ کے قیام کی تفصیلات اور تحریک پاکستان میں مقامی باشندوں کی جدوجہد کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: مسعود حسن شہاب، بہاول پور کی سیاسی تاریخ، اردو اکیڈمی بہاول پور، 1977ء۔

نواب صادق محمد خان خامس اور قائد اعظم کے باہمی تعلقات کا جائزہ

بر صغیر پاک و ہند کے جن خطوں کو مذہب اسلام نے اپنی اثر پذیری اور قدامت کے لحاظ سے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان میں بہاول پور کا شمار سر فہرست ہے۔ چاہے باب سندھ کے راستے محمد بن قاسم (۷۱۲ – ۷۱۵) کی آمد ہو یا وسط ایشیا کے راستے مسلم فاتحین اور مشائخ کرام کا ورود، ہر دور میں خطہ ءبہاولپور کو مذہب اسلام کی ترویج واشاعت کے اعتبار سے مرکزیت حاصل رہی۔ خصوصاً شہاب الدین غوری(۱۱۷۳ – ۱۲۰۲ء) کے غلام ناصر الدین قباچہ (۱۲۰۲ – ۱۲۲۸ء) کے عہد حکومت میں اس کے دارالحکومت اوچ کو اپنی مذہبی علمی و ثقافتی اہمیت کے لحاظ سے " عروس بلاد اسلامیہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس دور کے عصری ماخذات اس بات ہو۔ کے واضح شواہد پیش کرتے ہیں کہ اگر ایک طرف ہند میں مسلم بادشاہت کا پہلا مرکز موجود و پاکستانی علاقے پر مشتمل سندھ کے دارالحکومت اوچ کو ناصر الدین قباچہ کے زیر انتظام یہی حیثیت حاصل کے پہلے تھی۔(۱) انہی دیر پا اسلامی اثرات کے نقوش نے مغل حکومت کے زوال کے بعد اس خطے میں خانوادہ آل عباس(۲) کے پر جانی داؤد پوتروں کے زیر انتظام ۱۷۲۷ء میں بہاول پور کی اسلامی ریاست کو جنم دیا ۔(۳) اس طرح قیام پاکستان سے کم و بیش سوا دو سو سال پہلے ہی اس خطے میں ایک " پاکستان صغیر " کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ یہ اسلامی مملکت خداداد بہاول پور بہر صورت انگریزی استعمار کے دور میں بھی اپنے تمام تر قدیم اسلامی تشخص اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے منفرد اور اندرونی نظم و نسق کے اعتبار سے خود مختار رہی۔یہی وہ اسلامی روایات تھیں جن کے سبب اس خطے کے عوام اور اور نواب نے قائد کے ساتھ اپنے تعلق کو قائم کیا اور اسے نبھایا۔ضرورت اس امر کی ہے ان تعلقات کو اجاگر کیا جائے جو قصہ پارینہ ہو چکے ہیں اور جنہیں صحیح طور سے تاریخ کے اوراق پر ثبت نہیں کیا جا سکا تا کہ تحریک پاکستان کے اصل گوشے بے نقاب ہو سکیں۔

قائد اعظم اور مسلم لیگ سے بہاول پور کے تعلق کے غیر محسوس شواہد اس وقت نظر آتے ہیں جب ریاست بہاول پور کے باشعور تعلیم یافتہ افراد نے ۱۹۲۵ء میں جمعیت مسلمین(۴) اور ۱۹۳۲ء میں انجمن خدام الدین(۵) کے نام سے دو جماعتیں قائم کیں۔ در حقیقت میں دونوں جماعتیں آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے لیڈر قائد اعظم کی سیاسی تحریک سے متاثر ہو کر قائم کی گئی تھیں۔ لیکن چونکہ ریاست میں سیاسی جماعتوں کے قیام پر مکمل پابندی تھی۔ اس لئے ان جماعتوں نے ابتدا آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرز پر رہائشی مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشرتی بہبود کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن جلد ہی ان کے پلیٹ فارم سے عوامی حقوق اور ذمہ دارانہ نظام حکومت کی تشکیل جیسے مطالبات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ حتی کہ ۱۹۴۰ء تک جمعیت المسلمین ایک خالصتاً سیاسی جماعت کا روپ دھار چکی تھی۔ یہاں پر یہ بات واضح ہو کہ ۱۹۴۰ء کی قرار داد لاہور نے بہاول پور کے سیاسی شعور کے حامل افراد کو خصوصیت سے متاثر کیا تھا۔ وہ قائد اعظم کی مسحور کن شخصیت سے بہت متاثر تھے جنہوں نے بر صغیر کے عوام کو انگریزوں سے آزادی اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا مطالبہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرارداد پاکستان کے بعد بر صغیر کے دیگر علاقوں کی طرح ریاست بہاول پور میں بھی خالصتا مسلم لیگی رجحانات کے حامل نوجوانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ان میں زیادہ تر ایس ای کالج بہاول پور کے فارغ التحصیل اور زیر تعلیم طلبا تھے جو تحریک علی گڑھ سے متاثر تھے۔ یہ لوگ جمعیت لمسلمین سے وابستہ تھے۔ ان نوجوانوں کی کوششوں سے جمعیت المسلمین کا منشور مسلم لیگ کے منشور سے قریب تر کر دا گیا۔ اس طرح ریاست کی یہ جماعت اب خالصتاً آل انڈیا مسلم لیگ کے خیالات کی ترجمان بن چکی تھی اور اس کے کارکن قائد اعظم کے افکار وخیالات کے حامی تھے۔ (۲) لیکن ریاست میں سیاسی جماعتوں کے قیام کی ممانعت ان کی راہ میں حائل تھی۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے یہ اختراع کی گئی کہ جمعیت المسلمین کے ساتھ بریکٹ میں مسلم لیگ لکھا جانے لگا

۔ اس پر جب ریاست کی حکومت کی طرف سے باز پرس کی گئی تو وضاحت کی گئی کہ جمعیت مسلمین کا انگریزی ترجمہ مسلم لیگ اور قانو نا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کی کوئی ممانعت نہیں۔ اس پر حکومت بہاول پور نے جمعیت المسلمین کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی ۔ (۷) شہاب دہلوی (۱۹۲۲-۱۹۹۰ء) اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اس دور میں بہاول پور کی عام سیاسی زندگی پر مسلم لیگی سیاست کی چاپ خاصی نمایاں تھی۔ مسلم لیگی ذہن کے لوگوں نے جن ناموں سے یہاں سیاسی سرگرمیاں جاری کی ہوئی تھیں، ان سے ریاست کی حکومت ناواقف تھی۔ اگر مسلم لیگ کے لئے ریاستی حکومت کے دل میں جگہ نہ ہوتی تو ان سرگرمیوں کو جاری رکھنا خاصا دشوار ہوتا۔ (۸) یا میر آف بہاول پور کے قائد اعظم سے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات ہی تھے جن کے سبب حکومت بہاول پور نے جمعیت المسلمین (مسلم لیگ) کے سیاسی اقدامات پر چشم پوشی کی حالانکہ اس سے پیشتر حکومت بہاول پور جمعیت المسلمین کے برعکس ریاستی ہندوؤں کی طرف سے کانگرلیس اور ہندو سبھا کی خفیہ سرگرمیوں کا سختی سے نوٹس لے چکی تھی۔(۹) ریاستی حکومت کے اس جانبدارانہ رویے سے حوصلہ پاکر جمعیت المسلمین کے ارکان نے ریاست بہاول پور میں آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی شاخ کھولنے اور اس سے اپنی جماعت کا الحاق کرنے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ اس سلسلے میں نواب بہادر یار جنگ اور محمود الحسن صدر و سیکرٹری آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ سے خط و کتابت شروع کر دی۔ ان متواتر کوششوں کے نتیجے میں ریاست بہاول پور سے عبد الحمید خاکوانی ایڈووکیٹ اور انوار لرب گلزار کر میں آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے نمائندے تو مقرر کر لے گئے لیکن قائد اعظم کی زیر تربیت مسلم لیگی قیادت نے یہاں کے مسلم لیگی حامیوں کو ہدایت کی کہ وہ اس سلسلہ میں ریاست کے وزیر اعظم سے مذاکرات کریں اور حکومت سے الجھنے کی بجائے مسلمانوں کی تنظیم کو ایک مرکز پر مجتمع کریں ۔ (۱۰) لیکن اس ناکامی کے باوجود ریاست

میں لیگی نظریات کے حامل پیرزادہ سلیم اسلم (۱۹۱۰ء - ۱۹۶۷ء) اور سلطان عبد الحمید (۱۹۰۸ء - ۱۹۵۱ء) نے بہاول پور میں ”مسلم بورڈ“ کے نام سے ایک جماعت قائم کر ڈالی اور اسے مسلم لیگ میں تبدیل کرنے کے لئے ریاستی حکومت سے درخواست کی لیکن اجازت نہ ملنے پر براہ راست ۱۲ نومبر ۱۹۴۲ء کو قائد اعظم کو ایک طویل خط بذریعہ رجسٹری روانہ کیا۔ اس کا لب لباب یہ تھا:-

> ”ریاستی مسلمانوں نے مجبوراً بہاولپور اسٹیٹ مسلم بورڈ
> کے نام سے ایک جماعت تشکیل کی ہے جو خالصتاً
> مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام پر عمل پیرا ہے اور
> اس کی ریاست بھر میں شاخیں قائم ہو رہی ہیں لیکن
> ریاستی حکومت انہیں اس کی اجازت نہیں دے رہی
> چنانچہ اکثر حضرات کی یہ رائے ہے کہ حکومت کی
> منظوری کے بغیر نام کی تبدیلی کر لی جائے۔ اس
> سلسلہ میں آپ کی ہدایت کی ضرورت ہے۔ مزید یہ
> کہ ریاست بہاول پور کے مسلم عوام کی خواہش ہے
> کہ آپ (قائد اعظم) بذات خود ریاستی مسلمانوں کے
> نام کوئی پیغام ارسال فرمائیں۔“

قائد اعظم نے، جو ہمیشہ غیر آئینی و غیر قانونی اقدامات کے مخالف رہے تھے نے یہ خط خود وصول کیا اور اس کے جواب میں سیکرٹری مسلم بورڈ کے نام مختصر تار ارسال کیا کہ:۔

"حکومت بہاول پور سے دوستانہ فضاء میں گفت و شنید
کریں ۔ آپ کی کامیابی کا خواہاں ، ایم اے
جناح"۔(۱۱)

درج بالا واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ریاست بہاول پور میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باوجود یہاں کے عوام نے قائداعظم اور مسلم لیگ سے اپنے تعلق کو خوب نبھایا۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ ریاستی مسلمان، قائد اور لیگ سے فکری و نظریاتی ہم آہنگی رکھتے تھے اور یہاں کی مسلم اکثریت کسی طرح بھی انگریزی استعمار کے تسلط سے آزادی کی جنگ میں برصغیر کے دوسرے مسلمانوں سے پیچھے تھی۔ یہی وہ شعوری کوشش تھی جو ریاست میں کانگریسی اثر و نفوذ کے پھیلاؤ میں رکاوٹ کا باعث بنی، یہاں جمہوری روایات نے جنم لیا اور تقسیم کے فوراً بعد ریاست بہاول پور کا الحاق پاکستان سے ممکن ہوا۔

مزید برآں ریاست بہاول پور کے تاریخی گوشے قائد اور یہاں کے مسلم عوام کے مابین باہمی ربط تک ہی محدود نہیں بلکہ ان تعلقات کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار بہاول پور اپنے پیچیدہ قانونی مسائل کو سلجھانے کے لئے قائداعظم کے قانونی مشوروں سے بھی مستفید ہوتا تھا۔ دراصل قائد کی مسلمہ قانونی موشگافیوں کی بناء پر آپ کے ریاست بہاولپور کے باقاعدہ مشیر قانونی (۱۲) ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اس سے پیشتر بھی آپ بمبئی میں ملاحوں کی ایک یونین کے قانونی مشیر رہ چکے تھے (۱۳)۔ یہاں ایک ایسے ہی قانونی مشورے کا ذکر کیا جاتا ہے جو نہ صرف ریاست بہاول پور کی جغرافیائی سالمیت کا سبب بنا بلکہ اس سے قائد کی قانونی مہارت اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اس قانونی مشورے کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ریاست بہاول پور کو اپنے آبپاشی کے عظیم منصوبے "ستلج ویلی پراجیکٹ (۱۹۲۲ء-

۱۹۳۳ء) کی تعمیر کے لئے حکومت برطانیہ سے بارہ کروڑ روپے کا قرض لینا پڑا۔(۱۴) اس کی وجہ سے ریاست بہاول پور شدید معاشی بحران کا شکار تھی۔ اگرچہ قرض کی ادائیگی آئندہ پچاس سال کے دوران ہونا تھی۔ (۱۵) لیکن اس وقت کے ریاست بہاول پور کے وزیر اعظم سر سکندر حیات (۱۹۲۵ء - ۱۹۲۸ء) کے پیش نظر برطانوی خوشنودی کا حصول اصل مقصد تھا۔لہذا انہوں نے امیر آف بہاول پور نواب صادق محمد خان خامس(۱۹۲۴ء-۱۹۲۶ء) کو اعتماد میں لئے بغیر حکومت ہند کو یہ تجویز پیش کی کہ "چونکہ ریاست بہاول پور کے لئے اس قرض کی ادائیگی مشکل نظر آتی ہے لہذا اس کے عوض ریاست کا ایک علاقہ (اس ضلع رحیم یار خان) لے لیا جائے"۔ (۱۲) جب سر سکندر حیات کی اس خفیہ سودے بازی کی خبر امیر آف بہاول پور اور ان کے اتالیق اور ہوم منسٹر مولوی غلام حسین (متوفی ۱۹۴۹ء) کو ہوئی تو انہوں نے اس نازک صورتحال سے بچاؤ کے لئے فوری طور پر قائد اعظم سے رجوع کیا۔ آپ نے اس کے جواب میں یہ مختصر لیکن تاریخ ساز مشورہ دیا کہ:

> "امیر آف بہاول پور کو چونکہ اپنے وزیر اعظم کی
> تعیناتی کا اختیار ہے لہذا قانوناانہیں اس کی برطرفی کا
> اختیار بھی حاصل ہے اس لئے مزید پیچیدگی سے بچنے
> کے لئے وزیر اعظم کو برطرف کر دیا جائے"۔

قائد کا یہ مشورہ اس قدر صائب تھا کہ امیر آف بہاول پور نے اس پر عمل کرتے ہوئے نہ صرف سر سکندر حیات کو وزارت عظمی سے معزول کر دیا بلکہ انہیں فوری طور پر ریاست بدری کے احکامات بھی دے دیئے گئے۔(۱۷)اس طرح جہاں قائد اعظم کا بہاول پور پر یہ عظیم احسان ہے کہ انہوں نے مستقبل میں پاکستان کا حصہ بننے والی اس ریاست کے کم و بیش ایک تہائی جغرافیائی حصہ کو کم

ہونے سے بچا لیضاً وہاں اس سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ کو ریاست بہاول پور کے اندونی نظم ونسق میں کس قدر دخل حاصل تھا۔

دستاویزات بہاولپور کے مطالعے سے اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ریاست بہاولپور کے دوسرے قانونی مشیر بھی مسلم لیگ کے بانی ممبر سر محمد شفیع(۱۸۲۹ء-۱۹۳۲ء) تھے۔(۱۸)دربار بہاول پور سے قائد اور سر شفیع جیسی شخصیات کے تعلق نے ہی دراصل اس خطے کے عوام اور آخری فرمانرواء کے اذہان کو مسلم لیگ کے مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں جو آبیاری کی اس کی بدولت بالآخر ریاست بہاولپور نے مملکت پاکستان سے الحاق کا تاریخ ساز فیصلہ کیا۔

مزید بر آں اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ ایک اسلامی مملکت کے حکمران ہونے کی حیثیت سے نواب صادق محمد خان خامس کا رجحان شروع سے ہی دو قومی نظریے اور اتحاد بین المسلمین کی طرف تھا۔ اس کا اندازہ ۱۹۴۱ء کے آغاز میں وائسرائے ہند کے مشیر امور خارجہ مسٹر الف کیرو کے اس استنفسار سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو اس نے امیر آف بہاول پور سے کیا کہ "اگر پاکستان بنا تو اس صورت میں آپ کا مستقبل کیا ہو گا؟ کیونکہ اگر ہم نے ہندوستان کو خیر باد کہا تو ہمارے اور آپ کے معاہدے ختم ہو جائیں گے۔ اس صورت میں آپ کی پوزیشن کیا ہو گی؟"(۱۹)امیر بہاول پور نے اس موقع پر دوٹوک الفاظ میں وضاحت کی کہ" جب آزادی ہند کا مرحلہ آئے گا تو ظاہر ہے کہ حالات کے مطابق فیصلہ کرنا ہو گا مگر ایک بات بالکل واضح ہے کہ میرا سامنے کا دروازہ پاکستان میں کھلتا ہے اور پچھلا دروازہ راجپوتانہ میں، ریلوے لائن جو ریاست سے گزرتی ہے وہ پاکستان کی شہہ رگ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے قطع نظر ایک شریف آدمی اپنے سامنے کے دروازے سے ہی اپنی آمد و رفت پسند کرتا ہے۔ علاوہ ازیں میری ریاست کی تراسی(۸۳)فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے لہذا مجھے ان کی رائے کا بھی احترام کرنا ہو گا"۔(۲۰)

نواب صادق محمد خان خامس کے اس مدلل جواب سے نہ صرف ان کی سیاسی بصیرت کا علم ہوتا ہے بلکہ اس سے پاکستان کی طرف ان کے واضح میلان کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن قائداعظم اور بہاول پور کے حوالے سے سب سے اہم پہلو امیر آف بہاول پور سے آپ کے دوستانہ مراسم تھے۔ یہ باہمی تعلقات دنیاوی اغراض سے بالاتر محض خلوص و محبت کی بنیادوں پر ااستوار تھے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری قومی تاریخ ان کے ذکر سے خالی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قائد اور نواب صادق محمد خان خامس کے ان دوستانہ تعلقات پر روشنی ڈالی جائے جو بالآخر ریاست بہاول پور کے پاکستان سے الحاق کا سب سے بڑا محرک ثابت ہوئے ۔ قائد اعظم اور امیر آف بہاول پور کے مابین ذاتی نوعیت کے مراسم کا آغاز کب ہوا؟ اس کا درست تعین مشکل ہے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کی بدولت ایک قومی لیڈر کے طور پر قائد کے شخصی وقار میں جو اضافہ ہوا اس نے امیر آف بہاول پور کو آپ کے نزدیک کر دیا۔ خود نواب صاحب کے بہنوئی اور پیچازاد بھائی کرنل معتصم باللہ عباسی (۱۹۱۲ء – ۱۹۹۱ء) کا بیان ہے کہ امیر آف بہاولپور کے ہندوستان کے جن سیاسی لیڈروں سے تعلقات تھے ان میں قائد اعظم کا نام سرفہرست تھا۔ کراچی میں آمد کے موقع پر قائد اعظم ملیر میں نواب بہاول پور کی ذاتی رہائش گاہ میں اکثر و بیشتر قیام فرماتے تھے۔ اس مقصد کے لئے اس رہائش گاہ کا ایک حصہ مکمل طور پر آپ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ قائد اعظم اور امیر آف بہاولپور اپنے قیام کراچی کے دوران جن مخصوص کاروباری مراکز سے ضروریات کا سامان خریدتے تھے وہ صدر، بندر روڈ اور الفنسٹن سٹریٹ میں واقع تھے۔
معتصم باللہ نے اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک روز نواب صاحب کی ہمراہی میں ایک سٹور سے خرید و فروخت میں مشغول تھے تو اس موقع پر مسٹر جناح بھی وہیں تشریف لائے ۔ انہیں ایک سگار کیس کی ضرورت تھی جو سٹور پر دستیاب نہ تھا۔ اتفاق سے ایک رولڈ گولڈ کا سگریٹ کیس

میرے پاس موجود تھا۔ میں نے محبت سے نکال کر آپ کو پیش کیا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا ۔جب میں نے اور نواب صاحب نے اسے قبول کرنے پر اصرار کیا تو آپ نے اسے رکھ لیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب قائد اعظم انگلینڈ سے واپس آئے تو بہاول پور ہاؤس میں اپنی آمد پر آپ نے ایک رولڈ گولڈ کا سگریٹ کیس، ایک سگریٹ ہولڈر اور ایک لائیٹر مجھے لا دکر دیا۔ سگریٹ کیس پر ایم۔ اے جناح کے الفاظ کندہ تھے۔(۲۱)

یہ واقعہ قائد کی اعلی صفات و کردار کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ذاتی حیثیت سے کسی کے مرہون احسان ہونا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اگر کوئی انہیں تحفہ پیش کرتا تو آپ اس سے بڑھ کر تحفہ بدلے میں دے دیتے۔ امیر آف بہاول پور کے وزیر حضوری سعید ہاشمی(۱۹۳۰ء-۱۹۲۲ء)، نواب صادق محمد خان خامس اور قائد اعظم کے ذاتی تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''امیر آف بہاولپور کے آل عباس سے ہونے اور ریاست بہاول پور کی تاریخی و جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر حضرت قائد اعظم آپ سے مخلصانہ محبت تعلق رکھتے تھے۔ قائد اعظم نے از راہ شفقت چند مرتبہ دہلی میں امیر آف بہاول پور سے ان کے متنقفر پر قدم رنجہ فرما کر چائے نوش فرمائی اور بہت دیر تک سیاسی امور پر اظہار رائے فرماتے رہے اور نصائح متفرقہ سے بہرہ اندوز اکرتے رہے''۔

وہ مزید تحریر کرتے ہیں کہ:-

"اس قسم کی دلچسپ اور تاریخی صحبتیں سیاسی اور
اقتصادی امور پر ہے مباحث کراچی اور دہلی میں
گھنٹوں رہتے تھے۔" (۲۲)

بالآخر امیر آف بہاول پور اور قائداعظم کے ان باہمی روابط نے ۱۹۴۵ء سے ذاتی مراسم اور دوستی کی صورت اختیار کرلی۔ جس نے بالآخر تحریک پاکستان کے سلسلے میں ریاست بہاولپور کی طرف سے گرانقدر مالی، اخلاقی اور سیاسی تعاون کی بنیاد فراہم کی۔ بریگیڈئر نذیر علی شاہ (۱۸۹۵ء-۱۹۸۴ء) جونواب صادق محمد خان خامس کے اے ڈی سی بھی رہے ۱۹۴۵ء کے دوران دہلی میں امیر آف بہاول پور اور قائداعظم کے مابین ہونے والی ملاقات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک ایسے وقت میں جب کہ تحریک پاکستان اپنے
پورے شباب پر تھی، نواب صاحب کا قائداعظم سے
ملنا خالی از علت نہ تھا۔" (۲۳)

جہاں تک ریاست بہاول پور کی طرف سے مسلم لیگ کو تحریک پاکستان کے سلسلے میں دی جانے والی مالی معاونت کا تعلق ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے تمام عطیات خفیہ تھے کیونکہ کسی بھی ریاستی حکمران کے لئے مصلح ایسا ممکن نہ تھا کہ وہ کسی سیاسی جماعت یا شخصیت کو کھلے عام امداد فراہم کریں ۔ ابھی تک جو چند شواہد ملے ہیں ان میں باون ہزار پونڈ کے ایک چیک کا ذکر ملتا ہے جو امیر آف بہاول پور نے لندن میں قائد کو پیش کیا تھا۔ یہ چیک دراصل دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء – ۱۹۴۵ء) کے نتیجے میں ریاست بہاولپور کو پہنچے والے مالی نقصانات کے معاوضے کے طور پر برطانوی حکومت کی طرف سے دیا گیا تھا۔ (۲۴) اس جنگ کے دوران ریاست کے تمام وسائل حکومت برطانیہ کے رحم وکرم پر تھے۔ اس کے علاوہ ایک کروڑ روپے سے زائد کی امداد بھی فراہم کی گئی تھی

۔(۲۵) لیکن امیر آف بہاولپور کا تحریک پاکستان کے لئے عظیم ایثار تھا کہ انہوں نے اپنی ریاست کی طرف سے جنگ کا تمام معاوضہ قائد کے قدموں میں ڈال دیا۔ یہی وہ موقع تھا جب قائداعظم نے اپنی قوم سے حصول پاکستان کی جنگ جیتنے کے لئے چاندی کی گولیوں کی فرمائش کی تھی۔(۲۲) تو اس کے جواب میں امیر آف بہاول پور نے لبیک کہا۔ بالآخر اسی امداد کو کام میں لاتے ہوئے مسلم لیگ نے ۱۹۴۲ - ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں شاندار کامیابی حاصل کی اور پاکستان کی منزل قریب تر ہوگئی۔(۲۷)

اس کے ساتھ ہی امیر آف بہاول پور نے اب اپنے ان جذبات و احساسات کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا جو ان کے دل کے نہاں خانوں میں پاکستان کے لئے پوشیدہ تھے۔ اس دوران انہوں نے ایک بار اپنے وزیروں اور مشیروں کے سامنے جن میں ان کا ہندو وزیر داخلہ دیوان فتح چند بھی شامل تھا، برملا اظہار کرتے ہوئے کہا: ۔

> " میرے عوام یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کس
> طرف شامل ہوں گا میں اس طرف شامل ہوں گا
> جس طرف میرے عوام جائیں گے اور یہ جاننا مشکل
> نہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں پاکستان کے ساتھ مل
> جاؤں۔" (۲۸)

یہی وہ موقع تھا جب نواب صادق محمد خان خامس نے انگریزوں کی بالادست حکومت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اور اپنے جملہ مصاحبین کی رائے کے برعکس تحریک پاکستان کے سلسلے میں کھل کر قائد اعظم کی معاونت کا فیصلہ کرلیا۔ بریگیڈئر نذیر علی شاہ اپنی ذاتی یادداشتوں میں بیان کرتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لئے امیر آف بہاول پور نے میرے توسط سے میر غلام بھیک

نیر نگ (۲ ۷ ۸ ۱ء -۱۹۵۲ء) کولندن ہوٹل میں بلوایاتا کہ قائد اعظم سے فوری رابطہ قائم کیاجا سکے ۔ رابطہ قائم ہونے پر وہ بذات خود ۱۰ -اورنگزیب روڈ دہلی" قائد اعظم کی رہائش گاہ پر پہنچے اور اپنی دیہ اور ریاست کی جملہ خدمات قائد اعظم کو پیش کر دیں۔ نذر علی شاہ مزید تحریر کرتے ہیں کہ یہی وہ موقع ن تھی جب قائد نے کھڑے ہو کر نواب صاحب کو بھائی کہہ کر گلے لگایا اور انکا شکریہ ادا کیا۔(۲۹)۔ یقیناً قائد اعظم جو بڑے مردم شناس تھے، امیر آف بہاولپور کی اس معاونت کی یقین دہانی کے بعد تق انہیں تحریک پاکستان کے سلسلے میں اپنے معتمد ساتھیوں میں شمار کرنے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ۱۹۴۲ء سے قائد نے کراچی میں بہاول پور ہاؤس الشمس اور القمر کو پاکستان کے مستقل ہیڈ کوارٹر کی حیثیت دے دی۔

اس سلسلے میں بہاول پور کے مشہور سیاستدان اور سابق وزیر اعلی مخدوم زادہ سید حسن محمود - تحریر کرتے ہیں کہ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز اور لیگ میں شمولیت کا آغاز ملیر ہاؤس کراچی میں قائد اعظم سے ایک ملاقات کے دوران ہوا اور قائد اعظم نے انہیں اپنے علاقے میں مسلم لیگ کی تنظیم کا کام کرنے کا حکم دیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ "بہاول پور ہاؤس ملیر" اس وقت مسلم لیگ کا محور و مرکز تھا۔(۳۰)

دیگر تمام ذرائع کی طرح خود امیر آف بہاول پور کے اے ڈی سی بریگیڈ ئر نذیر علی شاہ اور آپ کے وزیر حضوری سعید ہاشمی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے جب بھی قائد اعظم کراچی تشریف لاتے تو آپ کا قیام قصر القمر بھی ہوتا تھا اور آپ امیر آف بہاولپور کو اپنی میزبانی کا شرف بخشتے ۔ حتیٰ کہ جب قیام پاکستان کے بعد بحیثیت گورنر جنرل آپ مستقلا کراچی مقیم ہوئے تو اس دوران بھی آپ وقتاً فوقتاً گورنر جنرل ہاؤس سے ملیر القمر میں تشریف فرما ہوتے رہے۔ (۳۱) اس طرح خصوصیت سے ۱۹۴۶ء کے دوران کراچی کا بہاول پور ہاؤس قائد اعظم اور تحریک

پاکستان کے سلسلے میں کئی سرگرمیوں کا مرکز و محور بنا رہا۔ مثلاً اسی سال قائد اعظم نے امیر آف بہاولپور کی رہائش گاہ " القمر پیلیس ملیر " میں بلوچستان کے شاہی جرگہ کے ارکان اور میونسپل کمیٹی کوئٹہ کے ممبران اور دیگر سرداروں سے ملاقات کی۔ بلوچستان کے اس نمائندہ مقصد میں سردار باز محمد خان جوگیرلی، سردار محمد خان جوگیزئی، سردار محمد عثمان خان جوگیزئی، میر جعفر خان جمالی، حفیظ خان اچکزئی، ارباب محمد عمر کانسی، ملک جان محمد کانسی، حاجی صورت خان ترین، سردار غلام محمد خان ترین، سردار نواب خان پانیزئی، گلستان خان مروانی اور سردار اللہ داد خان جعفر شامل تھے۔ ان سب افراد نے حصول پاکستان کی جدوجہد میں بھرپور ساتھ دینے کا عزم کیا۔ قائداعظم نے اس موقع پر بہاول پور ہاؤس کے وسیع لان میں تمام معززین بلوچستان سے خطاب کیا اور اس تقریب کے انعقاد کے سلسلے میں معاونت پر آپ نے امیر آف بہاولپور کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر ایک یادگار فوٹو بھی لیا گیا۔ " القمر، بہاول پور ہاؤس " میں لئے گئے اس گروپ فوٹو میں اٹھارہ کے قریب معززین نظر آتے ہیں۔ (۳۲) یقینا تشکیل پاکستان کی ایک اہم کڑی ہے کیونکہ یہی وہ عمائدین بلوچستان تھے، جنہوں نے بہاولپور ہاؤس کراچی میں قائد سے کئے گئے عہد کو خوب نبھایا اور استصواب رائے کے موقع پر بانگ دہل مملکت پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ (۳۳)

اس طرح تحریک پاکستان کے دوران کئی ایسے مواقع آئے جہاں امیر آف بہاول پور قائداعظم کے دست راست کے طور پر نظر آتے ہیں مثلا ستمبر ۱۹۴۶ء کے آخر میں نواب آف جوپال نے قائد اعظم اور گاندھی کے درمیان ملاقات کا انتظام کرایا۔ (۳۴) ایک اور ایسی ملاقات ۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو نواب نواب آف بھوپال کی کوٹھی میں قائد اعظم اور جواہر لعل نہرو کے مابین نوے منٹ تک جاری رہی۔ (۳۵) پروفیسر معین الدین قریشی کے مطابق اس مصالحتی گفت وشنید کے انصرام

واہتمام کے لئے امیر آف بہاول پور نے نواب آف بھوپال کو آمادہ کیا تھا۔(۳۲) کیونکہ ان دونوں کے آپس میں بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔(۳۷)

امیر آف بہاول پور کی طرف سے قائد اعظم کو دلی خراج عقیدت اور تحریک پاکستان کے سلسلے میں مذہبی جذبات وعقیدت کا اندازہ اس وقت ہوا جب کم دسمبر ۱۹۴۶ء کو تقسیم ملک اور قیام پاکستان کے منصوبے کی قطعی گفت وشنید کے لئے قائد اعظم کو کراچی سے دہلی اور پھر لندن روانہ ہوتا تھا۔ (۳۸) دوسری اہم شخصیات جنہیں اس موقع پر دعوت دی گئی تھی ان میں لیاقت علی خان،لارڈ ویول، پنڈت نہرو، سردار بلدیو سنگھ اور سر فرانسس موڈی گورنر سندھ شامل تھے۔(۳۹) جونہی نواب بہاول پور کو تقسیم ملک اور ظہور پاکستان کی منزل سامنے نظر آئی انہوں نے قائد کی لندن روانگی سے قبل انہیں اپنی نیک خواہشات وتمناؤں پر مشتمل ایک خط روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی بطور وسیلہ قرآن کریم کا ایک مرصع طلائی نسخہ ارسال کیا۔ امیر آف بہاول پور کا یہ اقدام ریاست بہاول پور کی قدیم دینی روایات اور اسلام دوستی کا مظہر تھا۔ بریگیڈئر نذیر علی شاہ تحریر کرتے ہیں کہ قائد اعظم کی خدمت میں یہ تمام دینی ودنیوی تحائف پہنچانے کا شرف انہیں حاصل ہوا۔ آپ نے بڑی محبت سے نواب صاحب کا خط پڑھا اور زبانی سلام پہنچانے اور شکریہ ادا کرنے کی تاکید کی۔(۴۰) تاہم آپ نے ان تحائف کے سلسلے میں شکریے کے طور پر ۲۰ نومبر ۱۹۴۶ء کو ایک خط بھی تحریر کیا۔ (۴۱) قائد اعظم کے نزدیک امیر آف بہاول پور اور ملیر میں بہاول پور ہاؤس کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب آپ برطانوی حکومت سے مذاکرات کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن سے کراچی واپس پہنچے تو اس کے بعد سے ۲۸ جنوری ۱۹۴۷ء تک بہاول پور ہاؤس میں مقیم رہے۔(۴۲) یقینا یہ اعزاز بھی ریاست بہاولپور کو حاصل ہوا کہ قائد کے ہاتھوں قیام پاکستان

کے سلسلے میں تمام ضروری دستاویزات کی تیاری اور انتظامی امور کے سلسلے میں کی جانے والی تمام پیشرفت بہاول پور ہاؤس میں بیٹھ کر انجام پذیر ہوئی۔

اس طرح قیام پاکستان سے چند ماہ پہلے قائد اعظم اور امیر آف بہاول پور کے مابین ہونے والی باہمی خط و کتابت کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بانی پاکستان کی یہ دلی خواہش تھی کہ ملیر میں واقع بہاول پور ہاؤس کو پاکستان کے گورنمنٹ ہاؤس کا درجہ دیا جائے ۔ اس سلسلے میں آپ نے نواب بہاول پور کو لندن سے ایک خط بھی تحریر کیا۔ اس کے جواب میں امیر آف بہاول پور نے فوری طور پر ۲۶ جون ۱۹۴۷ء کو ایک ٹیلی گرام نمبر F-1 / 10041 آپ کی تجویز کے عملی اطلاق کے سلسلے میں ارسال کیا۔(۴۳) قیام پاکستان کے بعد قائد کی اس تجویز کو عملی جامہ کیوں نہ پہنایا جا سکا اس کے بارے میں تاحال کوئی دستاویزی ثبوت مہیا نہیں ہو سکا۔

خود تقسیم کے منصوبہ اور اس سے بڑھ کر مملکت پاکستان کے ظہور پذیر ہونے کی خوش کن خبر نے ریاستی عوام کے دل میں قائد اعظم کے لئے افسانوی شہرت پیدا کر دی۔ اس کا اندازہ بہاول پور کے شعراء کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے جو قائد کے بارے میں یہاں کے عوام کے دلی جذبات وعقیدت کا ترجمان ہے۔ ان میں ایس احمد مشتاق کا خراج تحسین جو "اے قائد اعظم" کے عنوان سے سترہ جولائی ۱۹۴۷ء کے "نوائے مسلم" میں چھپا جو ریاست کے اندر مسلم لیگ کا ترجمان اخبار تھا۔ ملاحظہ ہو

بخشا تجھے اللہ نے واللہ وہ سب دم خم .... اے قائد اعظم
دشمن بھی ترے دیکھ کے ہو گئے سب بے دم................ اے قائد اعظم

اسی طرح ایس ای کالج، بہاولپور کے پروفیسر دلشاد کانچوی نے ۲۷ جولائی ۱۹۴۷ء کے نوائے مسلم میں وقت کی ضرورت" کے عنوان سے اپنے انقلابی اشعار میں قائد کو رہبر فرزانہ کا خطاب دیا۔

اگ قوم منظم ہو، اک سبز پھریرا ہو
اگ قائد اعظم ہو، اک رہبر فرزانہ (۴۵)

واضح ہو کہ ۱۳ جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے نے مسلم لیگ اور کانگریس کے نمائندوں کی کانفرنس میں قائد اعظم کی اس تجویز پر اتفاق کیا تھا کہ برطانوی اقتدار اعلی کے خاتمے پر ہندوستانی ریاستیں خود مختار اور آزاد ہو جائیں گی۔ اس لئے انہیں ہندوستان یا پاکستان میں کسی ایک کے ساتھ شریک ہو جانے کا حق حاصل ہو گا۔ (۴۶) اس موقع پر امیر آف بہاول پور نے قائد اعظم کو اعتماد میں لیتے ہوئے اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ ریاست بہاول پور کی جنوبی طویل سرحد پر واقع راجپوتانہ کی ریاستیں پاکستان سے الحاق کر لیں۔ نواب صادق محمد خان خامس کے بیٹے شہزادہ مامون الرشید عباسی (متوفی ۱۹۹۹ء) نے انکشاف کا کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت راجپوتانہ اسٹیٹس کونسل جس میں (جودھ پور، جے پور، بیکانیر اور جیسلمیر کے راجے شامل تھے) نے امیر آف بہاولپور کے توسط سے قائد اعظم سے بات چیت کی کیونکہ امیر موصوف کے ان تمام راجاؤں سے ہمسایہ ہونے کے ناطے قریبی تعلقات تھے، لہذا قائد نے ان کے والدہ کو ایک سفید کاغذ اپنے دستخطوں کے ساتھ بھجوایا کہ یہ راہے پاکستان سے الحاق کے لئے جو شرائط چاہیں لکھ دیں مجھے ان سے پورا اتفاق ہو گا لیکن جو نہی اس بات کی خبر وی پی میں (۱۹۴۴-۱۸۹۴ء) کو نچی دو فوراپنڈت جواہر لعل نہرو (۱۸۸۹-۱۹۲۲ء) کے پاس گیا۔ نہ دنے وائسرائے کو دہائی دی۔ اس پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے راجپوتانہ اسٹیٹس کونسل کے سربراہ ریاست جے پور کے راجہ کو بلایا اور اسے دھمکی دی کہ اگر آپ باز نہ آئے تو ہم پولیس

ایکشن کریں گے۔ اس پر کونسل کے والیضاًن ریاست گھبر اگئے اور اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ (۴۷) یہ بات ایک حقیقت ہے کہ امیر آف بہاولپور کے ان تمام ریاستوں کے حکمرانوں سے انتہائی دوستانہ مراسم تھے اور انہوں نے پاکستان سے الحاق کے سلسلے میں انہیں قائل بھی کر لیا تھا۔(۴۸) اگر وائسرائے کا دباؤ نہ ہوتا تو شاید می ریاستیں پاکستان کے حق میں اپنا فیصلہ کرتیں اور آج پاکستان کی جغرافیائی حدود کچھ اور ہوتیں۔ تحریک پاکستان کے دوسرے ماخذات سے بھی ثابت ہے کہ قائداعظم نے جودھ پور اور جیسلمیر کے حکمرانوں سے جولائی ۱۹۴۷ء کے آخر میں ملاقات کی۔(۴۹)

اسی باہمی اعتماد کے پس منظر میں پنجاب کی حد بندی کمیشن میں جسٹس شیخ دین محمد (۱۹۴۷ء-۱۹۶۶) کی تقرری جو اس وقت ہائی کورٹ بہاولپور کے چیف جسٹس تھے(۵۰)، قائداعظم اور امیر آف بہاول پور کی باہمی مشاورت کے نتیجے میں عمل میں لائی گئی ہوگی۔ کیونکہ پنجاب کی تقسیم کے دوران دریائے ستلج کی وجہ سے خود ریاست بہاولپور کے مفادات اس کمیٹی سے وابستہ تھے۔ باؤنڈری کمیشن کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان کے مفادات کا بھرپور دفاع کیا(۵۱)۔ یہی نہیں بلکہ وہ واحد ممبر تھے جنھوں نے بروقت ریڈ کلف کی بد دیانتی سے متعلق قائداعظم کو مطلع کیا۔ آپ کی فرض شناسی اور بہتر کارکردگی کو سراہتے ہوئے ریاست بہاول پور نے آپ کو برطانوی حکومت کی طرف سے ملنے والے معاوضے پر نہ صرف انکم ٹیکس معاف کر دیا بلکہ بعد ازاں انہیں حکومت پاکستان نے اکتوبر ۱۹۴۸ء میں گورنر سندھ بھی مقرر کر دیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ریاست بہاول پور کا پاکستان سے الحاق بھی قائداعظم اور امیر آف بہاول پور کے دمیر بینہ تعلقات کا نتیجہ تھا۔ وگرنہ کانگریسی قیادت نے پاکستان کو جغرافیائی طور پر کمزور کرنے اور اس کے صوبہ جات پنجاب، سندھ اور بلوچستان کا ایک دوسرے سے رابطے منقطع کرنے کے

لئے ریاست بہاول پور کا الحاق ہندوستان سے کرنے کی پوری کوششیں کیں۔ اس مقصد کے ئے سردار ولبھ بھائی پٹیل (۱۸۷۵ء-۱۹۵۰ء) اور جواہر لعل نہرو (۱۸۸۹ء-۱۹۶۴ء) نے امیر آف بہاول پور کے وزیر اعظم نواب مشتاق احمد گورمانی (۱۹۴۷ء– ۱۹۴۸ء، تقرری کادورانیہ) اور امیر آف بہاول پور کے بہنوئی کرنل صم باللہ عباسی (۱۹۱۲ء-۱۹۹۱ء) سے بیکانیر کے راج محل اور دہلی میں ملاقاتیں کیں تا کہ یہ دونوں حضرات نواب صاحب سے ذاتی تعلق کی وجہ سے ان پر اثر انداز ہوں۔ اس منصوبہ کی انجام دہی کے لئے انہیں مادی مفادات کالالچ بھی دیا گیا تھا۔ گورمانی اس پر آمادہ بھی ہو گئے تھے اور جیسا کہ قیام پاکستان کے بعد ان کی کانگریس سے خط و کتابت کا ثبوت بھی مل گیا تھا۔(۵۲) لیکن معتصم باللہ کے بقول انہوں نے پٹیل اور نہرو کو اس موقع پر باور کرادیا تھا کہ نواب صاحب کے قائد اعظم سے دوستانہ مراسم ہیں اس لیے وہ اس بات پر آمادہ نہ ہوں گے۔ (۵۳) ان ابتدائی کوششوں کے نتیجے میں ریاستی وزیر اعظم کو اپنے ہاتھ میں کرنے کے بعد خود پنڈت نہرو نواب سر صادق محمد خان عباسی سے ملاقات کے لئے لندن پہنچے اور انہیں بمبئی، دہلی اور پالم پور میں موجود ان کی جائیداد کے تحفظ، چولستان کے لئے بھاکھڑا ڈیم سے وافر پانی مہیا کرنے اور مزید ذاتی مراعات کی یقین دہانی پر ہندوستان سے الحاق پر آمادہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ (۵۴) اس واقعہ کی تصدیق ایک ایسی تصویر سے بھی ہوتی ہے جو ۱۹۴۲ء میں لندن میں اتاری گئی۔ اس تصویر میں جواہر لعل نہرو نواب صادق محمد خان خامس، آپ کی انگریز بیوی اور صاحبزادی شفیقہ عباسی نمایاں ہیں۔ یہ تصویر اس وقت سینٹرل لائبریری بہاول پور کے استقبالیہ کمرے میں آویزاں ہے۔

کانگریسی لیڈروں نے ریاست بہاول پور کو ہندوستان میں شامل کرنے کے لئے صرف اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ قیام پاکستان کے بعد بھی اپنی آخری کوشش کے طور پر مہارانی امرت کنور اور نہرو کی بہن و

جے لکشمی کو صادق گڑھ پیلس بھیجا۔(۵۵) انہوں نے بھی نواب صاحب کو راضی کرنے کی ہر ممکنی سعی کی۔ لیکن امیر آف بہاول پور نے قائد اعظم کی دوستی اور مسلمان ہونے کے ناطے پاکستان کے حق میں اپنا فیصلہ دیا۔ جوں جوں پاکستان کی منزل قریب آتی گئی، امیر آف بہاول پور کے دل میں قائد اعظم کے لئے محبت وعقیدت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔ قیام پاکستان سے قبل لندن میں مقیم ہونے کے باوجود جونہی ملک کی آزادی کی خبر پہنچی اور قائد کے ۷ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچنے (۵۲) سے متعلق نواب صاحب مطلع ہوئے تو اس موقع پر فوراً اپنے وزیر اعظم مشتاق احمد گورمانی اور افواج بہاول پور کے کمانڈنگ آفیسر جنرل مارڈن کو بذریعہ تار ہدایت کی کہ جونہی قائد بہاول پور ہاؤس ملیر پہنچیں تو آپ کا استقبال ایک سربراہ مملکت کی طرح کیا جائے۔ چنانچہ ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو جب بانی پاکستان کی فرسٹ انفنٹری نے شاہی سلامی اور گارڈ آف آنر پیش کیا۔(۵۷) لہذا پاکستان کی سرزمین پر قائد کو بطور سربراہ مملکت پہلے گارڈ آف آنر پیش کرنے کا اعزاز بھی افواج ریاست بہاول پور کو حاصل ہوا۔ اسی طرح یوم آزادی کی تقریب کو شایان شان طریقے سے منانے کے لئے نوزائیدہ مملکت کے پاس کوئی خاطر خواہ انتظامات نہ تھے۔ حتی کہ موٹر گاڑیاں تک نہ تھیں۔ یہاں تک کہ وائسرائے ہند کی بگھیوں میں جو بھی پاکستان کے حصے میں آئی تقریب سے پہلے ہی اس کے ایک گھوڑے کی ٹانگ لنگڑی ہو چکی تھی۔(۵۸) لہذا اس موقع پر بھی امیر آف بہاول پور کی ذاتی موٹروں مرا کا فلیٹ ڈیرہ نواب صاحب سے روانہ کیا گیا۔ اس واقعہ کی تفصیل صادق گڑھ پیلیس کے موٹر خانہ کے ہیڈ مکینک عبد الرحمن نے ایک انٹرویو کے دوران کچھ اس طرح سے بیان کی کہ "امیر آف بہاول پور کے حکم پر جشن آزادی سے چند روز پیشتر پانچ عدد موٹر میں ڈیرہ نواب اسٹیشن سے بذرایہ مال گاڑی کراچی روانہ کی گئیں۔ گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کو مجھے حکم دیا گیا کہ مزید دو عدد رولز رائس گاڑیاں لے کر کراچی پہنچوں حکم کے مطابق ہم لے نے ان موٹروں کو رات ساڑھے نو بجے

روہڑی تک جانے والی ایک پسنجر ٹرین کے ساتھ اضافی مال گاڑی کی جس بوگیوں پر لوڈ کرایا اور بارہ اگست کی صبح کو روہری پہنچے۔ وہاں جاکر ہمیں معلوم ہوا کہ پہلے سے روانہ کی جانے اس والی موٹر میں ابھی تک سٹیشن پر رکی ہوئی ہیں۔" عبدالرحمن مرحوم نے مزید بتایا کہ ہم نے ہندو اسٹیشن ماسٹر سے موٹروں کو کراچی روانہ کرنے کا فوری انتظام کرنے کو کہا تو اس نے اس سلسلے میں تعاون سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر میں نے تمام صورتحال سے متعلق بذریعہ فون بہاول پور ہاؤس کراچی سے رابطہ کیا۔ وہاں پر موجود ذمہ دار افسر کی مداخلت پر کراچی سے ایک سپیشل مال گاڑی کو دو انجنوں کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ اس طرح بالآخر لگا ہم ۱۳ اگست ۱۹۴۷ کو علی الصبح ڈرگ روڈ اسٹیشن کراچی پہنچے۔ وہاں سے ہم ملیر کیمپ آفس آئے اور ۱۴ اگست کو علی الصبح جلوس میں شرکت کے لئے یہ تمام گاڑیاں کراچی وائسر میگل لاج روانہ ہوئیں۔ دونوں رولز رائس کے پالا ڈرائیور صوبیدار چو خان اور اکرم تھے۔ سفید رولز رائس نمبر BWP-۷۲ پر قائد اعظم اور مونٹ بیٹن سوار تھے۔ کاروں کا یہ جلوس صدر بازار اور بند روڈ تک گیا۔ (۵۹) اس کے بعد وہاں سے قائد اور مونٹ بیٹن نے امیر آف بہاولپور کی ذاتی گھی پر جسے جی الانہ نے شاہی بگھی کا نام دیا ہے۔ گورنر جنرل ہاؤس روانہ ہوا۔ (۲۰) اس طرح انتقال اقتدار کی یہ تقریب ریاست بہاول پور اور اس کے نواب کے بھرپور تعاون کی وجہ سے پوری شان وشوکت سے منائی گئی۔ خود مامون الرشید عباسی نے اس کے متعلق بتایا کہ " جشن آزادی والے دن آٹھ گھوڑوں کی بگھی، چتر شاہی، شامیانہ، گھڑ سوار اور جاشار (باڈی گارڈ) ریاست بہاول پور کی طرف سے فراہم کئے گئے تھے" ۔ (۲۱)

خود قائد اعظم بھی ریاست بہاولپور اور امیر آف بہاول پور کی ان تمام خدمات کے معترف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ گورنر جنرل ہاؤس کراچی منتقل ہونے کے بعد بھی آخری ایام ہفتہ گزارنے کے لیے حسب سابق قصر الشمس ملیر میں تشریف فرما ہوتے رہے۔ (۲۲) انہی ایام کا ایک یادگار فون

خصوصیت سے ان دوستانہ مراسم کی عکاسی کرتا ہے جس میں علی الترتیب قائد اعظم، امیر آف بہاول پور اور فاطمہ جناح (۱۸۹۳ء-۱۹۶۷ء) چائے کی میز پر تشریف فرما ہیں اور ان کی پشت پر قائد اعظم کے اے ڈی سی ،نواب صاحب کے ولی عہد اور خاص ذاتی عملہ کے افراد کھڑے ہیں۔(۲۳) ان تمام واقعات سے یہ بات ثابت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد یہ دوستانہ تعلقات بے تکلفانہ اور گھریلو نوعیت اختیار کر چکے تھے۔ خود قائد اور مادر ملت بھی گورنمنٹ ہاؤس کی بجائے بہاول پور ہاؤس میں زیادہ آرام وسکون محسوس کرتے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح کی خواہش پر امیر آف بہاول پور نے بہاول پور ہاؤس الشمس اور القمر کے درمیان واقع ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی قائد اعظم کو ذاتی رہائش گاہ کی تعمیر کے لئے تحفتاً دے دی۔(۲۴) قائد اعظم اور فاطمہ جناح اپنی زندگی میں یہاں رہائش گاہ تعمیر نہ کرا سکے اور ان کی وفات کے بعد ان کے ورثاء نے بیر زمین فروخت کر ڈالی۔ (٦۵) امیر آف بہاولپور کی قائد کے لئے عقیدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب چند بکسوں پر مشتمل قائد اعظم کا ذاتی سامان دہلی سے کراچی کی طرف جارہا تھا تو راستے میں اسے ہندو بلوائیوں نے آگ لگا دی حالانکہ ان پر آپ کا نام بھی لکھا تھا۔ جب میگاڑی سمہ سٹہ جنکشن پر رکی تو وہاں پر تعینات فوجی دستہ نے اس کی خبر نواب صاحب کو دی۔ اس پر آپ نے حکم دیا کہ کراچی سے دہلی کے لئے پٹرول لے جانے والی تمام ٹرینوں کو اس کی پاداش میں سمہ سٹر وک لیاجائے اور اس طرح کئی روز تک ہندوستان کو پٹرول کی سپلائی منقطع رکھی گئی۔(۲۲)

قائد اعظم بھی تحریک پاکستان کے سلسلے میں امیر آف بہاول پور کی طرف سے مہیا کی جانے والی نجر پور معاونت کے معترف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں آپ کی دوستی کا بھی پاس تھا۔ قائد اپنی مردم شناسی کی بدولت آپ کو نوزائیدہ پاکستان کی تعمیر تشکیل کے لئے سب سے زیادہ اہل شخص تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء کی منظوری کے بعد سے ہی قائد کی عقابی

نظروں نے شمال مغربی خطے میں واقع کشمیر اور پٹیالہ کے ساتھ ساتھ بہاول پور جیسی مسلم اکثریتی ریاست کا بھی احاطہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس ریاست کو ہندوستان کے وفاق میں اس کی منشاء کے برخلاف شامل کرنے کی بجائے اس کی خود مختارانہ حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ جس کا اندازہ آپ کے اس اخباری بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔

> "بعض اہم اور بڑی ریاستیں مشرق میں نہیں بلکہ وہ شمال مغربی منطقے میں ہیں اور یہ کشمیر، بہاول پور اور پٹیالہ وغیرہ ہیں۔ اگر میر ریاستیں بخوبی ہندوستان کے وفاق میں شریک ہونا چاہتی ہیں تو ہم ان سے موزوں مفاہمت اور باعزت مجھوتے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہم کسی طرح بھی انہیں مجبور نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی ان پر دباؤ ڈالنا پسند کرتے ہیں" ۔(۲۷)

قائد اعظم نے قیام پاکستان کے آغاز سے ہی آپ کو ایک اہم منصب پر فائز کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا انداز ۱۳ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے اس پروگرام کی تفصیل اور پروٹوکول لسٹ کے مشاہدہ سے ہوتا ہے جو پاکستان کے گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری جے ۔برنی کی طرف سے جاری کی گئی۔ اس کے مندرجات کے مطابق ہز ہائی نس نواب آف بہاول پور کو نامزد گورنر سندھ لکھا گیا ہے۔(۲۸) حالانکہ آپ اس وقت لندن میں مقیم تھے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ پروگرام چونکہ کچھ عرصہ پہلے ہی مرتب ہوا ہوگا لہذا قائد اعظم کی ہدایت پر امیر آف بہاولپور کو بحیثیت گورنر سندھ نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ جس کی اطلاع بھی آپ کو لندن ارسال کر دی گئی ہو گی لیکن نواب صاحب نے اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ آپ نے اس قسم کے ایثار کا مظاہرہ اس وقت بھی کیا

جب قائد اعظم نے بذات خود اپنے بعد آپ کو گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور قائد کی وفات کے بعد لیاقت علی خان اور سردار عبد الرب نشتر نے ایک ملاقات کے دوران جس میں امیر آف بہاولپور کے دو بیٹے ولی عہد عباس عباسی اور ہارون الرشید موجود تھے، آپ کو اس منصب کی پیشکش کی۔(۶۹) آپ نے اپنی خدمات کے صلے میں یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کی ان ذاتی خوبیوں کے قدردان خود بانی پاکستان تھے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قائد اعظم کی ذات جو کسی اعلی سے اعلی شخصیت کو بھی خاطر میں نہلاتی تھی، نواب صادق محمد خان جب بھی گورنر جنرل ہاؤس جاتے تو طویل ملاقات اور تبادلہ خیالات کے بعد قائد اعظم بالائی منزل سے نیچے اتر کر امیر آف بہاول پور کو بڑی محبت وشفقت سے رخصت فرماتے۔ حالانکہ نواب صاحب اس پر اصرار کرتے کہ قائد بالائی منزل سے نیچے اترنے کی زحمت نہ کریں۔(۷۰) حقیقت یہ ہے کہ ریاست بہاول پور کے پاکستان سے الحاق کی ایک بڑی وجہ قائد اعظم محمد علی جناح کے نواب صادق محمد خان خامس سے ذاتی مراسم تھے۔ قیام پاکستان کے وقت نواب صاحب لندن میں مقیم تھے لیکن جونہی اکتوبر ۱۹۴۷ء میں وطن واپس آئے تو انہوں نے بلا پس و پیش تین نومبر ۱۹۴۷ء کو ریاست بہاولپور کا الحاق فیڈریشن آف پاکستان سے کرنے کا اعلان کر دیا۔ تاہم اس معاہدے کے مطابق امیر آف بہاول پور کے لئے بطور حکمران تمام تر اختیارات حقوق اور مراعات برقرار ہیں اور ریاست میں مروجہ قوانین کو بھی ہر قسم کا تحفظ حاصل رہا۔ امیر آف بہاول پور کے دستخطوں کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے پانچ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اس معاہدے پر دستخط کئے۔(۷۱)

معاہدہ الحاق کے سلسلے میں خود قائد اعظم جیسی با اصول اور آئینی امور کی ماہر شخصیت نے نواب صاحب کو اس بات کی فراخدلانہ پیشکش کی تھی کہ دو اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کی شرائط تحریر کرنا پسند کریں لکھ دیں۔ انہیں اسے قبول کرنے میں کسی قسم کا کوئی تامل نہ ہو گا۔ یقیناً یہ خالی چیک

(Blank Cheque)نواب صاحب کو اپنی ریاست کے الحاق کے سلسلے میں دی جانے والی اس عظیم قربانی کے اعتراف کے طور پر قائد نے اپنے ہاتھ سے دیا۔ اس طرح ریاست بہاولپور کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے والی سب سے بڑی اور سب سے پہلی ریاست کا اعزاز حاصل ہوا۔ جس کی تقلید میں بعد ازاں علی الترتیب ریاست خیر پور، سوات، امب، دیر، چترال، لسبیلہ مکران، خاران اور قلات نے الحاق کیا۔(۷۲)

یہی نہیں بلکہ امیر آف بہاول پور نے اس کے علاوہ بھی قائد اعظم سے ذاتی تعلق کو خوب نبھایا۔ ایک مسلم ریاست کے حکمران ہونے کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو معاشی سہارا دینے کے لئے دس کروڑ کی خطیر رقم نقد ادا کی۔ علاوہ ان میں قیام پاکستان کے ایک سال بعد تک ملک کے تمام سرکاری اداروں کی تنخواہوں کی ادائیگی بھی خزانہ بہاول پور سے جاتی رہی۔ ان تمام خدمات کا اعتراف بانی پاکستان نے ہائی کورٹ لاہور میں اپنے خطاب کے دوران یوں کیا کہ ہم ریاست بہاول پور کے ممنون ہیں کہ اس نے ہمیں قلم کی روشنائی تک امداد دی"۔(۷۳)

قائد اعظم نے ملیر میں قیام کے دوران بڑی محبت سے ریاست بہاول پور اور کشمیر کی داخلی خود مختاری کے بارے میں یوں تذکرہ کیا کہ:

> "انشاء اللہ پاکستان کا تعلق بہاول پور اور کشمیر کے ساتھ ایک ممتاز حیثیت رکھے گا اور ہر دو ریاستیں مملکت پاکستان کے تحت داخلی طور پر خود مختار ہوں گی"۔(۷۴)

قائد اعظم کی قیادت کے دوران نوزائیدہ مملکت کا سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کی بحالی اور آبادکاری کا تھا۔ اس طرح ریاست بہاول پور نے کم و بیش ایک لاکھ مہاجرین کو ریاست میں آباد کیا۔ یہی نہیں

بلکہ اس مقصد کے لئے قائم ہونے والے قائد اعظم ریلیف فنڈ میں ریاست بہاول پور کی طرف سے پانچ لاکھ روپے کا عطیہ دیا گیا۔(۷۵) اس کے شکریے کے لئے قائد نے ذاتی طور پر ریاست کے وزیر اعظم مشتاق احمد گورمانی کو ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایک خط تحریر کیا جس میں حکومت پاکستان کی اس مدد پر امیر آف بہاولپور کا خصوصی شکر مید ادا کیا گیا تھا۔(۷۶)

قائد اعظم کا خطہ بہاول پور اور نواب بہاول پور سے مخلصا.تعلق آپ کی وفات تک قائم رہا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب قائد علیل ہوئے تو آپ نے بہاول پور ہاؤس منتقل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن آپ کے ذاتی معالج کرنل الہی بخش نے ۲۶ اگست ۱۹۴۷ء کو زیارت جانے کا مشورہ دیا۔ جب امیر آف بہاول پور کو آپ کی علالت کی خبر ملی تو آپ نے فوری طور پر اپنی طرف سے مزاج پرسی کے لئے لندن سے اپنے وزیر کرنل سعید ہاشمی کو روانہ کیا۔ قائد اعظم نے شدید بیماری کے باوجود ملاقات کے لئے طویل وقت مرحمت فرمایا اور اپنی زندگی کے ان آخری لمحات کے دوران نواب صادق خامس کا تذکرہ انتہائی محبت سے فرمایا۔(۷۷)

جونہی امیر آف بہاول پور کو ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد کی رحلت کی خبر ملی تو آپ کو شدید دلی صدمہ ہوا۔ آپ نے لندن میں قائد اعظم کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ جبکہ کراچی میں نماز جنازہ میں شرکت کے لئے آپ کے دو بیٹوں ولی عہد عباس عباسی اور شہزادہ ہارون الرشید عباسی نے آپ کی نمائندگی کی۔ جونہی امیر آف بہاول پور لندن سے کراچی آئے تو قائد اعظم کے مزار پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی ۔ (۷۸)

خود ریاست بہاولپور کے عوام کے لئے بانی پاکستان کی وفات کی خبر برق ناگہانی کا سا صدمہ رکھتی تھی ۔ شہر بہاولپور سمیت ریاست بھر کے تمام شہروں اور قصبات میں قائد اعظم کی وفات کے روز تعزیتی جلسے ہوئے اور غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی ۔۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بہاولپور میں نماز عصر

سے نماز مغرب تک قرآن خوانی ہوئی۔(۷۹)اس طرح انجمن اشاعت سیرۃالنبی کی طرف سے بھی قائد اعظم کے ایصال ثواب کے لئے قل خوانی ادا کی گئی۔ ۱۴ستمبر کو بھی صبح سات بجے سے ساڑھے دس بجے تک جامع مسجد (الصادق) میں قرآن خوانی کی گئی۔ اس موقع پر شیخ عاشق حسین نے "عقیدت کے پھول" کے نام سے مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ ۱۷ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہفت روزہ "نوائے مسلم" میں شائع ہوا۔

چمکا تھا آسمان پر جو، ہائے ستارہ چل بسا
تیرہ و تار ہے جہاں ، اللہ کا پیارا چل بسا
خدمت قوم کے لئے وقف تھی جس کی زندگی
خورد و کلاں کی زیست کا، ہائے سہارا چل بسا
قوم کا سر بلند ہے فکر وتمل سے جس کے آج
ہائے ہمارے ملک کا راج دلارا چل بسا
جنبش یک نظر میں تھی قوم بھی جس کے ساتھ ساتھ
آج وہ قوم و ملک کی آنکھوں کا تارا چل بسا(۸۰)

اس کے علاوہ آل بہاولپور اسٹیٹ مسلم لیگ کے صدر کی طرف سے قائد اعظم کی وفات پر مسٹر نورند ننکانی صدر آل بہاول پور مسلم لیگ نے ایک تعزیتی برقی مس فاطمہ جناح کو بھیجا۔ جس کے جواب میں فاطمہ جناح نے شکریے کا خط ارسال کیا۔ اس طرح ۲۱ستمبر ۱۹۴۸ء کو شام پانچ بجے ایس ای کالج بہاول پور کے گراؤنڈ میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں کالج کے اساتذہ اور طلباء کے علاوہ ریاست بہاول پور کے ریونیو منسٹر، حکام بالا، معززین شہر نے شرکت کی۔ بہاول پور کی علمی

وادبی اور سیاسی شخصیت شہاب دہلوی نے بھی اپنی تقریر میں بابائے قوم کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے واضح کہا: -

"اگر ہم قائد اعظم کے نصب العین کو اپنا مقصد
بنالیں تو ہم بہت جلد اس ترقی کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں
جس کے لئے قائد اعظم نے اپنی بیش بہازندگی قربان
کردی"۔(۸۱)

بانی پاکستان سے ریاست کے عوام کی محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد جب قائد اعظم میمور میں فنڈ قائم ہوا تو انہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حتی کہ جون ۱۹۵۰ء تک اس فنڈ میں دولاکھ انسٹھ ہزار روپے کی کثیر رقم جمع ہو چکی تھی۔(۸۲) اس مقصد کے لئے سمبر ۱۹۵۰ء میں بہاول پور کے سینما میں کرشا تھیٹر نے ایک دلچسپ پروگرام پیش کیا اور یوں قائد اعظم میمور میں فنڈ کے لئے مزید پانچ ہزار روپے اکٹھے ہوگئے۔(۸۳) ان تمام تفاصیل سے یہ بات ثابت ہے کہ خطہ بہاولپور کے عوام کا اور والئی ریاست کا بانی پاکستان سے کس قدر خلوص اور محبت کا تعلق تھا۔

اس مسلم ریاست کے باسیوں نے شروع سے ہی دو قومی نظریے سے گہری وابستگی کا اظہار کیا۔ جس کا اندازہ و بر غیر کے ان تعلیمی اداوں کی بھرپور مالی معاونت سے لگایا جاسکتا ہے۔(۸۴) جن کے بطن سے مسلمانوں کی جداگانہ وطن کی تحریک نے جنم لیا۔ اس طرح جب قائد اعظم کی رہنمائی میں ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کی منزل متعین کردی گئی تو اس کی عملی جدوجہد میں اس خطے کے عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ریاست کے باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ نے جمعیت مسلمین اور مسلم بورڈ جیسی جماعتوں کے قیام سے ریاست کے

سادہ لوح مگر مخلص عوام کو نہ صرف لیگی رجحانات سے ہم آہنگ کیا بلکہ انہیں ریاست میں کارفرما کانگریس اور مہاسجائی عناصر کے مذموم عزائم سے بھی خبردار کیا۔ برصغیر کی آزادی اور ریاست میں جمہوری اقدار اور روایات کے فروغ کے سلسلے میں یہاں کے عوام کا مسلم لیگ اور قائداعظم سے ربط وضبط بالآخر مملکت پاکستان سے ریاست بہاولپور کے الحاق کا سبب بنا۔ لیکن اس سے بڑھ کر خو دریاست کے آخری فرمانروا نواب صادق محمد خان خامس کے قائد سے دوستانہ مراسم تحریک پاکستان سے تشکیل پاکستان کے بعد تک مسلمانوں کی مملکت کے لئے زبردست مالی، اخلاقی و سیاسی سہارے کا باعث ہوئے ۔ان دوشخصیات کے مابین یہی وہ دیرینہ تعلقات تھے جنہوں نے بہاول پور ہاؤس ملیر کی فضاؤں میں جنم لیا تھا اور یہی وہ ساتھ تھا جس کے تیئں ایک صغیر پاکستان(ریاست بہاول پور) نے اپنی سوا دوسو سالہ زیست کو اپنی تمام تر تاریخ،روایات اور بھرپور وسائل کے ساتھ نوزائیدہ مملکت پاکستان کی فلاح و بقاء پر نثار کر دیا۔ افسوس کہ ہماری قومی تاریخ کے ماخذات ان لازوال خدمات کا احاطہ نہ کر سکے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ خطہ بہاول پور، اس کے عوام اور اس کے آخری امیر کی تحریک پاکستان اور تعمیر پاکستان کے سلسلے میں انجام دی جانے والی عظیم قربانیوں کو نئے سرے سے اجاگر کیا جائے تا کہ تاریخ کی اس فروگزاشت کا ازالہ ہو سکے۔

حوالہ جات وتعلیقات

1. بہاول پور کے علاقہ اوچ کی ناصر الدین قباچہ کے دور میں مرکزی حیثیت کے بارے میں دیکھئے!
منہاج الدین سراج کی تصنیف "طبقات ناصری" جلد اول وجلد دوم (مترجم غلام رسول مہر)،لاہور ۱۹۸۵ء۔
2. رچرڈ سائمنڈ "دی میکنگ آف پاکستان"، کراچی،۱۹۷۶، ص ۱۴۴-
3. مولوی محمد اعظم، "تذکرۃ الخوانین"،المعروف جواہر عباسیہ (فارسی مخطوطہ) ،مبارک جیلانی لائبریری صادق آباد، ۱۸۳۸، ص ۵۳-۵۴-
4. مسعود حسن شہاب "بہاول پور کی سیاسی تاریخ"، بہاول پور،۱۹۷۷، ص ۲۵ –
5. ایضاً ۲۸ –
6. ایضاً، ص ۱۲۰-۱۲۱-
7. ایضاً ص ۱۲۲-
8. مسعود حسن شہاب، سر صادق محمد خان عباسی، ایک محب وطن پاکستانی" (بہاول پور نمبر ملتان، ۱۹۸۴، ص ۵۱ -
9. حکومت بہاول پور ، خفیہ فائل برائے سیاسی جماعتیں،حافظ خانہ بہاول پور ،۱۹۴۰ء۔
10. مسعود حسن شہاب" بہاول پور کی سیاسی تاریخ" ص ۱۲۳-۱۲۴-
11. ایضاً ص ۱۲۵-۱۲۷-

12. زاہد حسین انجم، انسائیکلوپیڈیا قائد اعظم، لاہور ۱۹۹۱، ۴۱۲۔

13. ہیکٹر بولا تھو " پاکستان کا بانی محمد علی جناح " (مترجم زبیر صدیقی) لاہور ، ۱۹۸۱ء ص ۳۰۳ ۔

14. محمد انور نبی قریشی مختصر تاریخ بہاول پور، لاہور، ۱۹۳۱ء ص ۱۲۰ - جدید ماخذات کے مطابق تلج ویلی پراجیکٹ کے لئے ساڑھے بارہ کروڑ روپے قرض لیا گیا تھا۔ جس پر ۱۹۴۷ء تک مزید آٹھ کروڑ روپے سود بن چکا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ نیشنل ڈاکو مینٹیشن، دی پار میشن آف دی پنجاب، (جلد اول) لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۴۰۱ ۔

15. ستلج ویلی پراجیکٹ کا یہ قرض قسطوں کی صورت میں ۱۹۹۱ء تک ادا کیا جانا تھا، لیکن جنوری ۱۹۵۰ء میں چارنڈ بینک سے چوالیس لاکھ روپے لے کر یہ تمام قرض بے باک کر دیا گیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بحث تقریر وزمر خزانہ بہاول پور، میزانیہ سال ۱۹۵۰ -۱۹۵۱ء، بہاول پور، ۱۹۵۰ء، ص ۱

16. صدیق طاہر، قائد اعظم اور بہاول پور، سہ ماہی الزبیر، بہاول پور ۱۹۷۲ء، ص ۸۱ ۔

17. ماجد قریشی، دبستان بہاول پور ۱۹۴۲۰ء، ص۱۲۹ -۱۳۰ ۔

18. حکومت بہاول پور، اہم واقعات و تاریخ بہاول پور محافظ خانہ بہاول پور ، ۱۹۲۵ء، ص ۳ ۔

19. صدیق طاہر، حوالہ سابقہ پس ۸۲ ۔

20. سید نذر علی شاہ، صادق نامہ (مترجم صدیق طاہر)، لاہور، ۱۹۷۳ پس ۹۱ ۔ ۹۲۰۰

21. انٹرویو کرنل معتصم باللہ عباسی، بہاول پور ۲ جون ۱۹۹۰ء -
22. سعید ہاشمی، حیات صادق، لاہور، ۱۹۴۹ء ص ۷۷-۷۸
23. سید مسعود حسن شہاب، نواب سر صادق محمد خان عباسی، دھڑکن (بیاد صادق)، لاہور، کن ندارد، ۲۵ –
24. محمد قمر الزمان عباسی، بہاول پور کا صادق دوست، لاہور ۱۹۹۲، ص ۳۰ –
25. سعید ہاشمی، بحوالہ سابقہ ص ۲۵ –
26. سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، کراچی، ۱۹۷۰ء ص ۲۲۵ -
27. سید اشتیاق حسین قریشی، شارٹ ہسٹری آف پاکستان، (جلد چہارم) کراچی ۱۹۲۷، ۲۲۰
28. سید نذیر علی شاہ، بحوالہ سابقہ ص ۹۲ –
29. سید ندیر علی شاہ، ذاتی مادداشتیں، (غیر مطبوعہ) بہاول پور ص ۳۲ –
30. مخدوم زادہ سید حسن محمود، میرا سیاسی سفر، لاہور، ۱۹۸۲ء ص ۳۰ –
31. سعید ہاشمی، بحوالہ سابقہ ص ۷۸ -
32. صاحبزادہ محمد قمر الزمان عباسی، قائد اعظم اور ریاست بہاول پور، لاہور ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۹ -
33. سید حسن ریاض، بحوالہ سابقہ ص ۵۲۰ -
34. جی الانہ، قائد اعظم محمد علی جناح، ایک قوم کی سرگزشت، (مترجم رئیس امروہوی)، کراچی ان ندارد پس ۴۹۹ –

35. گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی، قائداعظم محمد علی جناح، حیات، افکار وخدمات، (مجلہ علم و آگہی)، کراچی، ۱۹۷۶-۷۷، ص۲۲۶ –

36. پروفیسر معین الدین حسن قریشی عظمت صادق، دھڑکن (بیادصادق) لاہور من ندارد ص ۳۹ –

37. نواب صادق محمد خان خامس کے نواب آف بھوپال سے دوستانہ تعلقات کا اندازہ اس چیز سے لگایاجاسکتا ہے کہ وہ اپنے بھانجے فتح میاں عباسی کی نسبت نواب آف بھوپال کی صاحبزادی سے کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں بات چیت بھی ہوچکی تھی لیکن فتح میاں اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کے خواہشمند تھے، لہذا یہ رشتہ نہ ہوسکا۔ امیر بہاول پور نے اس کے بعد اپنے بھانجے سے قطع تعلق کرلیا اور حکم دیا کہ وہ زندگی بر میرے سامنے نہ آئے۔

38. ہیکٹر میں بولا تھو، بحوالہ سابقہ ص۲۵۹ –

39. گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی علم وآگہی، بحوالہ سابقہ ص۲۳۸ –

40. سید نذیر علی شاہ، قرآن کریم کا ایک تاریخی نسخہ نخلستان ادب، (قائداعظم نمبر) ایس ای کالج، بہاول پور، ۱۹۷۲ء ص۳۹ –

41. مجد قمرالزمان عباسی، بحوالہ سابقہ ص ۱۴۲ –

42. گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی علم وآگہی، بحوالہ سابقہ ص ۲۳۰ –

43. محمد قمرالزمان عباسی، بحوالہ سابقہ، ص۱۶۷۔

44. ایس احمد مشتاق اے قائداعظم ”عشرہ دار نوائے مسلم، بہاول پور ۷ اجولائی ۱۹۴۷، ص ا۔

45. پروفیسر دلشاد دکلانچوی، وقت کی ضرورت، ایضاً ۲ جولائی ۱۹۴۷ء ص ۱-

46. نیشنل کالج کراچی، بحوالہ سابقہ، ص ۳۳۳ -

47. ممتاز لیاقت، شہزادہ مامون الرشید کی داستان حیات ہفت روزہ سیرت، لاہور ۲۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء، ص ۱۱-

48. نیشنل کالج کراچی، بحوالہ سابقہ ص ۳۳۴ -

49. لیری کولنس دراتک لیپر، دی فریڈم ایٹ مڈنائٹ، (مترجم سعید سہروردی) سری نگر بن ندارد ص ۱۵۱-۱۵۲ -

50. نیشنل ڈاکومنٹری سنٹر، دی پارٹیشن آف دی پنجاب، ۱۹۴۷ء، (جلد اول)، لاہور، ۱۹۸۳ء ص ۸۱-

51. آئی ایچ قریشی، بحوالہ سابقہ ص ۲۲۶ -

52. شہاب دہلوی، بہاول پور کی سیاسی تاریخ ج ۱۴۳-۱۴۴-

53. انٹرولو، کرنل معتصم باللہ، ۱۵ جولائی ۱۹۹۰ء، بمقام بہاولپور۔

54. شیخ احمد دین، چولستان کے ریگ زار میں تربیلا کے پانی کے اثرات، الزبیر (چولستان نمبر) جون ۱۹۷۹ء، ص ۱۷۳-

55. محمد قمر الزمان عباسی، حوالہ سابقہ ۱۷۳-

56. ہیکٹر بولاکھو، حوالہ سابقہ ص ۲۸۸ -

57. محمد قمر الزمان عباسی، بحوالہ سابقہ ص ۱۴۰ -

58. لیری کولنس درانگ لیپر، بحوالہ سابقہ ص ۱۵۸-

59. انٹرولو، اعبد الرحمن (ہیڈ مکینک موٹر خانہ صادق گڑھ پیلیس) ۲۰ جون ۱۹۹۲ء، بمقام احمد پور شرقیہ۔

60. جی الا انہ، حوالہ سابقہ ص۵۹۹

61. ممتاز لیاقت، حوالہ سابقہ میں

62. سعید ہاشمی، بحوالہ سابقہ ص۷۸ -

63. مجد قمر الزمان عباسی، بحوالہ سابقہ، فوٹو سرورق۔

64. انٹرویو مد نصیر خان (سابق ملازم محکمہ تصریفات، ریاست بہاول پور) ۲۰ جون ۱۹۹۳ء، بمقام ڈیرہ نواب صاحب۔

65. متاز لیاقت، حوالہ سابقہ ۱۵۲۰ -

66. محمد قمر الزمان عباسی، حوالہ سابقہ ۱۵۲۰ -

67. سید قاسم محمود، قائد اعظم کا پیغام، لاہور، ۱۹۷۲ء ص۲۱۵ -۲۱۲ -

68. محمد قمر الزمان عباسی، حوالہ سابقہ ص ۱۵۴ -۱۵۷ -

69. ایضاً ص ۱۴۲ -

70. سعید ہاشمی، بحوالہ سابقہ ص۷۹ -

71. محافظ خانہ بہاول پور، فائل معاہدات، پہلا معاہدہ الحاق مابین صادق محمد خان خامس و گورنر جزل پاکستان، اکتوبر ۱۹۴۷ء -

72. رچرڈ سائمنڈ، حوالہ سابقہ ص ۹۰ -

73. محمد قمر الزمان عباسی، بحوالہ سابقہ ص۱۴۸ -

74. سعید ہاشمی، بحوالہ سابقہ ص۷۸ -

75. پاکستان ٹائمز، ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۷، ص ۱

76. محمد قمر الزمان عباسی، بحوالہ سابقہ ص ۱۵۵۔

77. سعید ہاشمی، بحوالہ سابقہ ص ۷۹-۸۰۔

78. ایضاً ۸۰۔

79. نوائے مسلم عشرہ دار، بہاول پور، ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء ص ۱۔

80. ایضاً، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸، ج ۱۔

81. ایضاً، ۲۷ ستمبر، ۱۹۴۸ء ص ۱۔

82. الہام (فت روزہ) بہاول پور، ۲۸ جون ۱۹۵۰ء ۱۔

83. ایضاً، ۲۱ ستمبر ۱۹۵۰، ص ۱۔

84. تفصیل کے لئے استفادہ کیجئے "ریاست بہاول پور کی علمی فیاضیاں"، مولوی دین محمد، میونسپل گزٹ لاہور، (صادق نمبر) لاہور، ۱۹۳۰، ص ۵۴-۵۲۔

درگاہ چاچڑاں شریف اور دربار بہاول پور کے باہمی تعلقات کا جائزہ

دستاویزات بہاول پور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے ہی امیران بہاول پور کی نظر میں درگاہ چاچڑاں شریف مذہبی قیادت وسیادت کا درجہ رکھتی تھی۔ اُس کے جواب یہاں کے سجادہ نشین بزرگان، اُن کے متولین اور وابستگان کی طرف سے یہاں کے داؤدپوترہ عباسی حکمرانوں کے حق میں دعا اور خیر خواہی کی صورت میں تائید وحمایت کا فیض جاری رہا۔

اس کا عملی مظاہرہ اُس وقت سامنے آیا جب 1866ء میں نواب صادق محمد خان رانی کم سنی میں مسند نشین کیسے گئے۔ اس موقع پر ان کے مقابلے میں انہی کے ایک رشتہ دار صاجزادہ جعفر خان نے بغاوت کی، قلعہ ڈیرا اور پر قبضہ کر کے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور شاہی خزانے کو بے دریغ اپنے حامیوں میں لٹانا شروع کر دیا۔ یہی وہ موقع تھا جب اس بغاوت کو 1866 - فرو کرنے کے لیے سب سے پہلے چاچڑاں شریف سے خواجہ برکت علی منشی نے 27 مارچ 1966ء کو ایک خط کے ذریعے سید مراد شاہ گردیزی نیٹو ایجنٹ ریاست بہاول پور کی توجہ مبذول کرائی۔ اس کے جواب میں سید مراد شاہ گردیزی نے انگریزی حکومت سے مداخلت کی درخواست کی اور یوں ننھے نواب صادق محمد خاں رابع کی گدی کو بچایا گیا۔ بقیہ اس کے پس پشت حضرت خواجہ غلام فخر الدین کی ذات بابرکات کا عمل دخل تھا۔ یہی وہ اولین تاثر تھا جس کے بعد سے نواب صادق محمد خاں رابع اور ر ان کے جانشینوں کے دلوں میں اس بزرگ خانوادے کی عزت ہمیشہ کے لیے مرتسم ہوئی۔ امیران بہاپلور نے حضرت خواجہ غلام فخر الدین حضرت خواجہ غلام فرید اور مابعد کے تمام سجادہ نشینوں کو دربار میں کرسی نشینی کا اعلیٰ اعزاز بخشا، عدالتوں کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا، دار لحکومت بہاولپور اور ڈیرہ نواب میں آمد ورفت کے وقت شاہی مہمان تصور کیا جاتا تھا، سرکاری تقریبات کے انعقاد کے وقت دربار میں نمایاں جگہ پر نشست پیش کی جاتی تھی اور بیش بہا خلعتیں پیش کی جاتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ بہاول

پور کے صادق الاخبار اور سرکاری گزٹ میں بزرگان چاچڑاں شریف سے متعلق خبروں کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ مثلاً جب حضرت خواجہ فخر الدین صاحب سجادہ نشین کا وصال ہوا اور حضرت خواجہ غلام فرید کی دستار بندی ہوئی تو 7 اگست 1871ء کے صادق الاخبار میں اس خبر کو انتہائی رنج و افسوس کے تاثر سے چھاپا گیا اور اس واقع کی یاد میں اخبار کے اڈیٹر سید مہر شاہ نے تاریخ نکالی کہ

صاحب عرفان زمان فخر دین — سمت بقا چونکہ عزیمت نمود

ہاتف غیب از پی تاریخ اُو — اُدل خُلدی باید گفت زود

حضرت خواجہ غلام فرید کے لیے نواب صادق محمد خان رابع کے دل میں جو عزت و احترام کے جذبات موجزن تھے۔ ان کا عملی مظاہرہ عوام الناس کو دیکھنے کو اُس وقت ملتا جب حضرت خواجہ صاحب بذریعہ ٹرین بہاول پور پہنچتے۔ مثلا 19 مئی 1886ء کو حضرت خواجہ صاحب جب اجمیر شریف کی زیارت کے بعد ٹرین کے ذریعے بہاول پور پہنچے تو نواب صاحب نے خود اسٹیشن پہنچ کر پیشوائی کی اور اپنے ساتھ بگھی پر سوار کر کے دولت خانہ بہال پور میں لائے۔ اس دوران آپ نے چھ یوم تک وہاں قیام کیا اور 22 مئی 1885ء کو دولت خان بہاول پور کی نو تعمیر شدہ جامع مسجد میں نماز جمعہ کی امامت کرائی اور 25 مئی 1885ء کو چاچڑاں شریف کے لیے روانہ ہوئے سال 1885 ء کے صادق الاخبار کی فائیل کے مطالعے سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب اک سال تقریباً ہر ماہ چاچڑاں شریف سے بہاول پور کا سفر کرتے رہے یقیناً آپ کی آمد اپنے نو عمر مرید اور بہاول پور کے حکمران کو روحانی تربیت اور اس سے بڑھ کر اُسے راہ راست پر رکھنے کے سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

اس سفر یہاں پور کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ جولائی 1885ء میں خواجہ صاحب خصوصیت سے امام کعبہ سید عبد القادر مکی سے ملاقات کے لیے بہاول پور آئے۔ امام صاحب اپنے سفر سیاحت کے دوران

حیدرآباد اور رام پور سے ہوتے ہوئے برصغیر کی اس اہم اسلامی ریاست بہاول پور پہنچے تھے۔ سید صاحب کو حضرت خواجہ صاحب کے نواب صاحب سے تعلق خاطر کا اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تمام تبرکات اور تحائف جن میں غلاف کعبہ جیسا عظیم تحفہ بھی شامل تھا، خواجہ صاحب کے توسط سے نواب صادق محمد خان رابع کو مرحمت کیا۔

حضرت خوجہ غلام فرید کا یہ فیض نواب صاحب اور اہلیانِ بہاول پور کے لیے تواتر سے قائم رہا۔ حتی کہ 27 جون 1892ء کو حضرت خواجہ نے عوام کو شرف قدم بوی بخشا۔ اس طرح بہاول پور کو خواجہ صاحب کی پذیرائی کا ایک اور موقع 2 مارچ 1894ء کو ملا۔ جب نواب صاحب وزیر عظم تمام افسران بالا اور عوام الناس نے ریلوے اسٹیشن پر آپ کا شاندار استقبال کیا اور بڑے تزک و احتشام سے آپ کو دولت خانہ بہاول پور کے محل میں فروکش کرایا گیا۔

خواجہ صاحب کی زندگی کا انتہائی نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ نے نواب صاحب سے اس قدر ربط وضبط کے باوجود اُن سے کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں کہا۔ بلکہ 1890ء میں نواب صاحب کو خود معلوم ہوا کہ لنگر وغیرہ کے اخراجات کے سلسلے میں آپ کے پیر و مرشد چار ہزار روپے کے مقروض ہو چکے ہیں تو نواب صاحب نے بذات خولاد یہ قرض سرکاری خزانے سے ادا کرنے کا حکم دیا۔ اسطرح حضرت خواجہ صاحب کے 1896ء میں وزیر اعظم بہاول پور اور مشیر تصریفات کو لکھے جانے والے بعض خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ضرورت مند افراد کی امداد اور تیل اور چراغ کے ماہانہ معاملات کی بحالی کے لیے۔ تحریر کیے گئے۔ نواب صادق محمد خاں رابع ایسے تمام خطوط کی فوری طور پر پذیرائی کرتے تھے۔

امیر ان بہاولپور اور سجادہ نشین دربار چاچڑاں شریف کے درمیان ان روحانی تعلقات نے انتہائی محبت اور خیر خواہی کی صورت ختیار کر لی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اور سجادہ شینی،جائیداد کی تقسیم اور وراثت کے فیصلوں کے سلسے میں امیر ان بہادپور اہم کردار ادا کرتے تھے۔

ریاست بہاولپور کی علمی خدمات کا جائزہ

موضوع زیر بحث متنوع پہلوؤں کا حامل ہے اس کا بنیادی مقصد خطہ بہاول پور میں طلوع اسلام کے آغاز سے ہونے والی علمی سرگرمیوں کا مطالعہ ہے جس کی ابتداء بزرگان دین اور مشائخ کرام کی توجہ سے ممکن ہوئی۔ انہی نفوس ذکیہ کی بدولت مساجد و خانقاہوں سے متصل مدارس کا سلسلہ جاری ہوا۔ یہ دین اور علوم اسلامیہ کی ترویج کے وہ اولین مراکز تھے جن کی ضیاپاشیوں نے پورے برصغیر کو منور و تاباں کیا اور یہ سب کچھ تعلیم و تعلم کے ایک باقائدہ نظام کے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہ اس خطے کی خوش بختی تھی کہ اسے علی الترتیب علماء کرام کے ساتھ ساتھ علم دوست و علم پرور سلاطین اور امیران بہاول پور کی بھرپور معاونت بھی حاصل رہی۔ اسلامی دنیا اور برصغیر کے مختلف علاقوں سے علماء و فضلاء کی آمد و رفت اور حکومتی مرکز کے قیام کی بدولت اسی خطے میں متعدد مقامی و غیر مقامی زبانیں بھی مروج رہیں، جن میں عربی، فارسی، اردو اور بہاول پوری زبان (ریاستی یا سرائیکی) ذریعہ تعلیم رہیں اور انہیں درباری نشست و برخاست نے نئی جہتوں۔ روشناس کرایا۔ موضوع کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالہ میں ریاست کے قیام سے قبل اور مابعد اس خطہ میں ان علماء و مشائخ کے تذکرہ کو عصری ترتیب سے بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اشاعت اسلام کے علاوہ علمی مدارس کے قیام و تدریسی سرگرمیوں سے اس علاقہ کو منور کیا۔ علماء کرام کے تذکرہ کے بعد ریاست کے امیران کی علمی سرگرمیوں کو بھی زمانی ترتیب و تسلسل سے تحریر کیا گیا ہے۔ مضمون زیر نظر میں ان تمام علمی و لسانی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے جو اس خطہ میں ۱۸۶۶ء سے پہلے انگریزی دیدبد نظام نام سے قبل رائج تھیں۔

سرزمین بہاول پور زمانہ قدیم سے عظیم علمی پس منظر کی حامل رہی ہے جس کا اندازہ اس خطہ میں پائے جانے والے ان آثار رفتہ سے لگایا جاسکتا ہے جو اس کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔

عصری اعتبار سے ان دانشگاہوں میں سب سے قدیم ضلع رحیم یار خان میں واقع پٹن منارا" ہے۔ جس کے بارے میں روایت ہے کہ سکندر اعظم مقدونی کی اس خطہ میں آمد کے دوران یہ درس گاہ تعمیر ہوئی۔(1) اسی طرح بہاول پور شہر سے کچھ فاصلے پر سوئی وہار" کے مقام پر کنشکا کے دور کی ایک دانشگاہ ۸۹ء میں بدھ مت کی تعلیم و تربیت کے لیے قائم تھی۔(2) جس کے آثار ایک نکتہ سٹوپا کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ "باب الاسلام سندھ" سے متصل ہونے کی وجہ سے خطہ بہاول پور کو برصغیر میں اشاعت اسلام اور دینی علوم کی ترویج واشاعت کے ابتدائی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس وقت اس علاقے کا مرکز و محور خطہ پاک اُوچ تھا جسے مذہبی لحاظ سے مشائخ کے اکثر سلسلوں کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے بزرگ حضرت شیخ صفی الدین گاذرونی "کا ذکر ملتا ہے جو ۹۸۰ء میں بغداد سے اوچ تشریف لائے اور اس علاقے کو علمی و مذہبی مرکز کی حیثیت دی۔ آپ کے دور میں اوچ کے عظیم الشان دارالعلوم میں تقریباً آڑھائی ہزار طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ "دار لعلوم فیروزیہ "ہی ہو گا جسے سندھ کے سومرہ خاندانوں کے حکمرانوں نے اپنے عہدِ حکمرانی (۱۰۳۲-۱۳۵۱ء) میں قائم کیا۔ چونکہ اس خاندان کے حکمرانوں کا لقب " ملک فیروز" ہوتا تھا شاید وہی اس کے بانی ہوں گے اور مدرسہ فیروزیہ سے مراد شاہی مدرسہ ہو گا۔ اس مدرسے کے نصاب میں فقہ، اصول فقہ، تصوف، علم الکلام، معنی دبیان اور تفسیر وحدیث کی کتب شامل تھیں۔(3) سلطان شہاب الدین محمد غوری (۱۱۷۵-۱۲۰۶ء) نے اپنے دور میں اس درسگاہ کے اخراجات کے لیے وقف کا بندوبست بھی کیا۔(4) اس کے دور میں جہاں ایک طرف قطب الدین ایبک (۱۱۹۲ء۔۱۲۱۹ء) دہلی کا گورنر مقرر ہوا تو دوسری طرف ناصر الدین قباچہ (۱۲۰۶ء۔۱۲۲۸ء) کو سندھ اور مارواڑ کے علاقے سپرد کیے گئے۔ اپنے اقتدار کے دوران قباچہ نے اوچ کو اپنا دار السلطنت بنایا۔(5) اس دور میں تاتاریوں کے ہاتھوں وسط ایشیاء اور مشرق

وسطیٰ کی سلطنتیں زیروزبر ہوئیں تو ان علاقوں کے بیشتر خانوادوں اور علماء وفضلاء نے قباچہ کے دربار سے وابستگی اختیار کی۔ اس دور میں اوچ کو برصغیر کے سب سے بڑے علمی و دینی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس دور میں مشہور تصنیف " طبقات ناصری "کے مصنف قاضی منہاج الدین سراج(پیدائش ۱۱۹۳ء) بھی غزنہ اور ملتان کے راستے اُوچ پہنچے جہاں انہیں نومبر ۱۲۲۷ءمیں مدرسہ فیروزیہ کا مہتم مقرر کیا گیا۔(6) ناصر الدین قباچہ کے دور کی ایک اور علمی شخصیت علی کوفی (پیدائش ۱۱۶۰ء)ہیں جنہوں نے سندھ کی تاریخ پر پہلی مستند کتاب " فتح نامہ "کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بعد ازاں " چچ نامہ "کے نام سے موسوم ہوئی۔(7) اوچ کو اپنے روحانی و علمی فیوض سے بہرہ ور کرنے والے ابتدائی مشائخ میں سلسلۂ سُہروردیہ کے مشہور بزرگ سید جلال الدین غازی (۱۱۹۸-۱۲۹۱ء) سرفہرست ہیں جو ۱۲۴۲ء کے لگ بھگ ملتان سے اوچ میں مقیم ہوئے۔ آپ کی کوششوں سے اس علاقے میں اسلام کی روشنی پھیلی۔ آپ نے اپنی آمد کے بعد یہاں مشہور درسگاہ قائم کی جو " خانقاہِ جلالیہ "کے نام سے مشہور ہوئی جس میں خود آپ اور آپ کے بعد آپ کے فرزند سید احمد کبیر نے درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ اس مدرسے کے نصاب میں تفسیر، صحاح ستہ، مشارق الانوار، شرح کبیر، مشکوۃ مصابیح، فقہ اکبر، صرف و نحو اور اخت وادب کی کتب شامل تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ آپ کے اہل خانہ اور شاگردوں کی معرفت جاری رہا۔ آپ کی خانقاہ نواب محمد بہاول خان ثالث بالخیر(۱۸۲۵ء - ۱۸۵۲ء)نے تعمیر کروائی۔ (8)

اوچ کا ایک اور مشہور مدرسہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت (۱۳۰۸ء ۱۳۸۴ء) کے استاد قاضی بہاؤ الدین اوچی نے " بہائیہ "کے نام سے قائم کیا۔ اس دور میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے علم و فضل اور ظاہری و باطنی فیوض کی وجہ سے سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵ - ۱۳۵۲ء) نے آپ کو شیخ

الاسلام کا عہدہ دیا اور چالیس خانقاہیں آپ کی تحویل میں دیں لیکن آپ نے حدیث مبارک "عالم بنو، طالب بنو، علم کی باتیں سنتے رہو اور اہل علم سے محبت کرتے رہو" پر عمل کرتے ہوئے یہ ظاہری شان وشوکت قبول نہ فرمائی اور تحصیل علم کے لیے صحرانوردی پر ہی اکتفا کیا، جس کی بناء پر آپ کو جہانیاں جہاں گشت کا لقب دیا گیا۔ (9) آپ کی ذاتِ بابرکات ایک چلتے پھرتے دار العلم کا درجہ رکھتی تھی خصوصی طور پر اوچ میں اہل علم وفضل کے گروہ در گروہ ان سے استفادہ کرتے اور طلباء اور مریدین ان کو گھیرے رہتے۔ آپ کے ہمعصر ایک اور بزرگ حضرت سید حسن کبیر (۱۳۱۷ء۔ ۱۴۹۱ء) نے بھی ایک مثالی اور امتیازی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح خانوادہ گیلانی کے سید محمد غوث حلبی (وفات ۱۵۱۷ء) جو ۱۳۸۲ء میں اوچ تشریف لائے، کی درسگاہ بھی خصوصی اہمیت کی حامل تھی۔ اوچ میں مدرسہ فیروزیہ کے پائے کی ایک اور مشہور درسگاہ شیخ جمال خنداں رو (وفات ۱۳۲۵ء) کی خانقاہ تھی۔ اس مدرسے کے مہتمم شیخ جمال کے بعد ان کے بیٹے شیخ رضی الدین گنج عالم (۱۳۶۸ - ۱۳۶۸ء) مقرر ہوئے۔ ان کے دور میں اس مدرسے نے ترقی کی مزید منازل طے کیں۔ اس میں ہدایہ، بذوری، مشارق الانوار، مشکواۃ مصابیح اور عوارف المعارف جیسی کتب کا درس دیا جاتا تھا۔ (10) سلاطین دہلی کے دور میں علمی و دینی قدر و منزلت کے اعتبار سے اوچ کو "قُبتہ الاسلام" کی حیثیت حاصل تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس دور میں اوچ کی اہمیت کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"گویند زمین اوچ و صحرائے او کیفیتے وحالتے دارد کہ در زمین ہائے دیگر نیست" (11)

جہاں تک خطہ بہاول پور کے دوسرے علاقوں کی علمی سرگرمیوں کا تعلق ہے، ان میں ریاست کے غربی علاقہ خان پور میں ججہ عباسیاں کے مقام پر شیخ جنید نامی بزرگ کا ذکر ملتا ہے، جو تیرھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی خانقاہ کے ساتھ منسلک ایک مدرسہ تسلسل کے ساتھ اب تک

قائم ہے۔(12) اسی طرح ضلع رحیم یار خان کے مضافات میں مؤ مبارک کے مقام پر ایک قدیم قامہ کے آثار ہیں جسے رائے ساہسی نے تعمیر کروایا تھا۔ اس جگہ سلطان حمید الدین حاکم (وفات ۱۳۴۹ء) جو مکر ان کے حکمر ان تھے، ترک دنیا فرما کر درویشی کے مسلک پر گامزن ہوئے۔ آپ بغداد میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی، لاہور میں سید احمد توختہ اور ملتان میں حضرت بہاؤ الحق زکریا(۱۱۷۱ء - ۱۲۶۷ء) اور شاہ رکن عالم (۱۲۴۱ء - ۱۳۳۴ء) سے سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد مؤ مبارک کے مقام پر مقیم ہوئے۔ آپ دینی علوم اور تصوف کے عالم تھے اسی نسبت سے آپ نے تصوف کے موضوع پر فارسی ملفوظات "گلزارِ حمیدیہ" کے نام سے تصنیف کیے۔ (13)

اسی طرح شہر بہاول پور کے قرب وجوار میں بھی ایسے بزرگوں کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے اپنی علمی و مذہبی کاوشوں سے حکومت کے عدیم الفرصتی کے احساس کو کم کیا۔ ان میں حضرت خواجہ محکم الد ین سیر انی (۱۲۴۱ء - ۱۳۳۴ء) کا نام نامی سر فہرست ہے۔ آپ نے اپنی تعلیم لاہور اور دہلی کے مشائخ سے حاصل کی۔ اپنے قیام بہاول پور کے دوران آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا آپ کا تبحر علمی اس قدر مسلمہ تھا کہ قرب و جوار کے طالب علم بھی آپ سے فیض یاب ہونے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ خصوصاً بہاول پور کے مدرسۂ عربیہ کے طالب علموں کو جب بھی کوئی تعلیمی مشکل پیش آتی تو وہ آپ سے مستفید ہوتے تھے۔ آپ نے چند کتب بھی تحریر کیں جن میں شرح رموزات، احسن الاسرار الموسوم بہ تلقین لدنی، شامل ہیں۔ آپ ملتان کے نواب مظفر نان (۱۷۷۹ء-۱۸۱۸ء) اور ریاست بہاول پور کے چار امیر ان کے ہم عصر رہے لیکن آپ نے علمی معاونت کے سلسلے میں ان حکمر انوں سے کبھی بھی کوئی وظیفہ قبول کرنا پسند نہیں کیا۔ البتہ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی تو انہیں خوف خدا اور عدل و انصاف کی تلقین ضرور کرتے تھے۔(14)

بہاول پور شہر کے ایک اور مشہور بزرگ نور شاہ بخاری ہیں، جن کا دینی مدرسہ درس و تدریس کا ایک مرکز تھا۔

خطۂ بہاول پور کے مشرقی علاقہ کے ایک اور مشہور بزرگ خواجہ نور محمد مہاروی (۱۷۲۹ء۔۱۷۹۱ء) ہیں جو ریاست کے تمام مضافات میں مدرسہ روحانیت کے معلم اولیس سمجھے جاتے ہیں۔(15) آپ نے کئی برس تک خواجہ فخر الدین دہلوی سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے بے شمار لوگوں کی تعلیم و تربیت کی، شریعت و طریقت کا درس دیا اور ان کی کردار سازی کی۔ آپ نے عالموں اور صالح بندوں کی ایک جماعت تیار کی جنھوں نے علوم دینیہ کی روشنی سے اس خطہ کو منور کیا۔ بہاول پور کے علاقہ بہادل گڑھ (موجودہ ضلع بہاولنگر) کے مولوی اللہ بخش کا ذکر بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ جنھوں نے مولانا شاہ عبد الرحیم سے دہلی میں زانوئے تلمذ طے کیا۔(16) آپ کچھ عرصہ وہیں مدرس رہے اور اس کے بعد بہاول گڑھ واپس تشریف لا کر مسلمانوں کی دینی اصلاح و اشاعتِ تعلیم کے تسلسلے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے ایک دینیات کا مدرسہ قائم کیا اور دیگر دینی درس گاہوں کی بنیاد رکھی جہاں درس و تدریس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ریاست کے مشرقی علاقے خیر پور کے ایک نامور بزرگ حضرت خواجہ خدا بخش (۱۷۳۷ء-۱۸۳4ء) ہیں۔ آپ نے ابتدائی طور مشائخِ ملتان سے اکتساب علم کیا اور بعد ازاں مدرر حیمیہ میں شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳-۱۷62ء) سے فیض حاصل کیا۔ ملتان پر سکھوں کی یلغار کے بعد دوسرے علماء وصلحاء کے ساتھ آپ بہاول پور تشریف فرما ہوئے اور نواب صادق محمد خاں ثانی (۱۸۰۹ - ۱۸۲۵ء) کی درخواست پر آپ نے خیر پور میں مستقل قیام فرمایا۔ آپ کے لنگر اور مدرسے کا تمام خرچ ریاستی خزانے سے پورا ہوتا تھا۔(17) آپ کے قیام کی بدولت علاقہ خیر پور درس و تدریس کا ایک مرکز بن گیا۔ دور دراز کے علاوہ یہاں پہنچنے لگے۔ آپ کی ساری زندگی درس و تدریس میں

گزری۔ آپ کے مدرسے میں جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی ان میں تفسیر، حدیث وفقہ، عقائد علم ہیئت ، صرف و نحو اور منطق و معنی شامل تھے۔ آپ کی دو تصانیف ذوقیہ اور توفیقیہ " کے نام سے مشہور ہیں۔(18) جو علم توحید پر ایک گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خطۂ بہاول پور کے ایک اور نامور بزرگ خواجہ قاضی محمد عاقل (وفات ۱۸۱۴ء)ہیں۔وہ حضرت خواجہ غلام فرید (۱۸۴۵ء۔۱۹۰۱ء) کے جد امجد، ایک برگزیدہ عالم اور باکمال صوفی تھے۔ آپ امیر محمد مبارک خان ثانی (۱۷۴۹ء۔ ۱۷۷۲ء) اور امیر صادق محمد خان ثانی (۱۸۰۹ - ۱۸۲۵ء) کے ہمعصر تھے۔ آپ نے خواجہ نور محمد مہاروی کی ہمراہی میں دہلی کے سلسلہ چشتیہ کے بزرگ خواجہ فخر الدین دہلوی سے دو دفعہ ملاقات کی۔ دہلی میں ان کی ملاقات مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی (۱۷۰۶ء ۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ء۔۱۸۵۷ء) سے ہوئی جن کا ذکر خود بہادر شاہ ظفر نے کیا ہے۔

" صحبت پیر مغاں ہم کو خوش آئی ہے بہ دل
ہم ہیں عاقل رابطِ عاقل سے دلی رکھتے ہیں "(19)

مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی خواجہ محمد عاقل کی بزرگی وعلم سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں شہزادہ جہاں خسرو اور کاؤس شکوہ کو آپ کا مرید بنایا۔(20) بہاول پور میں خواجہ محمد عاقل نے کوٹ مٹھن اور چاچڑاں شریف میں مدرسے قائم کیے، جہاں جلیل القدر علمائے القدر علمائے کہ: ہم آپ کی سرپرستی میں درس و تدریس کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔ یہاں علماء و طلباء کو قیام وطعام کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ بعد ازاں جب خواجہ محمد عاقل کوٹ مٹھن سے شیدانی (تحصیل لیاقت پور) تشریف لے گئے تو وہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان مدارس کے نصاب میں مشکوٰۃ شریف، احیاء العلوم، صحیح بخاری، شرح قصائد، سواء السبیل، فصوص الحکم وغیرہ کتب شامل تھیں۔" ان مدارس میں خواجہ صاحب بذات خود نماز ظہر کے بعد درس دیتے تھے۔ والیانِ ریاست کی طرف

سے پینتیس ہزار بیگہ پختہ اراضی بطور اوقاف مختص تھی۔(22) اس علمی خانوادے سے امیر ان بہاول پور کو اس قدر عقیدت تھی کہ اس سلسلے کے مشہور بزرگ خواجہ غلام فرید کی تعلیم و تربیت نواب فتح محمد خان (۱۸۵۳ء۔۱۸۵۸ء) کی خواہش پر شاہی سرپرستی میں احمد پور شرقیہ میں کی گئی۔ نواب موصوف وقتاً فوقتاً نو عمر خواجہ صاحب کی علمی تربیت کا جائزہ بذاتِ خود لیتے رہتے تھے۔(23) خواجہ محمد عاقل کے ایک نامور مرید اور شاگرد خواجہ گل محمد (۱۷۵۵ء-۱۸۲۷ء) نے بھی احمد پور شرقیہ میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جس میں نادار طلباء کے لیے لنگر کا انتظام بھی کیا گیا۔(24) "آپ اپنے خاندان کے ہمراہ اوچ میں رہائش پذیر تھے کہ نواب صادق محمد خان ثانی کی فرمائش پر اوچ سے احمد پور شرقیہ تشریف لائے اور پھر ہمیشہ کے لیے یہیں مقیم ہو گئے اور لوگ آپ کے علم سے مستفید ہوتے رہے۔ آپ کا قائم کردہ مدرسہ آج بھی موجود ہے آپ کی ایک بڑی علمی و دینی خدمت "تکملہ سیر الاولیاء" ہے جس میں مشہور مشائخ و صوفیائے کرام کا ذکر ملتا ہے۔

اوچ کے سلسلہ چشتیہ کے ایک مشہور صوفی بزرگ مولانا غوث بخش جو حضرت شیخ معروف کرخی کے خاندان سے تھے نواب محمد بہاول خان ثالث (۱۸۲۵ء۔۱۸۵۲ء) کے ہمعصر تھے۔ آپ کی علمی یادگار "تحفہ غوثیہ" کے نام سے مشہور ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب خواص الادویہ سے متعلق ہے جس کی زبان فارسی ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ ادویات کی فہرست بہاول پوری (سرائیکی) زبان میں مرتب کی گئی ہے۔(25) یہ کتاب ایک مخطوطے کی شکل میں صادق گڑھ پیلس کے شاہی کتب خانے میں محفوظ تھی۔

ریاست بہاول پور میں بہت سے دینی مدارس باقاعدہ طور پر جاری تھے ان میں بستی مولویاں علاقہ خان پور کٹورہ کا مدرسہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی بستی سے متصل دین پور شریف کا قیام عمل میں آیا۔ جسے ریاست بہاول پور میں تحریک ریشمی رومال کے ایک مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس

کے بانی مولانا غلام محمد (۱۸۳۵ء۔۱۹۳۵ء) کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ میں ہوئی یہاں فارسی اور عربی زبان کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔(26) دین پور شریف کا قیام ۱۸۷۶ء کے لگ بھگ ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے باطنی و ظاہری علوم کا ایک بڑا مرکز بن گیا جہاں ظاہری و شرعی تعلیم کے ساتھ ساتھ روحانی تعلیم و تربیت اور تزکیہ ء نفس کا ایک عظیم الشان ادارہ قائم ہوا۔ یہاں حضرت شاہ ولی اللہ کے افکارو نظریات کی بنیاد پر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا گیا، جس میں احکام شرعی کے نفاذ کے ساتھ ساتھ ایک فلاحی ریاست کا تصور بھی موجود تھا۔ اس مدرسے سے متصل ایک مستقل لنگر قائم کیا گیا۔ اس مدرسہ میں ۱۸۸۸ء میں نوعمر مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء) نے قبول اسلام کے بعد ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔(27) اس مدرسہ میں مولانا عبید اللہ کی آمد اور تعلیم کس طرح ہوئی اس کا ذکر وہ اپنی ذاتی ڈائری میں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ:

> "پھر چونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بہاول پور کی دیہاتی مسجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل و حرکت میں دین پور پہنچا جہاں سید العارفین خلیفہ اول مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔" ہدایتہ النحو "تک کتاب میں میں نے یہیں مولوی عبد القادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا وہ آگئیں اور واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا مگر میں الحمد اللہ ثابت قدم رہا۔ (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچیں) شوال ۱۳۰۵ء میں دین پور متصل خان پور کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ (ذاتی ڈائری ص ۱۳) (28)

مغل حکومت کے دور زوال میں اس خطہ کی اس علمی و مذہبی اہمیت کے جلو میں یہاں پر عباسی داؤد پوتروں نے 1727ء میں اپنی ریاست کی بنیاد رکھی۔ ان امیر ان کا سلسلہ نسب خلفائے بنوعباس سے منسوب ہے۔ خلافت عباسیہ کے دور میں عالم اسلام کو جس قدر علمی ترقی نصیب ہوئی اس سے زیادہ ان کی علمی کاوشوں کی بدولت یورپ میں جہالت کے اندھیرے روشن ہوئے جس کی مرہون منت یورپ کی تحریک احیائے علوم ہے اور جس کا اعتراف خود اہل مغرب کو بھی ہے۔ اپنے اس شہرہ آفاق خاندانی پس منظر کے ناطے امیر ان بہاول پور کو اپنی مذہبی و علمی سیادت کا ہمیشہ پاس رہا۔ جس کا عملی مظاہرہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں بڑھ چڑھ کر کیا۔ جہاں تک امیر ان بہاول پور کے تحت اس خطہ کی علمی سرگرمیوں کا تعلق ہے ابتدائی امیر ان کا دور ریاست کے قیام کی جدوجہد اور استحکام کی نظر رہا۔ البتہ نواب محمد بہاول خان ثانی (۱۷۷۲ء۔۱۸۰۹ء) وہ پہلے حکمران تھے، جن کے دربار سے متعدد علمی شخصیات کی وابستگی کا ذکر ملتا ہے۔ جس کا اندازہ اس کی طرف سے لکھے جانے والے ان فارسی زبان کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے، جو تیمور شاہ درانی (۱۷۷۳ء-۱۷۹۳ء) نے والئی کابل کو لکھے۔ ان خطوط کی زبان انتہائی مقفٰی و مسجع ہے جن میں فارسی کے اشعار و قرآنی آیات کے حوالے بھی ملتے ہیں:

"چون مستوفیاں دفتر قضا و قدر و متصدیان دیوان سرائے ارادت اللہ ہموارہ و تدارک امضائے فرمان واجب الاذعان ماشاء اللہ کان ومالم یشالم یکن متوجہ بودہ برعایت داب عالم واسباب اول موجی پدید آرند کہ بر دعوی یفعل اللہ مایشاء ویحکم مایرید۔ سردار مود خان دمیاں عبد النبی کہ در الوقت خوں جگر می خوردند درہماں قلعہ ڈیراور کہ مامن ومعاذ ایشان بود جابجا اند۔"

جبرے نکردہ ایم وکسی رانگشتہ ایم

این بس خطا کہ عاشق روی تو گشتہ ایم (29)

مذکورہ نواب کے دور میں ریاست بہاول پور کی تاریخ کے بارے میں پہلی کتاب "مراۃ دولت عباسیہ" لالہ دولت رائے ولد لالہ عزت رائے نے ۱۸۰۰ء کے قریب لکھی۔(30) مصنف اور ان کے والد دونوں دربار بہاول پور سے مسلک تھے اور اپنی علمی لیاقت کی وجہ سے ابطور وکلاء (سفیر) بیرونی ریاستوں میں بھیجے جاتے تھے۔(31) اسی نواب کے دور میں ۱۷۷۹ء میں مولوی حفظ الاسلام اور موادی عین الدین مع اپنے دو بیٹوں مولوی امام الدین اور مولوی غلام الدین بہاول پور تشریف لائے ان علماءِ کرام نے اپنے وجود سعید سے بہاول پور کے طول و عرض کو روشن کیا۔ ان حضرات کی علمی و مذہبی کاوشوں کی بدولت امیر ان بہاول پور نے ریاست کا منصب قضاۃ اسی خاندان کو تفویض کر دیا۔ یہ منصب اسی خاندان کے پاس ریاست کے پاکستان سے الحاق کے بعد تک رہا۔ بہاول پور شہر میں محلہ قاضیاں اسی خاندان کے نام سے منسوب ہے۔ ریاست کے اگلے نواب صادق محمد خان ثانی (۱۸۰۹ء۔ ۱۸۲۵ء) نے بھی اپنے دور میں علمی سرپرستی جاری رکھی۔ مسند نشین ہونے کے بعد اراکین ریاست کا تقرر کیا تو شاہی اتالیق کا منصب مولوی شیر علی کو دیا اور بطور تاریخ نویس مولوی محمد اعظم کو مقرر کیا۔ یہ وہی مولوی محمد اعظم تھے جنہوں نے فارسی زبان میں بہاول پور کی تاریخ" تذکرۃ الخوانین المعروف جواہر عباسیہ" تحریر کی، جس کی کتابت ۱۸۳۸ء میں ہوئی۔(32) مولوی محمد اعظم کی دیگر تصانیف میں منیر اعظم، دیوان اعظم (فارسی)، مولد النبی ہی ہے، حُلیتہ النبی شریف (سرائیکی)، سہ حرفی (سرائیکی) خطبات آئمہ مساجد (عربی) اور اقبال نامہ شامل ہیں۔ اسی دور کی ایک اور علمی شخصیت مولوی عبد الماجد غوری ہیں، جو بہاول پور میں ہی پیدا ہوئے لیکن انہوں نے اپنی تعلیم ٹونک اور عرب سے حاصل کی اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ٹوٹک میں گزارا۔ جس کی بناء پر انہیں بہاول پوری ٹوکی مصنف کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے جد امجد موادی نورالنبی کو نواب بہاول خان ثالث (۱۸۲۵ء-۱۸۵۲ء) درگاہ اجمیر شریف سے بہاول پور لائے تھے۔ یہ بزرگ تو یہاں کچھ

عرصہ قیام کے بعد ٹونک واپس چلے گئے البتہ ان کے دو بیٹے مستقلاً یہاں رہائش پذیر ہوئے، جن کا خاندان اپنی علمی کاوشوں کی بدولت اعلی مناصب پر تعینات ہوتا رہا۔ مولوی نور النبی کی اولاد میں سے موادی عبد الماجد غوری نے تیرھویں صدی ہجری کے اختتام تک عربی زبان میں کم و بیش ستر کے قریب مقالہ جات تحریر کیے۔(33)

نواب محمد بہاول خان ثالث کا دور علمی سرپرستی کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ وہ خود اعلی تعلیم یافتہ انسان تھے۔ جن کا اندازہ ان کے طرز تحریر اور اُن حواشی سے لگایا جاسکتا ہے، جو انہوں نے اس عہد کی مشہور تاریخ جواہر عبایہ پر لکھے۔ اس کتاب کے اصل نسخہ پر نواب نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا کہ:

> " این نسخہ مبارک مسمی تذکرۃ الخوانین المعروف جواہر عباسیہ من تصنیف مولوی محمد اعظم حسب امر سرکار در سرکار بندہ عاصی، امید دار شفاعتِ محمدی و سرفراز اضعف ترین عباداللہ عبد اللہ وعبد الرسول محمد رحیم یار المعروف محمد بہاول نھان ثالث بالخیر عباسی عفہ عنہ الی یوم الدین آمین یارب العالمین در بہاول گڑھ شرقیہ تیار شد داخل کتاب خانہ بیستم ماہ بساکھ نسبت ۱۸۹۵ "۔(34)

مزید یہ کہ نواب مذکور نے اس کتاب کے تمام حاشیے اور سُرخیاں خود اپنے قلم نے خط شکستہ میں تحریر کیں جو کتابت کا اعلی معیار پیش کرتی ہیں۔ کتاب مذکور کو دو کاتبوں نے تحریر کیا۔ اس کا ابتدائی حصہ منشی سلامت رائے ولد منش دھنپت رائے نے تحریر کیا، جبکہ اس کے بقیہ حصے کی کتابت حکیم قمر الدین نے کی۔ وہ کتاب کے اختتام پر تحریر کرتا ہے کہ:

" نواب مذکور نے اس کے والد کی وفات کے بعد اسے بچپن ہی میں اپنی ملازمت سے سرفراز کیا اور اسے حکمت اور طبابت کی تعلیم اپنے نامور حکماء وکاتبوں سے دلوائی "۔(35)

جواہر عباسیہ کے یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ ریاست بہاول پور میں کتابت و حکمت کے علوم با قاعدہ طور پر سرکاری سرپرستی میں پڑھائے جاتے تھے۔ اسی طرح اس بات کے بھی واضح شواہد ملتے ہیں کہ نواب مذکور کو علوم و فنون سے اس قدر شغف تھا کہ وہ کاروبار سلطنت کے بعد اپنا زیادہ تر وقت کتب خانہ میں گزارتے تھے۔ اس وقت قلعہ ڈیراور کو امیران بہاولپور کے دارالسلطنت کی حیثیت حاصل تھی۔ اس قلعے کا ایک برج جو "بُرجِ لکوھا" کے نام سے منسوب ہے، کو ریاست کے "دفتر انشاء" کی حیثیت حاصل تھی۔(36) جہاں اس دور کے نامور عالم، منشی اور کاتب موجود رہتے تھے۔ نواب مذکورہ اہل علم کا بہت قدر دان تھا۔ جواہر عباسیہ کا کاتب اس سلسلے میں تحریر کرتا ہے کہ جب اس نے کتاب مذکور کا ایک حصہ کتابت کیا تو اس کے صلے میں نواب نے اسے ایک اعلی نسل کا گھوڑا بطور انعام دیا۔(37)

نواب بہاول خان ثالث اپنے اعلی درباری عہدیداران کو نصیحت آمیز خطوط لکھتا تھا۔ خاص کر اپنے وزیر محمد یعقوب خاں کو ترک دنیا اور ہمہ وقت وظائف اور حَبسِ دم میں مصروف رہنے اور فرائض منصبی کی انجام دہی میں غفلت برتنے پر بہت ہی مدبرانہ اور فلسفیانہ خطوط لکھے جو فارسی زبان وادب کا شاہکار ہیں۔ ایک خط کا مختصر متن ذیل ہے:

" دنیا سرائے است آب نما

وآخرت سرائے است ابد بقا"

"اکثر مردان خدا کہ جویائی استرضات ذات برحق،طالب یتانہ مطافی
عالم آخرت گزیدہ اند نحسنت ترک دنیاخودہ درتزکیہ نفس آمادہ وتصفیہ
باطن تیرہ کوشیدہ اند کہ تا در مشاہدہ انوار غیبی و معائنہ تجلیات لاربی
لذتی حاصل کنند"۔(38)

اسی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ دو معاہدات ۱۸۳۳ء اور 1838ء میں طے پائے جو فارسی زبان میں ہی تحریر ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مقامی ریاستوں سے تعلقات استوار کرنے کے لیے جو خطوط تحریر کیے جاتے تھے وہ بھی فارسی زبان میں مرتب ہوتے تھے۔ اس قسم کے کئی خطوط دربار بہاول پور میں ۱۸۲۷ء ۱۸42اور ۱۸4۳ء میں لکھے گئے۔(39) باقاعدہ طور پر فارسی زبان کا ریاست بہاول پور کی سرکاری زبان ہونے کے شواہد ۱۸48ء تک ملتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب ملتان میں انگریزوں کے خلاف دیوان مواراج نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے میں بہاول پوری فوج نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران ریذیڈنٹ لاہور اور نواب محمد بہاول خاں ثالث کے درمیان جس قدر خط وکتابت ہوئی وہ بھی فارسی زبان میں ہی تھی۔(40) اسی دور کے ایک نیٹو ایجنٹ پیر ابراہیم خان وفات (۱۸۵۵ء) جو کمپنی کی حکومت کی طرف سے دربار بہاول پور میں مقرر تھے، ریاست میں ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۴ء تک تعینات رہے۔ پیر ابراہیم نے ۱۸۵۴ء میں فارسی زبان میں ایک سفر نامہ "سیرستان" کے نام سے تحریر کیا۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ ان کے سفر انگلستان کے واقعات سے متعلق ہے جب کہ اس کتاب کا باب چہارم ریاست بہاول پور کے جغرافیائی و تمدنی حالات سے متعلق ہے۔ مؤلف نے اس باب میں اپنے قیام بہاولپور کے چودہ سالہ مشاہدات و مطالعے کے بعد یہاں کی تہذیب وثقافت کو جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸54ء میں ملتان سے شائع ہوئی۔ مزید برآں پیر ابراہیم خاں کو بہاول پور میں دفتری اردو زبان کا

بھی بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا اس لیے کہ جب ۱۸۴۶ء میں انہیں ریاست بہاول پور اور ریاست بیکانیر کے مابین سرحدوں کی حد بندی کے لیے مقرر کیا گیا تو انہوں نے سرحدی تصفیہ کی تمام رپورٹ اور خط و کتابت قدیم اردو زبان میں کی۔(42)

نواب محمد بہاول خاں ثالث کے دور میں جس قدر لوگ اراکین ریاست مقرر ہوئے وہ پڑھے لکھے تھے۔ اس دور کے ہندو وزراء میں رائے صاحبان اعلی علمی صلاحیتوں کے حامل تھے جو گلوترہ قوم سے تھے جبکہ یہ خاندان ہندوؤں کے معزز اقوام کے شجرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس خاندان کا ریاست میں ملازم ہونے والا پہلا فرو نشی دھنیت رائے تھا جو میر غشی کے عہدے تک پہنچا۔ وہ عربی، فارسی، سنسکرت اور گورمکھی زبانوں میں دسترس رکھتا تھا۔ شاہی مراسلے تحریر کرنے کے لیے اسے خاص ید طولیٰ حاصل تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ (۱۷۸۰ء۔۱۸۳۹ء) کے دربار میں اس کے لکھے ہوئے ایک مراسلے نے اپنے طرز تحریر اور بیان کی خوش اسلوبی کی بناء پر خراج تحسین حاصل کیا۔ اس کا لڑکا منشی مقدم رائے بھی مختلف زبانوں فارسی، عربی، سنسکرت، گورمکھی کے علاوہ موسیقی، شاعری اور انشاء پردازی میں بھی اعلیٰ مہارت رکھتا تھا۔ وہ شطرنج بھی خوب جانتا تھا اور ہمیشہ مطالعہ بالخصوص کتب تصوف میں منہمک رہتا تھا۔ اس نے ایک مشہور عالم مولوی محمود بخش صاحب سے علم حاصل کیا اور دربار میں تاریخ

نویس، منشی دربار اور میر منشی کے عہدوں پر فائز رہا۔(43)

امیر محمد بہاول خان ثالث کے دور کے ایک اور عالم سیفل شاہ نامی گزرے ہیں۔ انہوں نے بہاول پوری (سرائیکی) زبان میں دلچسپ قصوں پر مشتمل ایک کتاب اور کافیاں تحریر کیں ان کے اس مجموعے کو "سیفل" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔(44)

نواب محمد فتح خان عباسی (۱۸۵۴ - ۱۸۵۸ء) کا دور اگرچہ بہت مختصر تھا لیکن اس نواب نے بھی علماء کی سرپرستی میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ انہوں نے اپنے ولی عہد کی باقاعدہ تعلیم و تربیت کے لیے مولوی ظہور الدین کو بطور اتالیق مقرر کیا۔ اسی اور میں مولوی جمیل الدین اور مولوی محمود الدین جیسے علماء کو منصب قضا پر تعینات کیا گیا، جو علمائے لاہور کے خاندان سے تھے۔ اس نواب کے دور میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے فقیر بر اور ان کو شہرت ملی جن میں فقیر سراج الدین اور فقیر شہنواز الدین قابل ذکر ہیں۔ اس فقیر خاندان کے جد امجد سید عزیز الدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان دونوں بھائیوں کا بہاول پور میں ورود نواب محمد بہاول خان ثالث کے دور میں ہوا۔ جیسا کہ ۱۸۵۱ء میں محمروٹ کے مقام پر ان دونوں بھائیوں نے نواب بہاول خاں کو نذرانے پیش کیے اور اس کے مصاحبین میں شریک ہو گئے۔ تاہم ان دونوں علماء کو عروج و زوال نواب فتح خان کے دور میں حاصل ہوا۔ انہوں نے " بہاول پور میں اردو ادب کی اشاعت کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۸۵۹ء کے لگ بھگ اردو خواص کے حلقے سے نکل کر عوام میں اپنا اثر رسوخ پیدا کر چکی تھی۔ لہذا ان حالات کے پیش نظر یہ بات واضح ہے کہ فقیر بھائیوں نے ریاست بہاول پور میں آکر اردو ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا کیونکہ یہ دونوں بھائی ایسے ماحول سے متاثر تھے جہاں اردو کو روز بروز اہمیت حاصل ہو رہی تھی۔ (45) لیکن بہاول پور میں ان کی آمد کا تاریک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی آمد کے بعد دربار بہاول پور کو سازشوں اور بدعنوانیوں سے روشناس کرایا۔ حتیٰ کہ فقیر سراج الدین نے اپنے عہد وزارت کے دوران ریاستی خزانے سے کم و بیش دو لاکھ روپے اور قیمتی جواہرات خورد برد کر کے اپنے والد فقیر چراغ الدین کو لاہور بھجوائے۔ (46) غالباً ریاست بہاول پور میں بیرونی عناصر کی خورد برد اور بدعنوانی کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ جس کے بعد ریاست کے ادغام تک حکومتی عہدوں پر فائز افراد کا سرکاری املاک میں تغلب، اقرا پروری اور بدعنوانی کا عنصر غالب رہا۔

نواب محمد بہاول خاں رابع (۱۸۵۸ء - ۱۸۶۶ء) کے دور میں اگرچہ برصغیر میں جنگ آزادی کی لہر سے تمام علاقے متاثر ہوئے لیکن بہاول پور میں اس جنگ کے کچھ زیادہ اثرات مرتب نہ ہوئے اس دور میں عملی طور پر اس خطے میں اردو زبان کی اصل آبیاری کا شرف سید مراد شاہ گردیزی (۱۸۶۵ء-۱۸۷۶ء) کو حاصل ہوا جو کہ ریاست میں نیٹو (مقامی) ایجنٹ، ناظم اور صدر منصف کے عہدوں پر فائز رہے۔ ان کا تعلق ملتان کے گردیزی خاندان سے تھا۔ انہوں نے اردوزبان میں پانچ جلدوں پر مشتمل "تاریخ مراد" تحریر کی جسے بہاول پور کی تاریخ پر اردوزبان کے سب سے پہلے ماخذ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مراد شاہ کی اچانک وفات کی وجہ سے یہ تاریخ شائع نہ ہو سکی لیکن یہ تاریخ قلمی صورت میں ملتان کے گردیزی خاندان کے پاس موجود ہے۔ اوراس کی جلد چہارم اور پنجم گزشتہ سالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کی جلد پنجم میں خصوصانواب محمد بہاول خان ثالث کی تخت نشینی (۱۸۶۵ء) سے لے کر نواب بہاول خان رابع کی وفات (۲۵ مارچ ۱۸۶۶ء) تک کے حالات درج ہیں۔ یہ جلد ۶ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخ مراد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام واقعات کو سنین اور ماہ و ایام کی ترتیب و تسلسل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ مراد شاہ نے اپنے ہم عصر مورخین کی ڈگر سے ہٹ کر واقعات نویسی کا فریضہ سر انجام دیا ہے اور اس کا یہ انداز درباری مورخین اور قصیدہ گوؤں کے انداز سے ہٹ کر ہے اور جس میں حقیقت نگاری کا عنصر واضح ہے۔ مؤلف اپنے فن تاریخ نویسی میں بغیر لگی لپٹی کے حقیقت کو آشکار کرنے کا خوگر ہے اور اس کا یہی انداز اسے اپنے ہمعصروں، پیش روؤں اور متاخرین سے ریاستی تاریخ نویسی کے فن میں ممتاز کرتا ہے۔ جہاں تک مراد شاہ کی اردو دانی کا تعلق ہے تو اس پر فارسی کی گہری چھاپ ہے اور صاف واضح ہوتا ہے کہ گویا فارسی کے بطن سے نوزائیدہ اردو جنم لے رہی ہے۔ تاریخ ،مراد کا درج ذیل اقتباس اس بات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

"ہر گاہ نواب بہاول خاں ثالث کو نسبت محمد یاقوب از میر ریاست کہ یہ شک ہوا کہ سر انجامی امورات ریاست میں متغافل اور ملازمان فوج وغیرہ کو عدم ادائیگی، مشاہرہ سے تنگ کرر کھا ہے اور محمد قائم ماموں اس کے نے منجملہ زر آمدنی ڈیرہ غازی خاں میں تغلب کر کے داخل توشہ خانہ ریاست نہ کیا تو نواب صاحب ممدوح در پے نقصان جان محمد یعقوب ہوئے"۔(47)

اسی طرح نواب صادق محمد خان رابع (۱۸۶۶ء-۱۸۹۹ء) کے ابتدائی دور کے ایک عالم مولانا عزیز الدین کا ذکر بھی کافی اہمیت کا حامل ہے جو دولت خانہ بہاول پور کی شاہی مسجد کے خطیب اور امام تھے ۔جن کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا۔ جو ریاست کے امیر ان کی علم دوستی کا چرچا سن کر دربار بہاولپور سے منسلک ہوئے۔ انہوں نے شعر وشاعری اور فن تاریخ گوئی میں نام پیدا کیا۔ لیکن ان کا سب سے بڑا وصف ان کی خطاطی وخوش نویسی تھا جس کی بنا پر انہیں نواب صاحب کی طرف سے "یاقوت رقم" کا خطاب دیا گیا۔(48) دولت خانہ بہاول پور کی شاہی مسجد میں خطاطی ونقاشی کا ایک باقاعدہ شعبہ ان کی سرپرستی میں قائم ہوا۔ ریاست کی تمام بڑی جامع مساجد کی تاریخ تعمیر انہوں نے نکالی اور ان میں قرآنی آیات و نقاشی کے نادر نمونے بھی اپنے ہاتھوں سے تحریر کیے۔ احمد پور شرقیہ کی جامع مسجد اور دولت خانہ بہاول پور کی شاہی مسجد میں درج ذیل اشعار مولانا کے ہاتھوں تحریر ہوئے۔

"روز محشر کہ جاں گداز بود اولیں پرسش نماز بود
چراغ ومسجد ومحراب ومنبر ابو بکر وعمر، عثمان وحیدر"

درج بالا اشعار اور ان کے انداز خطاطی نے اس قدر شہرت دوام حاصل کی کہ اس کی تقلید بعد ازاں ریاست سے باہر پنجاب بھر کی دیگر مساجد نے اختیار کی مولانا عزیز الدین کی تصانیف میں "بازنامہ" کا اردو ترجمہ سفر نامہ حج، اور مسدس نعتیہ شامل ہیں جو خطوطات کی شکل میں صادق گڑھ پیلس کی

شاہی لائبریری میں موجود تھیں۔ مولانا عزیز الدین بعد ازاں "صادق الاخبار" کے ایڈیٹر اور سرکاری مطبع صادق الانور کے قائم مقام سپر نٹنڈنٹ بھی رہے۔(49)

المختصر خطہ ء بہاول پور کو ہمہ گیر علمی سرگرمیوں کے اعتبار سے برصغیر پاک وہند میں کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ خود ہندو اور بدھ دور کے آثار رفتہ اور قرائن سابقہ اس کی واضح دلیل ہیں۔ اگر صرف زیر نظر مقالہ میں متعین خالصتاً اسلامی دور حکومت کا جائزہ ہی لیا جائے تو صرف حضرت صفی الدین گازرونی کی اوچ آمد اور برطانوی عملداری کے قیام (۹۸۰ءتا ۱۸۶۶ء) تک علمی و دینی سرگرمیوں کی آٹھ سو چھیاسی سالہ علمی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ برصغیر میں اس علاقے کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اور پھر اگر ریاست بہاول پور میں صرف علاقہ ء اوچ کا ہی علم و عرفان کے مرکز کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو اسے برصغیر کے قبتہ الاسلام کی حیثیت دینے میں کوئی عار محسوس نہ ہو گا۔ بھلا مشائخ کا وہ کونسا سلسلہ ہو گا جس کا تعلق اس خطے سے نہ رہا ہو۔ اس سرزمین میں ناصر الدین قباچہ کا دور علوم و فنون کی سرپرستی کے لحاظ سے انتہائی منفرد ہے۔ اسی دور سے علم و عرفان کے روشن ستارے دور و نزدیک سے جمع ہو کر اس خطے کے افق پر پوری آب و تاب سے چمکنے لگے اور جن کی کرنیں دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کو منور کرنے لگیں۔ اگرچہ قباچہ کا دور انتہائی مختصر تھا لیکن اسکے اثرات اس قدر دیرپا ثابت ہوئے کہ خطہ بہاول پور کے طول و عرض میں ریاست کے قیام ۱۷۲۷ء تک برقرار رہے اور پھر اس خطے میں ریاست بہاول پور کا ایک خود مختار اسلامی ریاست کی حیثیت سے ارتقاء نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ امیران بہاول پور اور علمائے کرام کی بھرپور سرپرستی کی بدولت اس کم ترقی یافتہ علاقے میں تعلیم و تدریس کے کئی مراکز قائم ہوئے۔ اسی طرح ریاست بہاول پور کو ایک بار پھر وہی مقام حاصل ہوا جو قباچہ کے مختصر دور میں اس خطے کو علمی سرپرستی کی حیثیت سے حاصل رہا تھا۔

یہ دربار بہاولپور ہی تھا جہاں کہ وقت کے بدلتے ہوئے تیوروں کو قبل از وقت محسوس کیا گیا اور فارسی زبان کی بجائے اردو کو سرکاری حیثیت دینے کی ابتداء کی گئی۔ جس کا عملی اظہار ۱۸۴۶ء میں مراسلت و دستاویزات سے ہوتا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں جب بنارس کے ہندوؤں نے اپنے تعصب کی بنا پر ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط میں رائج کرنے کا مطالبہ کیا تو عین اسی وقت ریاست بہاول پور میں سرکاری سرپرستی میں اردو کو باقاعدہ خطوط پر استوار کرنے اور اس کی اشاعت و ترقی کے لیے صادق الانوار پریس قائم کیا گیا۔ جہاں سے اردو ہفت روزہ ” صادق الاخبار اور سرکاری گزٹ کا اجراء عمل میں آیا اور یہیں سے ریاست میں مروجہ قوانین و ضوابط، شاہی فرامین اور احکامات کو اردو زبان کا قالب دیا گیا۔

برصغیر بھر میں جبکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے تعلیمی اوقاف کی ضبطی کی گئی اور اس طرح دینی مدارس کی سرکاری سرپرستی ممکن نہ رہی جو ہندوستانی مسلمانوں کے ہمہ گیر دینی و علمی انحطاط کا پیش خیمہ بنی۔ یہ اس خطے کی قدیم علمی سرگرمیوں کی فیوض و برکات تھیں کہ اس دوران ریاست بہاولپور میں مدارس و مکاتب اور مساجد میں تعلیم کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ اس پس منظر میں جب سرسید احمد خان نے برصغیر کے مسلمانوں کی نجات جدید تعلیم کے حصول کو قرار دیا تو خطہ بہاول پور تعلیم کے شعور سے بہرہ ور تھا۔ اس خطہ کے عوام اور حکمرانوں نے علی گڑھ کی اس تعلیمی تحریک کے ساتھ ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا اور جدید تعلیم کو لبیک کہتے ہوئے نئی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔

حوالہ جات

1۔ مولانا عزیز الرحمن، عزیز، پتن منارا، الزبیز، آثار قدیمہ نمبر، (بہاول پور، ۱۹۷۵ء)، ص ۷۷

Punjab State Gazetteer Vol. XXXVIA, Bahawalpur State, 1904, .2 Lahore.

3. مسعود حسن شہاب، خطہ ءپاک اوچ،لاہور، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۶۸ -۱۶۹۔

4. مولانا حفیظ الرحمن، حفیظ، تاریخ اوچ (بہاول پور، ۱۹۳۰ء)، ص ۶۹۔

5. قاضی منہاج الدین سراج، طبقات ناصری، جلد اول، (لاہور، ۱۹۷۵ء) جس ۴۴۷۔

6. ایضاً

7. علی بن ابراہیم کوفی، چچ نامہ، مترجم اختر رضوی، (کراچی، ۱۹۵۹ء) ص ۴۴ -۴۵۔

8. مولانا حفیظ الرحمن، حفیظ، بحوالہ سابقہ ص ۹۷ - ۹۸۔

9. مسعود حسن شہاب، اولیائے بہاول پور (لاہور، ۱۹۴۸ء) ص ۱۷۵

10. سعود حسن، شہاب، بحوالہ سابقہ ص ۱۶۹۔

11. شیخ محمد، اکرام، مجلہ جامع اسلامیہ بہاول پور، خطبہ استقبالیہ محکمہ اوقاف مغربی پاکستان ۱۹۶۴ء ص ۲۲۔

12. مسعود حسن شہاب، بحوالہ سابقہ، ص ۸۵

13. مولانا عزیز الرحمن، عزیز، ذکر کرام، (دہلی، ۱۹۳۷ء) ص ۲۲۔

14. مسعود حسن، شہاب، بحوالہ سابقہ، ص ۲۵۹

15. مولانا عزیز الدین عزیز، بحوالہ سابقہ، ۲۲۔

16. ایضاء ص ۲۲

17. مرزا احمد اختر، مناقب فریدی، حصہ اول (دہلی ۱۳۱۴ھ) ص کے ۹۔

18. مسعود حسن، شہاب، بحوالہ سابقہ ص ۱۷۵

19. مرزا احمد اختر، بحوالہ سابقہ ص ۳۷۔

20. ایضا، ص ۳۶

21. ایضا، ص ۵۰

22. ایضاً، ص ۹۲

23. ایضاً، ص ۹۸

24. مسعود حسن شہاب، بحوالہ سابقہ ص ۱۶۲۔

25. ایضاً، ص 126۔

26. حاجی عبیدی، دین پوری، ید بیضا، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۳۶۔

27. ایضا، ص ۸۷

28. ایضاً، ص ۸۸

29. مرزا محمد اشرف گورگانی و مولوی محمد دین، صادق التواریخ، (بہاول پور، ۱۸۹۹ء) ص 178 - 179۔

30. مولانا غلام رسول مہر، تاریخ سندھ، حصہ ششم عہد کلہوڑا، جلد اول (کراچی ۱۹۵۸ء) ص ۲۱۔

31. محمد اشرف، گورگانی، بحوالہ سابقہ ص ۲۰۷۔

32. مولوی محمد اعظم، جواہر عباسیہ، (قلمی مخطوطہ فارسی)، (بہاول پور، ۱۸۳۸ء) ص 1۔

33. عزیز الرحمن، عزیز، ماھنامہ العزیز، اکتوبر ۱۹۴۰ء ص 40.

34. مولوی محمد اعظم، بحوالہ سابقہ، ص 1۔

35. ایضاً، ص ۲۴۱-۲۴۲

36. عزیز الرحمن، عزیز، ماہنامہ العزیز، اپریل ۱۹۳۰ء ص ۲۱۔

37. مولوی محمد، اعظم، بحوالہ سابقہ ص ۲۰۸۔

38. محمد اشرف، گورگانی، بحوالہ سابقہ، ص ۲۰۸

39. ایضا، ص 219-224

.40Administration File, Bahawalpur State, 1848,p.9..

41. پیر ابراہیم خان، سیرستان (فارسی)، (ملتان ۱۸۵۴ء) ص ۲۳۷

42. فائل تصفیہ سرحدات، مابین ریاست بہاول پور اور ریاست بیکانیر، محافظ خانہ بہاولپور، ۱۸۴۶ء۔

43. عزیز الرحمن، عزیز، ماہنامہ العزیز، اگست ۱۹۴۰ء، بہاول پور ص ۴۳ ۴۴۔

44. بحوالہ سابقہ، ص ۴۴ ۳

45. ماجد قریشی، دبستان بہاول پور، (م -ن -۱۹۶۴ء) ص ۲۳-۲۴-

46. محمد طاہر، تاریخ بہاول پور، ماخذات اور اس کے ذرائع، الزبیر، بہاول پور نمبر، بہاول پور ۱۹۹۴ء ص ۳۲۶۔

47. سید مراد، شاہ، تاریخ مرید (قای نسخہ بیاد انجم ملتان است -ن - ۲۲ - تاریخ مزاد کی جلو چہارم اور جلو پنجم حال میں ہی شائع ہو چکی ہیں۔

48. کیپٹن منظور حسن، ماہنامہ، نور التعلم، ستمبر ۱۹۶۲ء، ندارد، ص ۲۱۔

49. ایضا، ص ۲۱

ریاست بہاول پور میں اُردو بطور سرکاری زبان

ریاست بہاول پور کا قیام ۱۷۲۷ء میں ہوا تو برصغیر پاک وہند میں مروج سرکاری زبان کی طرز پر یہاں بھی فارسی زبان کو رائج کیا گیا۔ جب ۱۸۳۷ء میں گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ (۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۲ء) نے برطانوی ہند کے دفاتر میں فارسی کی بجائے اردو کے نفاذ کا حکم دیا تو بعض عملی دشواریوں کی وجہ سے اردو کا نفاذ فی الوقت سارے ہندوستان میں نافذ العمل نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ دفتروں میں کام کرنے والے اہلکار ایک عرصے سے فارسی میں کارروائی کر رہے تھے۔ اس لیے اردو زبان کو فارسی الفاظ سے مخلوط کر کے رفتہ رفتہ دفتری زبان کے طور پر قابل نفاذ بنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ پنجاب میں اردو زبان کو لے کر 11 اگست ۱۸۴۹ء سے دفتری زبان قرار دیا گیا۔ جب کہ ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسماعیل خاں اور پشاور میں اردو کا نفاذ جون ۱۸۵۴ء سے عمل میں آیا(۱) ۔ تاہم برصغیر پاک وہند کی دیسی ریاستیں چونکہ اپنی اندرونی پالیسیوں کے سلسلے میں ایک حد تک آزاد تھیں۔ اس لیے زیادہ تر ریاستوں نے اپنے دفاتر میں فارسی زبان کو رائج رکھا (۲)۔ البتہ علی الترتیب ریاست حیدر آباد، ریاست بہاول پور اور ریاست بھوپال کے مسلمان فرمانرواؤں نے اس سلسلے میں دور اندیشی اختیار کی اور ایک مشترکہ ورثے کے طور پر اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دی۔ اس سلسلے میں ریاست بہاول پور سے متعلق دستاویزی ثبوت ملتے ہیں کہ یہاں نواب محمد بہاول خاں ثالث بالخیر (۱۸۲۵ء تا ۱۸۵۲ء) کے دور سے دفتری کارروائی کا آغاز فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نواب موصوف کے دور میں قلعہ ڈیراور کے برج لکوہا میں جو دارالانشاء قائم تھا اس کے مہتمم ایک اردو دان عالم مولوی محمد اعظم (پیدائش ۱۷69ء) کو مقرر کیا گیا۔ مولوی صاحب اپنے دور کے مشہور مورخ اور شاعر تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو

زبان میں اپنا مجموعہ چھوڑا جو ان کی وفات کے بعد 1911ء میں شائع ہوا ان کے دیوان سے لیے گئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جامہ نازو ادا کس نے پہنایا ہے تجھے
اس طرح شوخ بلا کس نے بنایا ہے تجھے
مسند دلبری و شوخی بے رحمی پر
اے ستمگر صنما کس نے بٹھایا ہے
میں نے ظاہر نہ کیا تم نے پہچانا کیوں کر
درد کا حال میرا کس نے سنایا ہے تجھے
مرغ دانا تھا و لے آج بہ دام اعظم
کس طرح آن پڑا کس نے پھنسایا ہے تجھے (۳)

نواب محمد بہاول خان ثالث کے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست بہاول پور کے مابین ۱۸۳۳ء اور ۱۸۳۵ء کے دوران دوستی کے معاہدات ہوئے۔ ان کے نتیجے میں ریاست میں کمپنی کی طرف سے پیر ابراہیم (۱۸۴۰ء تا ۱۸۵۰ء) کو نیٹو پولیٹکل ایجنٹ مقرر کیا گیا جو فاری کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی مراسلت کرتے تھے۔ اس کا دستاویزی ثبوت یہ ہے کہ محافظ خانہ بہاول پور میں ایک فائل تصفیہ سرحد متنازعہ بیکانیر و بہاول پور کے عنوان سے ملی ہے جو ستتر دستاویزات پر مشتمل ہے۔ جنہیں 6 جنوری ۱۸۴۷ء سے ۱۲ اپریل ۱۸۴۵ء کے دوران تحریر کیا گیا۔ ان میں متعدد تحریریں اردو میں ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ پیر ابراہیم خان، کپتان جوزف دیوی کنگم اور کپتان جیکسن کو گورنر۔ جنرل کے حکم پر ریاست بہاول پور اور ریاست بیکانیر کے درمیان سرحدی تنازعات کو طے کرنے اور حد بندی مقرر کرنے پر تعینات کیا گیا۔ اس سلسلے میں چیف کمشنر پنجاب، پیر ابراہیم نیٹو ایجنٹ اور حد

بندی کمشنروں کے مابین ہونے والی باہمی مراسلت اور حد بندی کے سلسلے میں طے پانے والے امور میں سے بعض کو فارسی اور بعض کو اردو میں تحریر کیا گیا۔ ایک ایسا ہی مراسلہ جو کپتان جیکسن نے 11 فروری ۱848ء کو لکھا کے مندرجات حسب ذیل ہیں۔

پیر صاحب مشفق مہربان پیر ابراہیم خان صاحب بہادر نیٹو ایجنٹ بہاول پور سلامت

خط فرحت نمط آپ کا مرقومہ ہشتم ماہ فروری ورود مسرت آموز لایا۔ مطالعہ سے اوسکے گوناگوں شادمانی ہوئی۔ کیفیت اوچ کہ بلف اوسکے بھیجی ہمارے تئیں آپ نے نہایت ممنون عنایت کا کیا اور جو دریافت اس کے کہ اس عرصہ قلیل میں آپنے فیصلہ سرحد ناظم ملتان اور بہاول پور کے فراغت حاصل کرلی۔ طبیعت کو خوشنودی ہوئی۔ توقع ہے کہ فیصلہ اور حد بندی سرحد بہاول پور اور بیکانیر کی بھی عنقریب تمام ہو چکے گی اور اغلب ہی کہ اس اثناء میں معتمد جیسلمیر بھی وارد انوپ گڑھ ہوئے ہوں گے۔ دو تین روز میں ہم بھی اونسے ملاقی ہوتے ہیں خریطہ مرقومہ ۷ ۲ صفر کا کہ نواب صاحب نے مرسل اس سمت فرمایا... از راہ عنایت آپ بھی خوبیاں اس طریق تصفیہ کی کہ بدرجہ کمال مستحسن ہے۔ منقوش خاطر عاطر نواب صاحب کر دیجیے اور اونکی خدمت میں ہم نے اپنی تجویز لکھ بھیجی ہے کہ دو سردار ایک تو محمد کھنبر خان اور دوسرے ایک اور کہ ویسے ہی نیکنام اور زیعزت ہوں۔ سرکار بہاول پور کی طرف سے مقرر کیے جاویں اور دو شخص اوسی صفت کے من جانب طرفثانی نامزد ہوں اور وہ آپس میں تصفیہ سرحد کر دین اور اس بات سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ شہادت زمینداروں کی کم اعتبار رکھتی ہے اور فقط یہی نہیں بلکہ اکثر اوقات اظہار اونکے حرف اوپر اونکے آقاؤں کے لاتے ہیں۔ فقط چند در چند ہم کو بڑا تاسف ہے کہ آپ ہمارے ہمراہ نہیں بہر حال موجود ہونا آپ کا بہاول پور میں بھی مفید ہو سکتا ہے۔

فقط المرقوم ا فروری ۱۸۳۸ء منمقام شہید ال والی بھٹ

دستخط انگریزی

کپتان جیکسن بہادر (۴)

اس خط کے مندرجات سے ظاہر ہے کہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول سروس کے کپتان جیکسن جیسے عام افسر کے ہاتھ سے لکھی گئی تحریر نہیں ہو سکتی۔ جو اردو کی محض معمولی شدبد رکھتا ہو اور جو اپنے دستخط تک اردو میں کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ یقیناً پھر اس خط کو نواب بہاول پور کے کسی کاتب نے تحریر کیا ہو گا جو دفتری عملہ کے طور پر سرحدی کمیشن کی معاونت کے لیے تعینات تھا۔ اس تصفیہ کے نتیجہ میں جو فائل مرتب کی گئی اس کی سرورق پر فارسی آمیز اردو میں یہ عنوان درج ہے:

فہرست کا غذات مسلقہ مامورین پیر ابراہیم خان صاحب بہادر نیٹو
اجنٹ بہاول پور ہمرائین کپتان جوزوف دیوی کنگھم صاحب بہادر وبا
صاحب بہادر و کپتان جیکسن صاحب بہادر بنا بر فیصلہ سرحد متنازعہ
سرکار بہاول پور و راج بیکانیر بحکم جناب مستطاب گورنر جنرل بہادر از
پیشگاہ صاحب ریذیڈنٹ صاحب لاہور۔ (۵)

یہ تحریر کا وہ انداز ہے جو آج بھی سرکاری مسلوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ہم بلا پس و پیش یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ریاست بہاول پور میں بطور دفتری زبان اردو کا استعمال ۱۸۴۷ء سے شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ ساتھ ساتھ فارسی کا استعمال بھی جاری رہا۔ اگر محافظ خانہ بہاول پور میں قدیم ریاست کے دور کی دستاویزات دیکھنے کی سہولت میسر ہو تو اس کے ثبوت میں مزید ریکارڈ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ ریاست کے صوبہ مغربی پاکستان میں ادغام ۱۹۵۵ء کے بعد منوں کے حساب سے ایسے ریکارڈ کو تلف کر دیا گیا ہے (6)۔ اور تقریباً پینتس سال سے اس ریکارڈ کو مکمل طور سیل کر کے محافظ خانے کے دروازے محققین اور مؤرخین پر بند کر دیئے گئے ہیں۔

ریاست بہاول پور میں اردو زبان کو بطور دفتری زبان مروج کرنے میں سید مراد شاہ گردیزی (1865ء تا1876ء) کی کاوشوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔ انہیں اکتوبر ۱۸۶۵ء میں ریاست بہاول پور کا نیٹو ایجنٹ مقرر کیا گیا۔

... جب ۱۸66ء میں نواب صادق محمد خان رابع (1866ء تا1879ء) کی کمسنی کے دوران ریاست میں انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کی نگرانی میں ایجنسی کی حکومت (۱۸۶۶ء تا۱۸۷۹ء) قائم ہوئی تو سید مراد شاہ کئی انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۷۵ء میں ریاست بہاول پور میں صدر عدالت کا قیام عمل میں آیا تھا انہیں اس کا پہلا چیف جج مقرر کیا گیا۔ اس عہدے پر وہ اپنی وفات ۱۸۷۶ تک فائز رہے (7)۔ سید مراد شاہ نے عملی طور پر عدلیہ اور انتظامیہ کے تمام شعبوں میں اردو کے نفاذ میں اہم کردار ادا کیا۔ غرض کہ اس دور میں ریاست بھر کے تمام دفاتر میں تمام تر کارروائی اردو میں کی جانے لگی اور سرکاری طور پر فارسی کو مکمل طور پر متروک کر دیا گیا۔ یہ دور خصوصیت سے ریاست بہاول پور میں دفتری اردو اصطلاحات سازی اور دفتری اردو نویسی کے اعتبار سے تعمیر و تشکیل کے دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ محافظ خانہ بہاول پور میں اس دور کی انتظامی و عدالتی اردو دستاویزات کا ریکارڈ اب بھی موجود ہے۔ خود سید مراد شاہ نے ریاست بہاول پور کی تاریخ پر اُردو زبان میں پانچ جلدوں پر مشتمل تاریخ مراد لکھی۔ جن میں سے ہر جلد کم و بیش تین سو صفحات کی حامل ہے۔ ذیل میں تاریخ مراد سے لیا گیا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے ان کی اردو دانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ۱۸۳۹ء میں نواب بہاول خاں ثالث نے ایک میدان صاف و ہموار واقع ریگستان جس کو ڈہر بولتی ہیں مابین ڈیرہ احمد پور شرقیہ و قلعہ ڈیر اور پسند فرما کے مکانات حرم سرائی و تالاب آبنوشے وغیرہ آب بارش طیار کرا کے قیام

گاہ خود تجویز فرمایا اور اگر چہ ایک چاہ پختہ طیار کرایا مگر پانی شیریں نہ نکلا۔

(۸)

یقیناً یہی وہ انداز تحریر تھا جو انسیویں صدی کے اختتام تک ریاست بہاول پور کی دفتری اردو کا خاصا رہا...

ریاست بہاول پور میں اردو کے نفاذ کے سلسلے میں سید مراد شاہ کے بعد کچھ اہل زبان کے نام بھی ملتے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کی سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے۔ ان میں مغلیہ خاندان کے مرزا اشرف گورگانی کے علاوہ میر اشرف علی، میر واجد علی زار اور ارشاد نبی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں(۹)۔ جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں اردو کو دفتری زبان بنانے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا اور اسے زیادہ سلیس اور با محاورہ بنایا(۱۰)۔ یہاں مراد شاہ کے ساتھ ساتھ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کرنل سی سی منچین کا تذکرہ بھی سرفہرست ہے جس نے اردو کے نفاذ کو قابل عمل بنانے کے لیے ریاست بہاول پور میں نہ صرف ۱۸۶۷ء میں مطبع صادق الانوار قائم کیا بلکہ یہاں سے اردو زبان کا پہلا اخبار اور سرکاری گزٹ "صادق الاخبار گزٹ" کے نام سے جاری کرایا۔ اس میں شائع ہونے والے سرکاری احکامات دفتری زبان کے نادر نمونے ہیں۔ یہ وہی دور تھا جب کہ ۱۹۰۰ء کرنل منچین کا ہی ایک ہم نسل لیفٹیننٹ گورنر اینٹونی میکڈانل ہندوؤں کی شہہ پر یوپی میں اردو کو دفاتر اور عدالتوں سے خارج کرنے میں مصروف تھا۔ مگر ریاست بہاول پور کا انگریز پولیٹیکل ایجنٹ اور سپرنٹنڈنٹ اردو زبان کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا چکا تھا۔ وہ نہ صرف اردو میں گفتگو کرتا بلکہ انتہائی شستہ اردو تحریر کرتا۔ ذیل میں ان کے تحریر کردہ ایک خط کے مندرجات دیئے جاتے ہیں جو انہوں نے سال ۱۸۷۲ء کے دوران سید مراد شاہ گردیزی کو لندن سے ارسال کیا:

میری عزیز دوست

آپ کی چھٹی معہ نقل رپورٹ دیوانی و فوجداری بابت سال ۱۸۷۱ء بالکل صحیح وسلامت میری پاس پونچی اور اوسکی بہیجنی سی میں اپکانہایت احسانمند ہوں۔رپورٹہای مذکور نہایت پسندیدہ ہیں خصوصاً بلحاظ بہت زیادہ کمی مقدمات (قتل کے مقدمات)خون کی جو کمی چودہ(۱۴) سی چار(۴) ہوگئی ہی۔ اور عموماً کسی جرائم سنگین کی بہت قابل اطمینان ہی۔ میں آپکی کیفیت کو نسبت علیحدگی صیغہ جات جوڈیشنل و مال کی نہایت خوشی کی ساتہہ ملاحظہ کرتاہوں۔مینی اپناجائی قیام تبدیل کیاہی اور میں اب پیونس میں رہتاہوں جو... مغربی حد انگلینڈسی دس میل کی فاصلہ پر ہی۔ میں واسطی ملاقات والدہ کپتان بکٹ اسجگہ آیاتہا۔ لیکن یہ جگہ مجھکو ایسی پسند ائی کہ میں اپنی اہل خانہ کو یہی واسطی رہنی کی اسجگہ لی آیا۔ لوگ اسجگہ کی خصلت میں بہت پنجابیوں کی مانند ہیں زیادہ گوہین لیکن رحم دل اور ایسی جملہ قدیمی روایت و دستور کو بحال رکہتی ہیں۔ اکثر یہ لوگ ماہی گیری اور کان کی کہودنی کی گزارہ کرتی ہیں... اسجگہ زراعت مثل گندم وغیرہ کی زیادہ نہیں ہی۔ لیکن سرزمین ایسی اچھی ہی کہ مثل آلو، گوبی، گوزبری وغیرہ کی بہ نسبت دیگر حصص انگلینڈ کی بہت جلد طیار ہوجاتی ہی۔ اس لیے ایسی اجناس بعوض باغات کی کہیتوں میں کاشت کی جاتی ہیں اور بذریعہ ریل کی لنڈن کو بہت زیادہ بہیجی جاتی ہیں ۔ ایساکی حال مچھلی کاہی۔۔۔۔ ہم سب خبیریں ہندوستان کی معلوم کرنیسی لطف حاصل کرتی ہیں۔ اور حالمیں ہمکو بذریعہ تار برقی خبر لی ہی کہ مترکوان صاحب بوجہ قتل چندلوگوں کی جن کو کہ اونکی آدمیوں کی گرفتار کیاتہابرطرف کئی گئی ہیں۔۔۔۔ مجہیکو واسطی کو ان صاحب کی نہایت رنج ہی کیونکہ صاحب موصوف میری قدیمی دوست تھیں اور ہم دونوں ۱۸۵۶ء و ۱۸۵۷ء میں ڈیرہ اسمعیل خان میں اسٹنٹ کمشنر تھی۔ معلوم ہوتاہی کہ اپ کی بہت زیادہ کام ہرقسم کاریاست میں انجام دیااور ہر ایک شخص نی انجام کام میں سخت محنت کی ہوگی۔۔۔۔ شاخہای نالجات (نہروں کی شاخیں) کی ایک

بہت بہاری کام تہالیکن اس امری نہایت خوش ہوں کہ یہہ حسب اطمینان نصف ہو گیا۔ پشتہ بندی واسطی سڑک ریل کی ایک عمدہ کام ہی جو اچھی طرح کیا گیا اور اس میں نیکنامی ریاست متصور ہی۔ مجکلو جملہ خبروں کی مطالعہ سی جو اپ نے نسبت ریاست تحریر کری اور ----جو کپتان گریصاحب نی کرنا ضروری خیال فرمایا بہت لطف حاصل ہوا۔ میں ارادہ واپسی قریب اختتام سال حال یا شروع سال ۱۸۷۳ء میں رکہتا ہوں اور مجکلو یقین ہی کہ میں اس وقت ریاست کو سرسبز حالت میں دیکھونگا۔ میرا بہت بہت سلام اپنی فرزند حسین بخش کو دیویں۔ اور براہ مہربانی نور محمد خان بزدارہ لعلجی پرشاد، مولوی شمس الدین دسید محمد نواز شاہ اور قاضی کو میری یاد دلادیں۔۔۔۔ اور اپکی بہتری کی واسطی دعای خیر کا طالب یقین جانو مجھی اپکا دلی دوست سی منچین (۱۲)۔

نمبر ۱۸ الگو نیٹو یا پلیس پیونس

مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۷۲ء

کرنل منچین کے اس خط سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے دور میں اردو زبان کی تحریر پر خاص دسترس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زیر انتظام ریاست بہاول پور کے تمام حکومتی شعبوں میں اردو زبان نے خوب رسوخ حاصل کیا اور دفتری زبان کی حیثیت ہی اپنا لوہا منوایا۔ یہی وہ دور تھا جب اردو نے دفاتر سے نکل کر خود شاہی محل اور امیر ان بہاول پور کی مروجہ زبان کا درجہ حاصل کیا اس کا اندازہ ہمیں نواب صادق محمد خان رابع کی والدہ کے درج ذیل خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی دو خاص ملازماؤں کی بحالی کے لیے کپتان گرے پولیٹیکل ایجنٹ کو ۵ نومبر ۱۸۷۲ء کو تحریر کیا:

بخدمت صاحب عالیمراتب عظیم الشان کپتان گرمی صاحب بہادر

پولیٹیکل ایجنٹ و سپر نٹنڈنٹ ریاست سلمہ اللہ تعلیٰ

بعد تسلیمات وافیات و دریافت اعتدال مزاج -----

نامہ عنایت شامہ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۲ء درود ہجت آمد دلا کر خرم وشادمان کیامحکوذات مجمع حسنات پر ہزار گونہ امید مہربانی کی ہیں۔۔۔۔بمقتضائے مہربانے وذی شانی نسبت بدستور رہنی اوستادیم مای شریف خاتون وادئی بختان کی جو خیر خواہ ریاست وکارکن حرم سرای وڈیوڑہی کے ہیں۔۔۔۔پس بہر کیف علیحدگی ملا زمان مذکورہ بالا مین سراسر ابتری کادیارنج ہماری کی ہیں اور جس قدر اس قلیل ایام کی جو ہونی میں محکوتکلیف اور ابتری کاروبارنج کی ہورہی ہیں۔۔۔۔موافق منشای اپنی تحریر کی کہ آپ کوپاسخاطر راقمہ ضرور مرکوز خاطر ہی ایسی تدبیر سي اس تحریر کوزیب بخشیں جس میں ہمارا کام اور آپ کی ذی شاني متصور ہو۔۔۔۔

والدہ نواب صاحب

والے ریاست بہاول پور

مورخہ یکم ماہ نومبر ۱۸۷۳ء (۱۳)

نواب صادق محمد خاں رابع کی والدہ کے اس خط سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو دوربای وسرکاری زبان کی حیثیت سے مکمل طور پر ریاست بہاول پور میں رسوخ حاصل کر چکی تھی۔خود برطانوی سر پرستی میں قائم ہونے والی عبوری حکومت بھی ریاست میں اردو زبان کے رسوخ سے آگاہ تھی۔ فارسی زبان کے خاتمہ کے بعد اردو ہی واحد ذریعہ تھا جسے عوام اور حکومت کے درمیان رابطے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ نواب صادق محمد خاں رابع کو انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم بھی دی جارہی تھی تاکہ وہ اقتدار سنبھالنے کے بعد کسی قسم کی کوئی دقت محسوس نہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر شہزادوں کی تعلیم وتربیت بھی اسی زبان کے ذریعے ہورہی تھی۔مثلاً نواب صادق محمد خاں رابع کے ایک چچازاد بھائی صاحبزادہ احمد خاں عباسی کو دفتری کام سیکھنے کے لیے صدر

عدالت بھیجا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اتالیق رحیم بخش نامی سے سبق بھی پڑھتے تھے۔ یقینا ان کی تدریس اردو زبان میں ہوتی تھی۔ اتالیق مذکورہ کو صاحبزادہ صاحب کی تعلیم اور معمولات سے متعلق روزانہ رپورٹ لکھنا پڑتی تھی۔ اردو میں تحریر کردہ اس رپورٹ کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے:

جناب عالی

امروز جناب صاحبزادہ صاحب پانچ بجی کی بعد سبق انشاء اور گلستان کا پڑہ کی سات بجی تک ضبط کرتی رہے۔ من بعد تجدید لباس اور ناشتہ کر کی صدر عدالت کو سوار ہو گئی بعد تشریف آوری از صدر تغذیہ کیا اور قیلولہ فرمایا۔ تین بجی کو دولتخانہ سی باہر رونق افزاء ہوئی اول اعادہ ہر دو سبق کا کیا بعدہ لکھنی کا اشتغال فرمایا اور اصلاح لیے۔ آج کسی آدمی اجنبی کا بجز کیسہ نامہ کی آمد کا اتفاق نہیں ہوا۔

عرضے

فقط

فدوی رحیم بخش معروضہ، ۱۰ جون (۱۸۷ء(۱۴)

ریاست بہاول پور میں اردو کی سرکاری حیثیت کی پذیرائی خود لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر رابرٹ ایجرٹن (۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۲ء) نے نواب صادق محمد خاں رابع کو ۲۸ نومبر ۱۸۷۹ء کو اختیارات تفویض کرتے وقت کی۔ انہوں نے اس موقع پر نور محل بہاول پور کے دربار ہال میں مروجہ دستور سے ہٹ کر اردو میں ایک طویل تقریر کی۔ اس کے چند ابتدائی اور آخری الفاظ درج ذیل ہیں:

"مجھ کو بہاول پور آنے میں کبھی اس قدر مسرت نہیں ہوئی، جیسا کہ اس موقع سعید پر ہوئی ہی۔ یہ وہ موقع ہے کہ کہ منجانب عالیجناب فلک رکاب حضرت علیا ملکہ معظمہ قیصرہ ہند و جناب مستطاب معلٰی القاب نواب نائب

السطنت مجھپر اس صوبہ میں یہ نہایت معزز کام عائد ہوا ہے کہ عالیجناب نواب صادق محمد خاں بہادر کو ان کے بزرگوں کی مسند پر بٹھاؤں اور ریاست کے کامل اختیار ان کو تفویض کروں۔۔۔۔ اے محمد صادق خاں بہادر رکن الدولہ نصرت جنگ حافظ الملک مخلص الدولہ نواب بہاول پور میں اب جناب مستطاب معلیٰ نواب وائسرائے کے حکم سے اور اعلحضرت ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ آپ ریاست بہاول پور کے حاکم باختیارات کاملہ ہیں۔"(۱۵)

اس پس منظر میں جب نواب صاحب نے زمام حکومت سنبھالی تو انہوں نے بھی حتی المقدور دفتری زبان کے طور پر اردو کی خوب سرپرستی کی۔ حالانکہ نواب مذکورہ کو انگریزی زبان پر خوب دسترس تھی مگر اس کے باجود ان کے سامنے کاروبار مملکت کے سلسلے میں پیش کیے جانے والے تمام کاغذات، اردو میں تحریر کیے جاتے تھے جن پر وہ احکامات بھی اردو میں ہی صادر کرتے تھے۔ حتی کہ جب انگریزی حکومت کی طرف سے کوئی مراسلہ آتا تو نواب صاحب کے سامنے اس کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا جاتا تھا۔ ذیل میں وائسرائے لارڈلٹن کے خریطہ کا اردو ترجمہ جو نواب صاحب کے میر نشی نے ان کی خدمت میں پیش کیا، حسب ذیل ہے:

ترجمہ چٹھی انگریزی لارڈلٹن والیسرائی و گورنر جنرل بنام عالیجناب رکن الدوںہ نصرت جنگ حافظ الملک مخلص الدولہ نواب صادق محمد خان صاحب بہادر والی بہاول پور مورخہ ۷ دسمبر ۱۸۷۹ء از مقام فورٹ ولیم۔

میری قدر دان دوست

"جناب کی چٹھی باظہار مبارکبادی تقریب کامیابی عساکر برطانیہ بمقام کابل موصول . ہوی۔ میں بعوض اس علامت وفاداری آپکی نسبت سلطنت برطانیہ شکریہ ادای کرتاہوں۔۔" میں بکمال پاس ولحاظ اپیکا دوست صادق رہوں۔

دستخط لٹن صاحب

وائسرای وگورنر جنرل

خریطہ منسلکہ منجانب امیر کبیر -وائسرای صاحب بہادر بنام عالیجناب نواب صاحب بہادر بہاول پور بجواب اوس خریطہ کی بھیجا جاتاہے جو نواب صاحب موصوف فی دربارہ ااظہار مبارکباد کامیابی عساکر برطانیہ بمقام کابل ارسال فرمایاتھا۔(١٦)

ریاست بہاول پور میں اردو کے نفاذ کا جائزہ یہاں کے سرکاری گزٹ میں شائع ہونے والی دفتری دستاویزات کے مطالعے سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس میں سرکاری مراسلات، احکامات، اشتہارات، قوانین وضوابط کے مسودات وغیرہ شائع ہوتے تھے، جنہیں اسی دور میں مروج دفتری اردو زبان کا قالب دیا گیا۔ ان کا اسلوب تقریباًوہی ہے جو کم وبیش آج بھی معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

اشتہار

ازپیشگاہ میجر بکٹ صاحب بہادر اسسٹنٹ

پولیٹیکل ایجنٹ وسپرنٹنڈنٹ ریاست بہاول پور

جو کہ اب وردی موسم سرما مطلوبہ فوج کنٹنجنٹ ریاست بہاول پور کا ٹھیکہ دیا جانا منظور ہی۔ اسواسطی آگاہی عام لوگوں کے لئی باجرای اشتہار ہذا اعلان کیا جاتا ہی کہ جس کسے کو اوٹہانا ٹہیکہ مذکورہ کا پسند خاطر ہو درخواست اپنی یقید شرح اصلالتاً یا مختاراً پیش کرے جواہ بسبیل ڈاک ہماری محکمہ میں حسب ضابطہ ارسال کرے۔26اپریل1878ء(17)

اونباتا یہ غالباً پہلا انڈر نوٹس ہے جو فوجی وردی کی فراہمی کے لیے سرکاری گزٹ میں دیا گیا۔ اس طرح ذیل میں اس اشتہار کا انداز دیکھیے جو محکمہ وزارت کی طرف سے نمک سازی کی ممانعت کے متعلق بطور انتباہ شائع کیا گیا۔

از محکمہ وزارت ریاست بہاول پور

اشتہار

برای آگاھے خاص وعام

چونکہ حسب عھد نامہ جدید استعمال میں آنی نمکشور وغیرہ ہر قسم کی ممانعت ہوئی جس پر سرکار انگریزی کا محصول نہیں لگا ہی لھذا یہ اشتہار دیا جاتا ہی کہ جو کوئی خلاف ورزی اس کی کرے گا سزاوار سزائی سخت ہو گا۔۔۔۔ جو شخص نمک ناجائز کو گرفتار کریگا مخبرے کر کی گرفتار کروایگا حصہ جرمانہ وصول شدہ ملزم میں سے بطور انعام دیا جاوے گا پولیس مجاز ہے کہ نمک ناجائیز کو بلاوارنٹ تلاش کر کی ضبط کر کی اور مقدمہ چالان منصفی کا کری۔(۱۸)

نواب صادق محمد خاں رابع نے اختیارت سنبھالنے کے بعد بعض نقصان پہنچانے والے جانوروں کو تلف کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

ازطرف نواب صادق محمد خاں عباسی وائی ریاست

بنام جملہ ممبران کونسل ریاست بہاول پور

مینی (میں نے) سنا ہے کہ آج کل گیدڑ لومڑی بھیرئی (بھیڑیے) بہت ہوگئی ہیں اور انسی۔ (ان سے) اکثر لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہی اور جانوران ماکول اللحم کو کھاجاتی ہیں۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہی کہ آپ لوگ گیدڑ اور لومڑی کے سر پر چار آنہ اور بھیرئی کے سر پر ایک روپیہ انعام مقرر کردیں یعنی جو شخص ان جانوروں میں کسی کا سر لا دی وہ مجوزہ بالا انعام پاوی اور حفاظت شکار کی واسطی جو قاعدہ قدیمی ہی اس میں تاکید کی جاوی۔ (۱۹)

نواب محمد بہاول خاں خامس کے دور میں خصوصیت سے صادق الاخبار گزٹ میں دفتری اردو کے کئی نمونے سامنے آئے۔ وہ اپنے روزمرہ کے دوروں کے دوران سرکاری دفاتر سے متعلق تمام بے قاعدگیوں کی رپورٹ تحریر کراتے اور اصلاح احوال کے لیے احکامات اور تجاویز دیتے۔ جن پر عملدرآمد کے لیے انہیں گزٹ میں شائع کیا جاتا تھا۔ ایک ایسی ہی رپورٹ محکمہ خزانہ سے متعلق ہے جس میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔

صدر عدالت کا ملاحظہ ہوا ----یہاں سی ہو کر محکمہ صدر حساب خزانجات کا معائینہ کیا گیا۔ لیکن اس حاضری میں سب سے بڑا نمایاں امر یہ تھا کہ جس قدر نام پکاری گئی ہیں ان میں سے سوائے ایک دو مسلمان کے کہ وہ بھی ادنے اسامیوں پر تعینات ہیں۔ باقی سب ہندو تھی۔ اینجانب کو اپنی تمام رعایا مسلمان ہندو اور سکھہ برابر ہیں اور ان سب کے حقوق اینجانب برابر خیال کرتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ملازمان کی تعداد آبادی کی حیثیت سے نہ ہو کل علاقہ ریاست میں بروئے مردم شماری مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں اور سکھوں سے پانچ گنی ہے۔۔۔ پس ----ہر دفتر میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں

اور سکھوں کی تعداد سے دوچند ہونی چاہیے۔ آئندہ کے لیے ہر ایک محکمہ میں تاکیدی احکام جاری کیے جائیں کہ اس دو اور ایک کی نسبت کو بہر حال پورا کیا جاوے۔(۲۰)

اس کے علاوہ بھی دفتری اردو کے بہت سے نمونے سامنے آتے ہیں، جو گزٹ میں شائع کیے جاتے رہے۔ مثلاً نواب صادق محمد خاں خامس (1924تا۱۹۵۵ء) کو امور مملکت سے متعلق بعض اختیارات ۱۹۲۳ء میں تفویض ہوئے تو ان کی طرف سے پہلا فرمان درج ذیل الفاظ میں شائع کیا گیا:

<u>از پیشگاہ حضور سرکار عالی</u>

دام اقبالہ وملکہ

" قبل ازیں ممبر صاحبان کونسل و صاحبزادگان عباسی کو دولت خانہ کے اندر بسواری موٹر یا لینڈو آنے کی اجازت تھی۔ اب مابدولت کا یہ منشا ہے کہ آئندہ کوئی صاحب سواری کے ساتھ اندر نہ آیا کریں(۲۱)"

نواب صادق محمد خاں خامس کے دور میں انگریزی مراسلات کے اردو تراجم کو بھی گزٹ میں شائع کیا جاتا تھا۔ ذیل میں ۱۹۲۷ء کو شملہ میں منعقد ہونے والی فرقہ وارانہ اتحاد کانفرنس کے موقع پر نواب صاحب کے ارسال کیے جانے والے تار برقی کا ترجمہ اور پھر اس کانفرنس کے سیکریٹری (قائد اعظم) محمد علی جناح کے جوابی تار کا اردو ترجمہ دیا جارہا ہے جو صادق الاخبار میں شائع ہوا۔

ترجمہ تار خبر مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۲۷ء منجانب نواب بہاول پور

"یہ معلوم کر کے ہمیں بے انتہا مسرت ہوئی ہے کہ تمام مذاہب وملت کے سربراہان واہل امرائے صاحبان شملہ میں اس غرض کے لیے جمع ہو رہے ہیں کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ اختلاف کے سوال کا اطمینان بخش حل کرنے کی تجاویز سوچیں۔ اس کانفرنس کے ساتھ ہمیں دلی ہمدردی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ حضور ایکسیلنسی وائسر ائے بہادر کی حمایت سے مدعاہائے مطلوبہ حاصل ہو جائے گا ۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس وقت تک ہماری ریاست فرقہ وارانہ اختلاف سے محفوظ ہے۔"

ترجمہ تار خبر جوابی منجانب مسٹر محمد علی جناح سیکریٹری

اتحاد کانفرنس شملہ مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء، بحضور ہز ہائینس

سرکار عالی والیئے ریاست بہاول پور دام اقبالہ وملکہ

"حضور والا کی تار خبر شرف صدور لائی۔ کمیٹی اتحاد حضور والا کے اس پیغام کو بنظر استحسان دیکھتی ہے جس میں جناب والا نے اس کے مباحث کی کامیابی کے لیے ولی خیر خواہی کا اظہار فرمایا ہے اور اسکی فرقہ وارانہ اتحاد کی بحالی کی مساعی کے لیے با اثر حمایت کا شکریہ بحضور والا پیش کرتی ہے۔" (۲۲)

اس وقت تک ریاست بہاول پور میں اردو زبان ہر قسم کی دفتری احکامات کا ذریعہ بن چکی تھی۔ مثلا نواب صاحب کے اس فرمان کا جائزہ لیجئے جو انہوں نے اپنے مذہبی اتالیق کی عہدہ وزارت سے پنشن یابی پر جاری کیا:

گزٹ

ازپیشگاہ، حضور سرکار عالی دام اقبالہ ملکہ

" ۱۶ جنوری ۱۹۳۰ء عزت نشان محسن الملک مولوی غلام حسین صاحب کو حسب استدعا ان کے عہدہ ہوم منسٹری سے ریٹائر کیا جا کر بصلہ خدمات جلیلہ مبلغ دس ہزار روپیہ سالانہ پنشن، پچیس ہزار روپیہ بونس اور بیس مربعہ زمین نہر مستقل پر عطا کی جانی منظور ہوئی"۔ (۲۳) گزٹ صادق الاخبار میں دیے گئے اردو زبان کا ایک اعلان جو وزیر تعلیم کی طرف سے تعلیم یافتہ ریاستی افراد کے کوائف وجمع کرنے سے متعلق تھا کے الفاظ درج ذیل ہیں:

گزٹ

اعلان

وزیر تعلیم

" اہل ریاست کے تعلیمی طبقہ میں عدم حصول ملازمت کی تکالیف کو محسوس کرتے ہوئے حضور سرکار دولتمدار کی پیشگاہ سے فرمان صادر ہوا ہے کہ بذریعہ گزٹ نوٹیفکیشن اعلان کیا جائے حضور آقائے نعمت والا شان کا فرمان ہے کہ ایک فہرست مرتب کی جائے جس میں درخواست دہندگان کی کوالیفکیشنز، فیملی ہسٹری، خدمات گورنمنٹ وریاست، تاریخ امتحان پاس شدگی ودیگر امور ضروری کا اندراج ہو۔ انٹرنس سے کم پاس شدہ کی درخواستیں شامل فہرست نہ ہوں گی۔ آخیر دسمبر ۱۹۳۶ء تک محکمہ ہذا میں ایسی معلومات بہم پہنچ جانی چاہیں تاکہ یہ فہرست جلد از جلد حضور آقائے نعمت کے پیش ہو سکے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء تک ریاست بہاول پور میں دفتری اردو زبان کے استعمال کے دوران بعض انگریزی الفاظ کا استعمال بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ جس سے اردو زبان کی وسعت میں اضافہ ہوا۔

سال 1944ء سے صادق الاخبار گزٹ کی اخباری حیثیت کو بالکل ختم کر کے اسے صرف سرکاری گزٹ کی حیثیت دی گئی۔ اس کے بعد سے دفتری اردو کے کئی نادر نمونے سامنے آئے اور اسے با قاعدہ طور پر ریاست بہاول پور کے گزٹ کی زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ اس موقع پر خود نواب صادق خامس نے حکم دیا کہ انہیں پیش کی جانے والی تمام درخواستیں اردو میں تحریر ہونا ضروری ہیں وگرنہ ان پر کوئی غور نہ ہوگا۔ یہ حکم ریاست بہاول پور کے اس فرمانرواء کی طرف سے جاری ہوا جو ایچیسن کالج کا فارغ التحصیل تھے اور جن کی تربیت انگریزوں نے کی تھی۔ مگر وہ اردو زبان کو اپنی ریاست میں مکمل طور پر مروج کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے یہ حکم دیا۔ اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

اعلان

وزیر حضوری از قصر صادق گڑھ

"قبل ازیں حسب الارشاد معلیٰ اعلان کیا جاچکا ہے کہ جملہ درخواستہا جو بارگاہ معلیٰ میں ابلاغ کی جاتی ہیں، بزبان اردو لازم ہیں۔ جو درخواست اردو میں نہیں ہوتیں ان پر کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔ لیکن دیکھا جارہا ہے کہ پابندی کے ساتھ اعلان متذکرہ کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ بار دیگر آگاہ کیا جاتا ہے کہ کوئی درخواست جو کہ اردو میں نہ ہو گی بغیر کارروائی کے داخل دفتر کر دی جاوے گی۔ خواہ اسٹامپ بھی کیوں نہ ادا شدہ ہو"۔(۲۵)

ریاست بہاول پور میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ خود حکمرانِ ریاست کی طرف سے اس کی سرپرستی کی گئی۔

بانی پاکستان کی وفات پر ریاست بہاول پور میں سرکاری طور پر سوگ منانے کا اعلان ہوا۔ اس موقع پر جو نوٹیفکیشن جاری کیا گیا وہ درج ذیل ہے:

نوٹیفکیشن مورخہ 12 ستمبر ۱۹۴۸ء

از وزارت عظمیٰ

"اس صدمہ جانگاہ و سانحہ ہوشربا کی خبر وحشت اثر نشر گاہ پاکستان سے موصول ہوئی ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل اعلحضرت قائد اعظم محمد علی جناح بمقام کراچی سے بتاریخ 11 ستمبر ۱۹۴۸ء بوقت شب دس بج کر ۲۵ منٹ پر بعالم جاودانی پہنچے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون" ایسے پر آشوب وقت میں دولت خداداد پاکستان کے باشندگان کو بالخصوص اور طائفہ مسلمین عالم کو جو نم ہوا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم المرتب ہستی ہے جس کی مفارقت کا عالم اسلام کے ساتھ محبت المسلمین

دنیا بھی منا رہی ہے۔۔۔ تمام دفاتر و ادارہ جات سرکاری میں ۱۲ ستمبر لغایت ۱۴ ستمبر ۱۹۴۸ء تین یوم کی تعطیل کی گئی ہے۔ آج تمام قلمرو ریاست میں دوکانیں اور ہر قسم کے کاروبار بند رہیں۔

دستخط ڈپٹی پرائم منسٹر

حکومت خداداد بہاول پور

12 ستمبر 1948ء(26)

امیر آف بہاول پور کے روزانہ کے معمولات کو بھی گزٹ میں "کورٹ سرکلز" کے عنوان سے شائع کیا ہے تھا۔ اس کا نمونہ حسب ذیل ہے:

گورنمنٹ گزٹ بہاول پور

کورٹ سرکلر

وزیر حضوری از قصر صادق گڑھ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۹ء شام: -

اعلیٰحضرت سرکار عالی دام اقبالہ نے ریلوے اسٹیشن ڈیرہ مبارک تشریف لے جا کر میل ٹرین میں حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے جنازہ پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ عالیجناب صاحبزادہ ولیعہد صاحب بہادر طول عمرہ نے حسب الارشاد معلیٰ بہاول پور سے ڈیرہ نواب صاحب تک میل ٹرین جنازہ کی مشائعت فرمائی۔ حسب الفرمان مبارک اگلے روز تمام دفاتر و ادارہ جات سرکاری تعزیت میں بند رہے۔ اور جھنڈے وفات کے فوراً بعد سے ہاف ماسٹ کر دیے گئے۔(۲۷)

۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء: ہز ایکسیلینسی حضور گورنر جنرل صاحب بہادر مملکت محتشمہ پاکستان پنجند سے بذریعہ کار تشریف فرما قصر صادق گڑھ میں فروکش ہوئے۔ عالیجناب صاحبزادہ ولیعہد بہادر، عالیمر تبت وزیر اعظم، عالیمرتبت وزیر حضوری نے پنجند سے استقبال کیا۔ ڈیرہ مبارک میں درود مسعود پر ضرب اتواپ شاہی سلامی دی گئی۔ قصر عالیہ پر اعلیٰ حضرت نے خیر مقدم کیا۔ گارڈ آف آنر پیش

ہوا۔

ریاست بہاول پور کے جمہوری دور میں اس کی قانون ساز مجلس نے جو بھی اہم قوانین وضع کیے، انہیں با قاعدہ طور پر ایک "ہینڈ آؤٹ" کی صورت میں شائع کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں قانون شریعت کے نفاذ پر اسے درج ذیل طریقے سے مشتہر کیا گیا:

ہینڈ آوٹ

ریاست بہاول پور میں قانون شریعت کا نفاذ بغداد الجدید ۱۱ فروری ۱۹۵۰ء

" آج یہاں ریاست کی مجلس نے اپنے اجلاس کے آخری دن نفاذ شریعت اسلامیہ کے بل کو معمولی ترامیم کے بعد متفقہ طور سے منظور کیا۔۔۔ اس بل کو جو پاس ہونے کے بعد ایکٹ شریعت اسلامیہ بہاول پور ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء کہلائے گا، کے تحت ریاست میں ایک دارالافتاء قائم کیا جائے گا۔ جہاں سے بہاولپور کی تمام عدالتیں اور عوام مندرجہ بالا امور سے متعلق احکام شریعت کے مطابق فتویٰ حاصل کر سکیں گے۔۔۔ جامعہ عباسیہ جو بہاولپور کی ایک قدیم دینی درسگاہ ہے، کے " شیخ الجامعہ "، شیخ الحدیث اور شیخ الفقہ بھی دارالافتاء کے رکن ہوں گے۔ فتوے پر ان علماء کے دستخطوں کا ہونا بھی ضروری ہو گا۔۔۔ بہاولپور کے لیے یہ اقدام قابل فخر ہے کہ پاکستان میں سب سے پہلے ہماری ریاست نے شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے لیے عملی قدم اٹھایا ہے۔۔۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ دن آئے کہ اس ریاست میں مکمل نظام شرعی نافذ ہو۔(۲۹)

حکومت بہاول پور بعض فوری نوعیت کے احکامات کو عملدرآمد کے لیے مشتہر کرتی تھی۔ جنہیں ان کی اہمیت کے پیش نظر دفتری اوقات کے علاوہ پریس میں بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ ایسے احکامات کے لیے " دیر آمدہ گزٹ " کی شہہ سرخی لگائی جاتی تھی۔ ایک ایسا حکم نامہ نبی کریم ﷺ کے نام محمد کو انگریزی زبان میں مکمل لکھنے سے متعلق تھا، جسے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

دیر آمدہ گزٹ

اعلان

از چیف منسٹر

"ہمارے نوٹس میں لایا گیا ہے کہ سرکاری دفاتر میں عام طور پر انگریزی میں لفظ محمد ﷺ (Muhammad) کو مخفف استعمال کیا جاتا ہے چونکہ یہ اسم گرامی حضور ﷺ کا نام پاک ہے۔ اس لیے اس اسم مبارک کی عظمت و جلال مقتضی یہ ہے کہ اس اسم گرامی کو مخفف استعمال نہ کیا جائے ----آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم ایمان کی جز ہے۔ اس کا پورا پورا خیال رکھا جاوے(۳۰)۔

ماہ رمضان کی تکریم سے متعلق ایک اور اعلان کا انداز دیکھیئے:

اعلان

از چیف سیکریٹری بہاولپور

ماہ رمضان المبارک شروع ہونے والا ہے۔ ماہ رمضان المبارک کی تحریم و تکریم ہر مسلمان پر لازم ہے۔ نیز ریاست ہذا سے ایک قانون محض الامر مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۰ء کے حکم سے جاری شدہ بھی ہے۔ لہذا جو اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا جو ہر اہلکار پولیس جس کا عہدہ ہیڈ کنسٹیبل سے کم نہ ہو اختیار ہو گا کہ ایسے شخص یا اشخاص کو بلا وارنٹ اپنی حراست میں لے اور عدالت مجسٹریٹ مقامی میں پیش کرے جہاں سے بشر طیکہ ثبوت جرم سزائے قید محض سہ ۳ یوم یا جرمانہ مبلغ 10 روپے تک کی دی جائی گی۔(۳۱)

یہاں اس آخری مسودہ قانون کا ذکر ضروری ہے جس کے ذریعے ریاست کی مقننہ نے اردو زبان میں قانون سازی کو ختم کر کے انگریزی زبان میں قانون وضع کرنے کا ضابطہ جاری کیا:

غیر معمولی گزٹ

پاکستان بھر میں قانون سازی کا کام بزبان انگریزی عمل پیرا ہے لیکن دفعہ ۲۵۔(۴) گورنمنٹ آف بہاولپور (عبوری دستور) ریاست بہاولپور کی زبان اردو مقرر کی گئی ہے۔ریاست کے موجودالوقت قوانین کی ترتیب اور نئے قوانین کی تشکیل ودرستگی کا معیار ملک کی قانون ساز زبان سے مختلف زبان میں حاصل کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست بہاولپور میں بھی قانون سازی کے لیے وہی زبان اختیار کی جائے جو کہ ملک کے دیگر حصص میں مروج ہے۔ موجودہ مسودہ قانون اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔

سید حسن محمود

وزیر انچارج

مسودہ قانون بالا زیر قاعدہ(۹۹) منجملہ قواعد ضابطہ کار بہاولپور لیجیسلیٹو اسمبلی حکومت بہاولپور کے غیر معمولی گزٹ مورخہ ۲۳مارچ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔

حبیب اللہ خان
سیکریٹری لیجیسلیٹو اسمبلی بہاول پور(۳۲)

یقیناً اگر اسے ریاست بہاول پور میں اردو زبان کے خاتمے اور بطور سرکاری زبان انگریزی کے رائج کیے جانے کا قانون قرار دیا جائے تو یہ بے جا نہ ہو گا۔ ستم ظریفی یہ کہ اس ضابطہ کو کس بدیسی انگریز نے نہیں بلکہ ریاست بہاول پور کی اسمبلی کے ان ارکان نے وضع کیا جو بذات خود انگریزی سے زیادہ اردو زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ اس قانون سازی کے لیے خود پاکستان کی مرکزی اسمبلی کے ضوابطہ کو مثال بنایا گیا۔ یہ بات یقیناً قائد کے اس فرمان کی نفی کرتی تھی جس کے تحت آپ نے اردو اور صرف اردو کو سرکاری زبان اور ملکی اکائیوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔

خود بابائے اُردو مولوی عبد الحق نے ریاست بہاول پور میں اُردو زبان کی ترویج کو سراہتے ہوئے۔ بہاول پور کو اُردو زبان کا بوستان قرار دیا تھا۔ ریاست بہاول پور میں اردو کی بجائے انگریزی زبان کو اختیار کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ اس خطے کی سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو یہاں کے دفاتر میں بڑی کامیابی کے ساتھ کاملاً اٹھاسی سالوں (۱۸۶۶ء تا ۱۹۵۴ء) تک مروج رہی۔ ریاست بہاول پور کے گہوارے میں اس کی پرورش امیران بہاول پور کے علاوہ خود انگریز حکام نے بھی اپنے عبوری دور میں کی۔ اس طرح ایک سرکاری زبان کی حیثیت سے اس نے ان تمام تر اصطلاحات، اسلوب اور زخیرہ الفاظ پر دسترس حاصل کرلی جو کسی زبان کو دائمی طور پر قومی زبان کی حیثیت سے رائج رکھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یقیناً اگر ریاست بہاول پور کی اسمبلی، مرکزی حکومت (پاکستان) کی اندھی تقلید میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دینے کا فیصلہ اتنی عجلت میں نہ کرتی تو یقیناً حکومت پاکستان کو ریاست بہاول پور میں کامیابی سے مروج اردو زبان کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے خود ہی دفتری زبان کا درجہ دینا پڑتا۔ اب بھی ریاست بہاول پور کے محافظ خانہ میں موجود اردو کی دستاویزات، فرامین اور مراسلت کے نمونہ جات اس حقیقت کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ایک سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

حوالہ جات و تعلیقات

(1) ڈاکٹر معین الدین عقیل، منتخبات اردو نامہ (جلد اول) مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء ص:۸۷ ۸۸ ۔

(۲) راقم الحروف کو سال ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء کے دوران ریاست بہاول پور کے نظم مملکت پر اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری کے دوران دفتر دستاویزات بہاول پور میں ایک رجسٹر نقل شرایط ترسیلہ ریاستہائی غیر" کے عنوان سے نظر سے گزرا جس میں سال ۱۸۷۳ء تا سال ۱۸۸۵ء تک دوسری ریاستوں سے آنے والے مراسلات کو نقل کیا گیا تھا۔ اس رجسٹر سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے کپورتھلہ ، جموں و کشمیر، پٹیالہ ، جیند و سنگرور، مالیر کوٹلہ، ٹونک قلات، نابھہ ، نا امن، بیکانیر جیسلمیر اور خیر پور سندھ کے فرمانرواؤں نے نواب بہاول پور کو فارسی میں خط تحریر کیے۔ حتیٰ کہ وائسرائے ہند، امیر مکہ اور انگریز پولیٹیکل آفیسر متعین افغانستان نے بھی فارسی زبان میں ہی مراسلات بھیجے۔ جب کہ فرید کوٹ، لوہارو، ممڈوٹ کی طرف سے ارسال کردہ خطوط اردو میں لکھے جاتے تھے۔ مزید بر آں، چیف کمشنر پنجاب وبعد ازاں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، سیکریٹری پنجاب، کمشنر ملتان، گورنر بمبئی، کمشنر سندھ اور ملتان، ڈیرہ غازی خان اور سرسہ کے ضلعی افسران کی خط و کتابت ۱۸۷۳ء سے ۱۸۵۹ء تک اُردو میں ملتی ہے۔

3. مولوی محمد اعظم، دیوان اعظم، بہاول پور 1911ء

(۴) محافظ خانہ سابق ریاست بہاول پور، فائیل تصفیہ سرحد متنازعہ بیکانیر و بہاول پور ٦ جنوری ۱۸۴۷ تا ۱۲ اکتوبر ۱۸۴۸ مراسلہ نمبر ٦٨ ، ص ٦٨

تفصیل کے لیے دیکھیے " فائیل تصفیہ سرحد متنازعہ بیکانیر و بہاول پور

سابقہ ریاست بہاول پور کے دفتری ریکارڈ کو "ضابطہ اخلاف ریکارڈ چہل سالہ " کے تحت یا تو نیلام کر دیا گیا اور یا اسے آگ لگا دی گئی۔ معدودے چند فائیلیں سال ۱۸۸۶ء تا ۱۸۸۷ء کے دوران مختصر عرصے کے لیے قائم ہونے والے دفتر دستاویزات بہاول پور کے ریسرچ آفیسر محمد رمضان نے محفوظ کیں مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہ شعبہ بھی ختم کر دیا گیا۔

(7) سید مراد شاہ گردیزی: -آپ ملتان کے گردیزی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ضلع ملتان میں تحصیل دار اور ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر تعینات رہے۔ اکتوبر ۱۸65ء میں ریاست بہاول پور میں نیٹو پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے۔ ریاست میں انگریزی مداخلت (۱۸۶۶ء تا ۱۸۷9ء) کے عرصہ کے دوران اسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ، ناظم اور یہاں کی پہلی صدر عدالت کے صدر جج کے طور پر ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۶ء تک خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے ریاست بہاول پور کے جدید نظام حکومت کی تشکیل میں بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ مگر مراد شاہ کا سب سے اہم کارنامہ ریاست بہاول پور کے تمام دفاتر میں اردو کا نفاذ تھا۔ وہ ریاست کے پہلے عہدہ دار ہیں جنہوں نے دفتری مراسلت، قانون سازی اور عدالتی فیصلوں کے ابتدائی نمونے وضع کیے۔ ان کی طرز پر ریاست بھر کے تمام عہدہ داران نے اردو میں دفتری وعدالتی کارروائی کا طریقہ کار اختیار کیا۔

8. مراد شاہ تاریخ مراد (جلد چہارم) اردو مخطوطہ، ص ۴۱۔

9. حیات ترین پریشان جلونے عزیز المطابع بہاول پور، ۱۹4۵ء، ص ۹۔

(۱۰) اس اردو دان طبقہ میں سے اشرف علی گورگانی نے بہاول پور کی تاریخ ۱۸۹۹ء میں "صادق التواریخ" کے نام سے تحریر کی، وہ دربار بہاول پور میں میر منشی کے عہدے پر بھی فائز رہے اور اپنی اس حیثیت سے درباری مراسلت کو انتہائی پر شکوہ اسلوب سے مرصع کیا۔ میر اشرف علی نے نواب صادق محمد خاں رابع کے اتالیق کی حیثیت سے انہیں اردو سے قریب کیا اور ۱۸۸۹ء میں کتاب "

جغرافیہ ریاست بہاول پور، تحریر کی۔ میر واجد علی زار نے ریاست بہاول پور کے مطبع صادق الانور کے مہتم کی حیثیت سے نام کمایا۔ جب کہ ارشاد نبی قریشی نے اعلیٰ مناصب پر فائز رہتے ہوئے یہاں کی دفتری اردو کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

(11)چارلس چیری منچن : -(پہلے لیفٹینینٹ بعد ازاں کرنل منچن) آپ انڈین سول سروس سے وابستہ تھے ۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۶ء کے دوران ضلع ڈیرہ غازی میں اسٹنٹ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے عہدوں پر فائز رہے۔ ریاست بہاول پور میں انگریزی مداخلت کے دوان ۱۸۶۶ءسے ۱۹۷۲ءتک اسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ اور پولیٹیکل ایجنٹ و سپر نٹنڈنٹ کے طور پر خدمات انجام دیں۔ آپ کو ریاست بہاول پور میں انگریزی نظام حکومت کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے ریاست بہاول پور میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرانے میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ ریاست میں اردو زبان کے سب سے پہلے سرکاری اخبار اور گزٹ صادق الاخبار گزٹ کا اجراء کیا اور اردو کی ترویج کے لیے ۱۸۷۷ء میں سرکاری چھاپہ خانہ صادق الانوار پریس قائم کیا۔ کرنل منچن ۱۸۸۵ء میں کمشنر لاہور کے منصب سے ریٹائر ہوئے۔

(۱۲) خط کرنل منچن ۱۴،نومبر ۱۸۷۲ء، محافظ خانہ ریاست بہاول پور۔

(۱۳) محافظ خانہ بہاول پور، رجسٹر اہم خطوط ددستاویزات، خط والدہ نواب صادق محمد خال رابع، یکم نومبر ۱۸۷۳ء، خط نمبر ۲۔

(۱۴) ۷۵ صفحات پر مشتمل صاحبزادہ احمد خان عباسی کی تعلیمی کیفیت اور معمولات سے متعلق یہ ڈائری محافظ خانہ بہاولپور میں

موجود ہے۔ اس میں ۱۴ استمبر 1876ء سے سے جون ۱۸۷۶ء تک کے واقعات اُنکے اتالیق رحیم بخش نے تحریر کیے ہیں۔

(۱۵) محمد عزیز الرحمن عزیز صبح صادق، حالی پریس پانی پت، ۱۹۰۰ء، ص۷۹-۸۰

(۱۶) محافظ خانہ بہاول پور، ترجمہ چٹھی، انگریزی وائسر ائے صاحب چٹھی نمبر ۱۸، آمدہ مورخہ ۵ جنوری ۱۸۸۰ء۔

(۱۷) فائل صادق الاخبار گزٹ،۲۹ / اپریل ۱۸۷۸ء ص ۲۰۳۔

(۱۸) ایضا، یکم جولائی ۱۸۷۸، ص ۳۱۲

(۱۹) ایضاً، ۹ فروری ۱۸۷۸ء ص ۳

(۲۰) ایضاً، ۱۹ جون ۱۹۰۲ء صا

(۲۱) ضمیمہ صادق الاخبار، ۶ دسمبر ۱۹۲۳، ص ا

(۲۲) صادق الاخبار گزٹ،۲۹ تمبر ۱۹۲۷ء، ص۷

(۲۳) ایضاً ۲۳ جنوری ۱۹۳۰، ص ا

(۲۴) گورنمنٹ گزٹ بہاول پور ۲۴ دسمبر ۱۹۳۹، ص ا

(۲۵) ایضاً، ۱۲ دسمبر ۱۹۴۶، ص ا

(۲۶) ایضا، ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸، ص ا

(۲۷) واضح ہو کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کو ریاست بہاول پور نے جامعہ عباسیہ کا نصاب مرتب کرنے کے لیے دعوت دی تھی۔ منصوبہ تھا کہ بہاول پور کی اس دینی درسگاہ کو "جامعہ اظہر" جیسی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی بنایا جائے لیکن افسوس کہ مولانا کا یہاں کے سرکاری مہمان خانہ "عباس منزل" میں انتقال ہو گیا۔

(۲۸) گورنمنٹ گزٹ بہاول پور، ۵ جنوری ۱۹۵۰ء، ص ا

(۲۹) ایضاً، ۱۶ فروری ۱۹۵۰، ص ۲

(۳۰) ایضاً،۱۵جنوری ۱۹۵۳ء ص۶

(۳۱)ایضاً، ۷ مئی ۱۹۵۳، ص۸۹

(۳۲)ایضاً، ۲۳مارچ ۱۹۵۳ء ص۱

خطہ بہاولپور کی تہذیبی اور ثقافتی روایات

سید ہاشم رضا نے بہاولپور سے متعلق کیا خوب کہا ہے

"عجب خطہ الفت ارض بہاولپور

یہاں کے آب میں لذت ہے اور ہوا میں سرور

یہاں کے دوست ہیں مخلص، وفاشعار، شفیق

غم جہاں کا مداوا، یہاں کے طور وطریق

بہار رقص کناں اس کے سبزہ زاروں میں

ہے نئی اس کے ریگزاروں میں"

اگر چہ شہر بہاولپور کو قائم ہوئے 274 سال کا عرصہ گزرا ہے لیکن اثری قدامت کے لحاظ سے یہ شہر جس خطے میں واقع ہے وہ کم وبیش 4000ق م کی ہاکڑائی تہذیب کا گہوارا سمجھا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ بات واضح ہو کہ یہ خطہ وادی سندھ کی ترقی یافتہ تہذیب کے حامل دوبڑے مراکز موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے وسط میں آباد ہے۔ اس طرح یہ علاقہ اور یہاں کے باسی خاصے عرصے تک قدیم بدھ دور اور ہندو دور کے معاشرتی اور ثقافتی اثرات کے تابع رہے۔ پھر 712ء میں جب باب الاسلام سندھ کے راستے اسلام کا ورود ہوا تو اسلامی تہذیب وتمدن نے غلبہ حاصل کیا۔ جب 1748ء میں نواب بہاول خان اول نے اس شہر کی بنیاد رکھی تو اس کا نام دار السرور بہاولپور رکھا۔ امیران بہاولپور نے عراق و عرب کے تمدن و معاشرت کو اسی سلیقے سے متعارف کرایا کہ اس کی جھلک آج بھی کسی نہ کسی صورت میں یہاں کے باسیوں کا خاصا ہے۔ انہی اثرات کے تحت خود یہاں کے آخری نواب نے بہاولپور کا سرکاری نام "بغداد الجدید" رکھا۔

اگر باریک بینی سے مشاہدہ کیا جائے تو یہاں کے صحرا کی مناسبت سے بہاولپور کی ثقافت پر ہندوستان کی بجائے عراق و عرب کے اثرات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک دور میں یہاں لوگ عراقیوں کی طرح لباس میں بالاپوش استعمال کرتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی، سادہ لوحی، اونٹوں اور گھوڑوں سے محبت، اپنے کھیتوں میں قدرتی عناصر کا کثرت سے ذکر، کہانیوں میں شیخ سعدی کی حکایات اور شیخ چلی کے لطائف انہی روایات کا حصہ ہیں۔ اس شہر کے لوگ عورت گیت اور خوشبو کے بہت شائق رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج تھا۔ یہاں کی مانیں سر شام پابہ، موتیا اور گلاب کے ہار گھر گھر جا کر فروخت کرتیں اور امیر و غریب عورت و مردان پھولوں کو اپنے گلے، بالوں اور کلائیوں کی زینت بناتے۔ شادی بیاہ کے موقع پر یہ ہار دولہا دولہن کو کثرت سے پہنائے جاتے اور ہر باراتی کے گلے میں ڈالے جاتے۔ مانیوں کی روانگی اور واپسی پر ان کی پذیرائی پھولوں کے ہاروں سے ہوتی۔ غرضیکہ ہر خوشی، شادی اور مرگ پھولوں کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی تھی یہ آج بھی یہ روایات شہر بہاولپور کے باسیوں کا خاصا ہیں۔

الیکٹرونک میڈیا کی آمد سے پہلے یہاں کے لوگوں کی زبان پر مقامی گیت اور کافیاں ہوتیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر مرامنیں طبلے کی تھاپ پر گیت گاتیں، بارات میں مولودی ہوتے، نکاح عام طور پر محلے کی مسجد میں ہوتا۔ اس موقع پر چھوارے پھینکے جاتے۔ نقارے کی تیز تیز آواز میں کئی کئی روز تک ہر نئی شادی کی اطلاع دور دور تک پہنچاتی رہتیں۔

ایک دور تک اس علاقے کی ثقافت کا اہم عصر کھجور کے درخت رہے ہیں۔ یہ درخت اس خطے سے گزرنے والے عربوں کی نشانی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بہاولپور شہر بسایا گیا تو دور سے کسی نخلستان کا منظر پیش کرتا تھا۔ اس درخت کے پتوں سے گھریلو عورتیں ٹوکریاں، دستی پنکھے، چٹائیاں، رسیاں، بان اور چھابیاں تیار کرتیں تھیں۔ اس علاقے میں زیادوتر مکان جو کچے ہوتے تھے ان کی چھتوں کی

تیاری میں اسی درخت کے شہتیر اور پتے استعمال ہوتے تھے۔ پھر محرم کے موقع پر لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں پر اس کی چھڑیاں ڈالتے حتی کہ کھجور کے درخت نے یہاں کے تمدن میں اس قدر رسوخ حاصل کیا کہ والیان بہاولپور نے اپنے سکوں اور سرکاری نشان ٹیسٹ کریسٹ پر اسے کندہ کرایا۔

چادر اور چار دیواری کے تحفظ نے اس خطے کی کی ثقافت کو پردے سے روشناش کرایا۔ ون یونٹ کے قیام سے پیشتر یہاں کی عورتیں بازاروں میں نظر نہیں آتی تھیں۔ البتہ اپنے ہی محلے میں آمد ورفت کے دوران وہ ٹوپی والا برقعہ اور میں جس کی آنکھوں والی جگہ روزن نما جالی ہوتی۔ یہ برقعہ دور سے ایک چلتے پھرتے جیسے کا سماں پیش کرتا۔ اس حالت میں بھی پیروں کو چھپانے کیلئے جرابیں استعمال کی جاتیں۔ ٹانگے میں سفر کی صورت میں اور بھی احتیاط برتی جاتی۔ اسے چاروں طرف سے دبیز چادروں یا کھیوں سے ملفوف کیا جاتا۔

کوچوان پشت کرکے کافی فاصلے پر جا ٹھہرتا۔ مردوں کی آمد ورفت اخلاقاً رک جاتی۔ دروازے سے ٹانگے تک گھر کے مرد چادریں تان کر کھڑے ہو جاتے اور پھر برقعہ پوش خواتین انتہائی نگہداشت سے اس میں سوار کرائی جاتیں۔ حتی کہ جب نواب صاحب کی انگریز بیگم ان کے ہمراہ موٹر میں سوار ہوتیں تو عوام کیلئے لازم تھا کہ وہ سڑک کی طرف پیٹھ کرکے دم سادھے کھڑے رہیں تاوقتیکہ سواری آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اس ضابطے کی ذرا سی بھی خلاف ورزی مواخذے اور عتاب شاہی کا باعث ہو سکتی تھی۔

دروازے پر دستک کی صورت میں اگر مرد گھر میں موجود نہ ہوتا تو خاتون خانہ کسی سوال وجواب کے بغیر اندر سے تالی بجائیں۔ اس طرح انہی روایات کے پیش نظر آج بھی جب کوئی معمار عمارت کی

تعمیر کی غرض سے دیوار یا مکان پر چڑھتا ہے تو وہ تین بار پردے کیلئے یہ آواز لگاتا ہے کہ "پردے آلے پردہ کرو درکھان مزدور کوٹھے تے چڑھدے"۔

یہ وہ روایات ہیں جو بہاولپور کے علاوہ کہیں اور رائج نہیں۔ جب نواب بہاول خان خامس نے 1906ء میں لڑکیوں کی تعلیم کیلئے بہاولپور پور میں ایک سکول کھولا تو اس موقع پر پردہ پوش رتھ کا انتظام کیا گیا۔۔ ایک عمر رسیدہ دائی اماں بھی ہمراہ ہوتیں جو بچیوں کو اپنی حفاظت میں گھر سے لانے اور واپس چھوڑنے کی ذمہ دار تھیں لیکن اس کے باوجود پردے کی سخت قیود کی وجہ سے لڑکیوں کی تعداد خاصی محدود رہی۔

جب گذشتہ صدی کے نصف میں تعلیم نسواں کی اہمیت واضح ہوئی اور کالج تک کی تعلیم کا اہتمام ہوا تو بہاولپور شہر کی سڑکوں پر طالبات کو لانے اور لے جانے کیلئے ایک ایسی بس رواں ہوئی جس کی ہیت بالکل ایسی تھی جیسی کہ آج کل جیل سے قیدیوں کو لانے والی کسی بس کی ہوتی ہے۔ اس کے انجن کو سٹارٹ کرنے کیلئے ایک دستی سریے کا لیور استعمال ہوتا جسے ہر بار انجن میں ڈال کر گھمایا جاتا تو یہ بس اگلی منزل کی طرف بڑھنے کیلئے آمادہ ہوتی۔

اس خطے کے لوگ انتہائی خلیق من سار اور منکسر المزاج ہیں۔ وہ بڑے بزرگوں، پیروں سیدوں اور استادوں کو ملتے وقت ان کے قدموں پر ہاتھ رکھتے ہیں یا کم از کم انکے گھٹنوں کو ضرور چھوتے ہیں۔ اس میں جبر دا کراون نہیں بلکہ دلی عقیدت کے اظہار کو بڑا عمل دخل حاصل ہے۔ اس طرح ملاقات کیلئے آنے والا اگر بڑا ہو یا چھوٹا اس کی پذیرائی سر وقد کھڑے ہو کر کی جاتی ہے۔

اس طرح سے اگر ملاقاتی کوئی بڑی عمر کا بزرگ ہو یا ذی مرتبہ وذی وقار شخصیت تو کئی قدم آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس طرح رخصتی کے وقت بھی کچھ فاصلہ تک ہمراہی اختیار کی جاتی ہے۔ اس قسم کے ادب و آداب امیر ان بہاولپور سے بھی منسوب ہیں۔ خود اس ریاست کے آخری

فرمانروا صادق محمد خان خامس اپنی دادی حضرت مائی صاحبہ، اپنی بہن اور اپنے چچا کو ملتے ہوئے ان کے پاؤں کو چھوتے تھے۔

نواب موصوف اپنی بہن شہزادی مہر الہی کو جو ان سے صرف ایک سال بڑی تھیں، بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ وہ انہیں "کاکابی بی" کے نام سے مخاطب ہوتے۔ ان کے سامنے چینٹ میں ملبوس ہو کر جانا سوئے ادب سمجھتے۔ اگر وہ پلنگ پر بیٹھی ہوتیں تو وہ نیچے قالین پر بیٹھتے۔ شہزادی صاحبہ کے خاوند کرنل معتصم باللہ عباسی نے راقم کو ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ یہ صورت حال میرے لئے بڑی عجیب ہوتی۔ اگر میں نواب صاحب کی موجودگی میں اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھتا تو یہ خلاف ادب تھا اور اگر نواب صاحب کے ہمراہ نیچے نشست رکھتا یا کھڑا رہتا تو یہ بھی نامناسب ہوتا اس لیئے ایسے موقعوں پر میں کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے باہر آجاتا۔

اس خطے کی ثقافت پر سرائیکی زبان کی خاصی چھاپ ہے۔ میں کے لفظ میں جو مٹھاس ہے وہ جناب یا سر جیسے الفاظ میں نہیں ملتی۔ اس طرح بڑے کو " کاکا "کاکی یا لالہ، کے الفاظ سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ بیٹوں اور بیٹیوں یا عمر میں اپنی اولاد کے برابر بچوں کیلیئے آیا اور اماں جیسے الفاظ کا استعمال چھوٹوں سے پیار اور انکی تکریم کے مترادف ہے۔ اس طرح خالہ زاد کو" مسات "چازاد کو سوتر اور ماموں زاد کو" ملیر " کہنے میں بڑی بے تکلفی اور اپنائیت ہے۔ یہ اور اس اس قسم کی اور دیگر تہذیبی روایات سے اس خطے کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔

ریاست بہاول پور کے شاہی کتب خانے

بر صغیر پاک و ہند میں خطہ بہاول پور کو علم و عرفان کے ایک اہم مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کے نوابین، مشائخ کرام اور اہل علم و دانش نے علم وادب کی مشعلیں روشن کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس مقصد کے لیے اپنے نجی کتب خانے قائم کیے۔ ان میں سب سے قابل ذکر امیر ان بہاول پور کی لائبریری تھی۔ جسے "شاہی کتب خانہ سیا کتب خانہ سلطانی" کے نام سے تخصیص حاصل تھی۔ تاریخی واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شاہی کتب خانے کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب نواب محمد بہاول خان اول نے ۱۷۴۸ء میں دار السرور بہاول پور کے نام سے اپنے دار الحکومت کی بنیاد رکھی۔ یہ کتب خانہ بہاول پور شہر کے موجودہ محلہ باغ ماہی کے مقام پر امیر ان بہاول پور کی پہلی رہائش گاہ شیش محل میں قائم کیا گیا تھا۔۱۷۷۹ء میں جب بادشاہ کابل تیمور شاہ کی فوج نے بہاول پور کو تخت و تاراج کیا اور شہر کو آگ لگادی تو شاہی عمارات کے ساتھ یہ کتب خانہ بھی خاکستر کر دیا گیا۔ تاہم نواب حمد بہاول خال ثانی نے اپنے مطالعہ کے شوق کو پورا کرنے کے لیے قلعہ ڈیرا اور میں شاہی کتب خانے کی بنیاد رکھی۔ ریاست بہاول پور کے ابتدائی تاریخی ماخذ مراۃ دولت عباسیہ کے مطابق اس کتب خانے میں حدیث وفقہ کے علاوہ عربی اور فارسی کے کئی نادر خطوطات موجود تھے۔ نواب محمد بہاول خاں خانی کے علمی ذوق کے پیش نظر ایک بار سندھ کے ہم عصر مال ہو امیر نے اسے آتش کدہ ایران کے نام سے ایک نادر قلمی مخلوط از سال کیا۔ نواب بہاول خان ثانی کے عہد میں دوسرا بڑا کتب خانہ احد پور شرقیہ کے شاہی قلعے میں قائم تھا جہاں زیادہ تر تاریخ کی کتب تھیں۔ اس طرح امیر ان بہاول پور کے دور میں نواب محمد بہاول خاں ثالث بالخیر کا عرصہ حکومت علمی و دینی اعتبار سے ایک درخشاں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ نواب مذکورہ نے نا صرف ریاست بھر میں جامع مساجد اور ان کے ساتھ مدارس قائم کیے بلکہ اپنی علمی تنگی کو بجھانے

کے لیے بہاول گڑھ شرقیہ کے مقام پر ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا۔ وہ ہر نئی آنے والی کتاب کے سرورق پر اس کی "تاریخ ادخال" کا اندراج اپنے دستخط سے کرتا تھا۔ نواب محمد بہاول خان ثالث نے مولوی محمد اعظم کو درباری مورخ کے عہدے پر تعینات کیا۔ اسی مورخ نے فارسی زبان میں جواہر عباسیہ" یا" تذکرۃ الخواتین کے عنوان سے امیر اپنا بہاول پور کے حالات تحریر کیے۔

نواب محمد بہاول خاں ثالث نے اپنے ہاتھ سے اس مخطوطے پر حواشی اور سرخیاں تحریر کیں، اور اپنے کتب مانے میں داخل کرنے کی تاریخ درج کی۔ یہ نادر مخطوطہ تاریخِ بہاول پور کا ابتدائی ماخذ شمار ہوتا ہے۔ ۱۸۴۲ء میں جب میں ہندوستان کے صوبہ یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر ٹی سی رابرٹسن دریائی راستے سے بہاول پور پہنچا تو اس کی فرمائش پر بہاول خاں ثالث نے اپنے کتب خانے سے جواہر عباسیہ "کا ایک نسخہ اسے پیش کیا۔ نواب کی کتابوں سے دلچسپی کا اندازہ کرتے ہوئے گورنر مذکورہ نے واپسی پر اس کے کتب خانہ کے لیے انگریزی اور فارسی کی متعدد کتابیں تحفہ کے طور پر بھیجوائیں۔ مگر ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۶ء تک کا دور ریاست بہاول پور میں خانہ جنگیوں اور اندرونی خلفشار کا دور تھا۔ اس لیے امیر ان بہاول پور اس دور میں اپنے متعدد مقامات پر واقع شاہی کتب خانوں پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ اسی دوران قلعہ سیر کی کتب خانہ کی تہ خانے میں تل کر دیا گیا۔ جہاں امارت کی تنگی کی بنا پر زمین بہ ہو گیا۔ تاہم اس کتب خانے کے کچھ حصے کے بازیابی کم و بیش پچاس سال بعد ۱۹۰۳ء میں کھدائی کے دوران ہوئی۔ اگرچہ اس وقت تک اس علمی خزینے کا معتدبہ حصہ ضائع ہو چکا تھا مگر نادر طلائی مخطوطات پر مشتمل تفاسیر، تاریخی کتب اور دستاویزات ۱۸۷ - ۹۹ کے حصہ بازیاب ہوا ہے دوبارہ شاہی کتب خانے کی زینت بنایا گیا۔ ۱۸۶۶ء کے بعد نواب صادق محمد نان اربع اور نواب محمد بہاول خاں خاص نے بہاول پور کے نور کل اور دولت، خانہ میں شاہی کتب خانے قائم کیے۔ آغاز میں یہاں چھ ہزار کے قریب کتب اور مخطوطات رکھے گئے۔ ان میں فارسی، اردو اور انگریزی کی کتابیں

اور مآخذات شامل تھی جبکہ "توشتہ خانہ کی لائبریری یا عام کتب خانہ" کے نام سے ایک علیحدہ لائبریری بھی موجود تھی۔ ان کتب خانوں میں نظم و نثر، حیوانات، نباتات، افسانہ، ناول، ڈرامہ، سوارخ، سفر نامہ، تاریخ، فنون، شکار، مردانہ کیمیاوں، علم تاب علوم طبیعہ یہ وفلا سفہ علم وادب، جغرافیہ، اور زبان وعلوم کی کتابیں اور قلمی مخطوطات شامل تھے۔

ریاست بہاول پور کے آخری نواب، صادق محمد خامس نے بھارتی گڑھ پیلس میں ایک شاندار لائبریری قائم کی اور اسے "کتب خانہ سلطانی" کا نام دیا۔ آپ نے دوسری لائبریری ڈیرہ نواب کے قدیم محل میں قائم کی جسے بیرونی کتب خانہ کہا جاتا تھا۔ ان کا کیر برایوں میں ایک تقابل اندازے کے مطابق چھتیس ہزار کے قریب نایاب کتب ادر نادر مخلوطات جمع تھے۔

نواب صاحب کے کتابوں سے شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ سال بھر ملکی اور غیر ملکی اشاعت خانوں کی ارسال کردہ فہرستوں میں سے کتابوں کا انتخاب کرتے اور ان میں سے ہر کتاب کے تین نسخے خرید کیے جاتے۔ ان میں سے ایک نسخہ صادق گڑھ پیلس کے کتب خانہ سلطانی میں رکھا جاتا، دوسرا اسینٹرل لائبریری بہادل پور اور تیسرا ایس ای کالج کی لائبریری میں محفوظ کیا جاتا۔ اس کے علاوہ آپ ہر سال یورپ کے سفر کے دوران وہاں جو کتابیں اپنے بھی کتب خانے کے لیے خرید کرتے وہ کئی بکسوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔

اس طرح امیر ان بہاول پور کی ذاتی کاوشوں اور زر کثیر کے صَرف سے صادق گڑھ پیلس کے "کتب خانہ سلطانی" میں قدیم قلمی مذہبی کتابیں، مصاحف، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف علم کلام، تاریخ وادب کے بے بہا جواہر، فارسی ادب اور عادم مصدوہ کی قلمی اور باتصویر مح بلات، نادر روز گار اور کامیاب تصنیفات کے کثیر التور او مرقع جات مجمع ہوئے۔ ان اندوختہ نایاب قلمی مخلومات میں کلیات ابنِ یمین کا مکمل نسخہ، خطِ قدیم میں تحریر کردہ تفسیرِ کشاف اور جامع صحیح مسلم شریف کے چند ابتدائی

نسخہ جات علم الانساب اور اسماء الرجال کے فن پر تحریر کردہ حجم کبر طبرانی کا قدیم مخطوطہ جو کابل کے حکمرانوں کے کتب خانے میں رہا تھا، شاہی کتب خانہ ڈیرہ نواب صاحب کی زینت بنا۔

اس کے علاوہ عربی کا آٹھویں صدی ہجری میں تحریر کروہ اخلاق، تصوف اور اسلامی تصویر روحانیت کا نادر عمونہ "کتاب الازکار" کے نام سے محفوظ تھا۔ اس طرح ہندوستان کے پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے فرزند سلطان مرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا فاری مخطولہ مجالس العشاق بھی کتب خانہ سلطانی میں موجود تھا۔ اس قیمتی نسخے میں متر (۷۷) اولیائے کرام کے حالات درج تھے۔ علاوہ ازیں، بزرگان اوچ سے متعلق تین اہم نادر مخطوطات خزانہ جلالیہ جواہر جلالیہ "اور "تحفۃ الاسرار" کے نام سے موجود تھی۔ اس طرح اولیائے اوچ کے دیگر مانفوظات، کتوبات اور کتب کا ایک، اختر مینہ بھی محفوظ تھا۔

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو کہ صادق گڑھ پیلس کی شاہی لائبریری میں خود حضرت خواجہ حافظ خدا بخش کی تصوف کے موضوع پر کتب توفیقیہ اور رفیقیہ بھی موجود تھیں۔

کتب خانہ سلطانی ڈیرہ نواب کے دیگر اہم مخطوطات میں نواب محمد بہاول خاں ثالث کے درباری شاعر اور حکیم غلام سرور کا فارسی دیوان "مثنوی بہاء عشق مشہور ہے۔ علاوہ ازیں یہاں جانوروں اور پرندوں کے پالنے، ان کا شکار کرنے اور ان کے علاوہ لاج و معالجہ سے متعلق علمی فارسی کتب موجود تھیں۔ جب کہ خواص الادویہ یعنی میٹریا میڈیا کے طور پر سرائیکی زبان میں ایک نایاب مخطوطہ متحد نجومیہ طب کے عنوان سے محفوظ تھا۔ یہاں برصغیر پاک وہند کے ایک نامور خطاط اور بنیاش مولانا عزیز الدین عزیز کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو نواب صارق عمر نال رائی اور نواب محمد بہاول خان کے درباری سے وابستہ ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں اپنی بے مثال پیش نویسی کے فن کی وجہ سے یاقوت قلم کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ وہ بیک وقت ایک ماہر فن خطاطی ہونے

کے ملاوہ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر، ادیب، کامل، علم جفر کے ماہر اور تاریخ گو تھے۔ ۱۸۹۵ء میں مولانا عزیز الدین کی دو سو اشعار پر گزریر کردہ "مثنوی صادق شاہی کتب خانے کی زینت بنی۔ اس مثنوی میں حمد بھی ہے، نعت بھی، مناقب صحابہ بھی اور مدح نواب صادق محمد خاں رابع بھی۔ روانی کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ فصاحت و بلاغین کا ایک سمندر ہے جو انڈا اچلا آرہا ہے، ساری مثنوی پڑھ جایئے، ایک شعر بھی ایسا نہ ملے گا جس سے تاریخ گوئی کا اشف ظاہر ہو۔ مولانا عزیز کے ہاتھ سے نقاشی اور زر نگاری کے کام والا کلام اللہ کا نادر نسخہ اور دیوان حافظ جنہیں عجائبات خطاطی میں شمار کیا جاتا تھا، شاہی لائبریری کی زینت تھی۔ واضح ہو کہ ان میں ہے دیوان حافظ کے ہر صفحہ کے نقوش و نگار دوسرے صفحے سے مختلف تھے۔ مولانا عزیز کا فن خطاطی آپ کے تحریر کردہ دیوان خواجہ غلام فرید میں بھی نمایاں تھا۔ مولانا عزیز الدین نے نواب صادق محمد خاں رابع کی فرمائش پر باز نامہ ناری کا اردو ترجمہ کیا اور اسے اپنی طلائی قلم کاری سے مزین کرکے نواب صاحب کو پیش کیا۔

اس کے علاوہ اپنا سفر نامہ حج بھی لکھ کر نذر کیا۔ جو شاہی کتب خانے میں ایک انمول اضافہ تھا۔

کتب خانہ شاہی میں تاریخ بہاول پور کے تمام ماخذات قلمی صورت میں موجود تھے۔ ان میں دولت رائے کی مراۃ دولت عباسیہ مولوی محمد اعظم کی جواہر عباسیہ اور منشی اورھے بھان مردانہ کی تاریخ بہاول پور" جسے فارسی زبان کے مخطوطے شامل تھے۔ کتب خانہ سلطانی میں موجود سید مراد شاہ گردیزی کی تحریر کردہ پانچ جلدوں پر مشتمل تاریخ مراد کا ذکر بھی ضرور معلوم ہوتا ہے۔ جو تاریخ بہاول پور پر اردو زبان میں لکھی جانے والی پہلی تصنیف ہے۔ اس طرح مغل شہزادہ مرزا اشرف گور گانی اور مولوی محمد دین کی کتاب "صادق التواریخ اور مولوی عزیز الرحمن کا قلمی اردو مخطوطہ صبح صادق کے نام سے موجود تھا۔

غرض کہ امیر ان بہاول پور نے ان مخطوطات اور علمی ذخائر کو اپنے نجی کتب خانوں میں محفوظ کیا۔ نواب صادق محمد خان خامس نے خصوصیت سے صادق گڑھ پیلس کے کتب خانہ سلطانی کو مزید وسعت دی آپ کی۔ وفات کے بعد یہ عظیم الشان کتب خانہ آپ کے ورثاء میں تقسیم ہونے کے فیصلہ کے عملی اطلاق کے لیے مسلسل میں برسوں تک سیل رہا۔ یہ عرصہ یقینا صدیوں کی قلمی جمع پونجی کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جسے اس دوران وکمک اور سیلین کی تباہ کاریوں، آتش زدگی اور منتظم سارقوں کی ڈاکہ زنی نے برباد کر دیا۔ سال ۲۰۰۴ء میں شاہی کتب خانہ کی بچی -کچی کتب اور مخطوطات کو نواب صادق خامس کے قانونی ورثاء میں گھڑیوں کی شکل میں باندھ کر تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح صادق گڑھے پیۓ ملیس کا یہ بیش بہا علمی خزینہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے معدوم ہو گیا۔

ضلع رحیم یار خان کی کہانی، ماخذات کی زبانی

ضلع رحیم یار خان سابق ریاست بہاولپور کا ایک اہم خطہ رہا ہے۔ اس کی تاریخ، ثقافت، معاشی حالات، صحت عامہ، انتظامی امور، آب و ہوا، مذہبی و سماجی حالات صدیوں پرانی روایات کے امین رہے ہیں وہ کیا حالات تھے کہ ویرانے شہروں میں تبدیل ہوئے ہیں۔ اور شہر بے آباد ہو گئے پھر ان کھنڈرات پر نئے شہر اور قریے آباد ہوتے گئے ان سب واقعات پر وقت کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہی مضمون میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے تاہم کوشش کی جاتی ہے کہ اس خطے کی کم و بیش سوڈیڑھ سو سالہ گزشتہ حالات
کی کچھ جھلکیاں پیش کی جائیں۔

آبادی

1900ء کی مردم شماری کے مطابق اس علاقے کے اہم شہروں کی آبادی درج ذیل تھی۔

خانپور کی کل آبادی آٹھ ہزار چھ سو گیارہ 8611 نفوس تھی جس میں میں مردوں کی تعداد چار ہزار ایک سو پچانوے 4195ء اور خواتین کی تعداد تین ہزار تین سو اٹھاسی 3388 تھی۔

احمد پور لمہ = آبادی کے لحاظ سے اسی علاقے میں دوسرے نمبر کا شہر تھا۔ جس کی کل آبادی پانچ ہزار تین سو تنتالیس 5343 تھی جبکہ مرد آبادین کی تعداد دو ہزار آٹھ سو انتالیس 2839 اور عورتوں کی تعداد دو ہزار پانچ سو چار 2504 تھی۔

گڑھی اختیار خان = آبادی کے اعتبار سے تیسرے نمبر کا شہر تھا جس کی کل آبادی چار ہزار نو سو انتالیس 4939 تھی جس میں مرد آبادی دو ہزار چھ سو ترانوے 2693 اور عورتوں کی آبادی دو ہزار دو سو چھیالیس 2246 تھی۔

نوشہرہ (موجودہ رحیم یار خان) = جو آبادی کے لحاظ سے اس وقت اس علاقہ میں چوتھے درجے کا تھا شہر کی کل آبادی چار ہزار چار سو پچھتر 4475 نفوس تھی جس میں مردوں کی تعداد دو ہزار پانچ سو بتیس 2532 تھی جبکہ عورتیں ایک ہزار نو سو تنتالیس 1943 تھی۔

اللہ آباد (بشمول موجودہ لیاقت پور - اس علاقے کا۔ سب سے کم آباد شہر تھا جہاں کل نفوس دو ہزار آٹھ سو اڑسٹھ 2868 تھے اس میں مردوں کی تعداد ایک ہزار پانچ سو تراسی 1583 اور عورتوں کی تعداد صرف ایک ہزار دو سو پچاسی 1285 تھی۔

زبانیں

یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1898.99 میں جب ہندوستان بھر کی طرح ریاست بہاولپور میں بھی۔ زبانوں کا مردے ہوا اور آٹھ میل کے فاصلے پر آباد افراد کی زبانوں سے متعلق جو اعداد و شمار سامنے آئے ان کے مطابق

1 -ملتانی، بہاولپوری۔

2 - مارواڑی یار اٹھی (راجستھانی زبان)۔

3 -سندھی۔

4 - کچھ تعداد میں پشتو اور بلوچی زبان بولنے والے بھی تھے۔

5 - ہندوستان (اردو بولنے والے بھی معدودے چند تھے۔

آب و ہوا

ویسے تو ریاست بھر میں محکمہ موسمیات کا وجود ملتا ہے جو کہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک شعبہ تصور ہوتا تھا بہاول وکٹوریہ ہسپتال قائم شدہ 1906ء کی پرانی عمارت پر ہوا کا رخ دیکھنے اور بارش کی پیمائش کے آلات اب تک نظر آتے ہیں۔ اس محکمہ کے ذریعے روزانہ کی موسمیاتی رپورٹ مرتب کر کے

صادق الاختبار گزٹ میں شائع کرائی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں ضلعی سطح پر بھی میڈیکل آفیسر موسمیاتی رپورٹ مرتب کرنے کا ذمہ دار تھا۔ مثلا" 9مارچ 1905ء کو خانپور میں 16 انچ بارش ہوئی تو اس رپورٹ کو میڈیکل آفیسر کے توسط سے صادق الاختبار گزٹ میں دیا گیا۔ موجودہ رحیم یار خان میں ریاست بہاولپور کے دوسرے علاقوں کی طرح بارش کم ہی برستی تھی۔ لیکن اپریل 1910ء کے دوران کوٹ سبزل میں لیموں کے سائز سے لے بیضہ مرغ تک سائز کے برابر اولے پڑے۔ یقیناً یہ اس علاقے کی موسمی کیفیت کے بالکل برعکس بات تھی اس علاقے میں کبھی کبھار زلزلوں کے جھٹکے محسوس کئے جاتے تھے مثلا ایسے ہی جھٹکے ضلع بھر میں یکم اکتوبر 1923ء کو شام تین بجے تقریبا دو منٹ تک محسوس ہوتے رہے۔ لیکن شکر ہے کہ یہ علاقہ شروع سے لے کر اب تک مسلسل زلزلوں کے نقصان دہ اثرات سے محفوظ رہا۔

درجہ حرارت کے اعتبار سے یہ علاقہ گرمیوں میں انتہائی گرم رہا ہے چند سالوں کا جائزہ درج ذیل ہے۔

سال	حرارت فارن ہیٹ	درجہ
1892-93-1		124
1893-94-2		112
1894-95-3		112
1895-96-4		116
1896 97 -5		110
1897-98-6		123
1898-99-7		111

111 1899-1900-8

انتظامی تقسیم

یہ بات جان کر حیرت ہوتی ہے کہ سوسوا سو سال پیشتر کار حیم یار خان آبادی میں کمی کے باوجود متعدد انتظامی اکائیوں میں منقسم تھا اس طرح ارتکاز اختیار کی وجہ سے لوگوں کے مسائل علاقائی طور پر ہی حل ہو جاتے تھے۔ پھر انتظامیہ کی ہر چھوٹے بڑے علاقے تک رسائی ہونے کی وجہ سے امن و امان کی صورتحال پر مکمل گرفت تھی۔ 1871ء میں موجودہ ضلع رحیم یار خان دو نظامتون، چھ کار داریوں اور متعدد می شکاریوں پر مشتمل تھا اس تمام علاقہ کی انتظامی تقسیم کچھ اس طرح سے تھی۔

1 -نظامت نوشہرہ

1 -کارداری نوشہرہ

پشتکاریاں: -نوشہرہ، محمد پور، آباد پور لکی واہ

2 - کارداری احمد پور لمہ

پیشکاریاں: -احمد پور لمہ، بھونگ، کوٹ سبزل، سنجر پور

3 -کارداری کوٹ سمابہ

پیشکاریاں: کوٹ کا بہ، حاجی پور، غوث پور، جلال پور

4 -کارداری صادق آباد

پیشکاریاں: صادق آباد، سارنب، واعوو الا، ولہر، پلو شاہ

2 - نظامت خانپور

1 -کارداری خانپور

پیشکاریاں: -خانپور، جام پور، نور واہ، لعل واہ، غازی پور

2-کاردازی شدائی

پیشکاریاں:۔ شد انی، فتح پور، ٹھل واہ، خانبیلہ

3-کارداری اللہ آباد

پیشکاریاں: اللہ آباد، نائین والا، صیم پور، اوٹ ڈنرن، پکالاڑاں، گرڈ والا، چار کونی
واضح رہے کہ نظامت آج کل کے ضلع، کارداری تحصیل اور پیشکاری سب تحصیل کے مترادف تھی۔

نظم ونسق

درج بالا انتظامی تقسیم سے ظاہر ہے نظم و نسق انتہائی جامع تھا لیکن اس کے باوجود انگریز بہادر اپنی عملداری کے دوران اس سے مطمئن نہ تھا مثلا" جب سولہ جنوری 1873ء کو ریاست بہاولپور کا انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کیپٹن کرے اپنی الوداعی تقریب کے سلسلہ میں منعقدہ دربار سے خطاب کر رہا تھاتو اس وقت بھی اس ضلع کی طویل اور دشوار گزار سرحدی حدود اس کا موضوع تھیں اس نے نظم و نسق کی بہتری اور وارداتوں پر کنٹرول کیلیئے اس کامل آبادی میں اضافے کو قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ 1900ء میں پنجاب سے پہلی بار آبادکاروں کی ایک خاصی تعداد کو باقاعدہ طور پر اس ضلع میں آباد کیا گیا۔ اور انہیں قانونی اصطلاح میں تعمد خواہاں کہا گیا۔ ان لوگوں نے بھی اپنے عہد کو خوب نبھایا نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس علاقے کے جنگلوں کو آباد کیا۔ بے آب و گیاہ ریگستان کو قابل کاشت بنایا اور اس ضلع کی آبادی میں اضافے کیلیئے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ آج اگر کیپٹن گرے زندہ ہو کر اس علاقے کی سیر کو آجائے تو خصوصا" رحیم یار خان شہر اور اس کے مفصلات میں آبادی کے بے ہنگم اضافہ اس کی بلند و بالا عمارات، پلازوں اور نجی کلینکوں کی بھرمار دیکھ کر عش عش کر اٹھے۔

ریاست بھر کی طرح اسی ضلع کی ملازمتوں میں بھی ہندوؤں کا تناسب زیادہ رہا۔ حالانکہ آبادی کے اعتبار سے وہ اقلیت میں تھے۔ اس کا اندازہ صرف کارداری خانپور اور کارداری صادق آباد میں ہندو مسلم ملازمین کے تناسب سے لگایا جاسکتا ہے کارداری خانپور میں پندرہ ہندو اور نو مسلمان ملازم تھے۔ جبکہ کارداری صادق آباد میں سترہ ہندو اور دس مسلمان ملازم تھے البتہ اعلیٰ عہدوں پر بعض اوقات مسلمانوں کو اجارہ داری حاصل ہو جاتی تھی۔ 1895ء میں خانپور اور صادق آباد کے کاردار علی الترتیب محمد محمود خان اور قادر بخش خان تھے۔ لیکن 1919ء میں دیوان لکھا ناظم خانپور تھا۔ جس کا منصب موجودہ دور کے ڈپٹی کمشنر کے برابر تھا۔ البتہ 1919ء ہی مین خانپور کے میونسپل کمشنر کے عہدے پر شیخ مہرالدین تعینات تھے۔ واضح رہے کہ خانپور اس دور میں ریاست بہاولپور میں تیسرے نمبر کا شہر تھا اس علاقے کی کارداریوں میں کارداری صادق آباد سب سے بہتر تھی۔ 1900ء میں آغا دوست محمد اس کے نوعمر کاردار تھے۔ جنہیں پنجابی زمینداروں سے بڑا انس تھا وہ ان کی ترقی و خوشحالی کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔

اس طرح احمد پور لمہ کو آج سے تقریباً دوسو بتیس سال پہلے قادر بخش خان داؤد پوترہ نے آباد کیا تھا۔ 1870ء کے لگ بھگ اسے تحصیل کا درجہ حاصل تھا۔ یہ موجودہ ضلع رحیم یار خان کا سرحدی علاقہ شمار ہوتا تھا اس لئے کہ اس کے ایک طرف ریاست جیسلمیر، دوسری طرف سندھ کے علاقہ جات اوباڑہ، کشمور، جیکب آباد سکھر ملحق تھے جبکہ تیسری جانب کوٹ مٹھن اور روجھان متصل تھا۔ ایک سرحدی علاقہ ہونے کے ناطے یہاں دشتی، کوش، چانڈیہ اور درگمہ وغیرہ اقوام شوریدہ سر و جرائم پیشہ آباد تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں نظم و نسق کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ رہا۔ لیکن اس کے باوجود حالات ریاستی انتظامیہ کے کنٹرول میں رہے۔ اسطرح سابق ضلع خانپور میں قوم کوش بلوچ کو ریاست کی طرف سے جرائم پیشہ قوم کی حیثیت سے مشتہر کیا گیا تھا۔ اور مندرجہ بالا اقوام کے ساتھ

دیگر تمام خانہ بدوشی اقوام کو جرائم پیشہ قرار دیتے ہوئے جرائم پیشہ اقوام کا ایکٹ نافذ ہوا جس کے تحت ان اقوام کی فلاح و بہبود کیلئے 1918ء کے لگ بھگ قواعد و ضوابط مرتب کئے گئے۔ ان کی جبری مزدوری ملازمت کا اہتمام کیا گیا ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا منصوبہ تیار ہوا۔ اور پھر ان کی آمدنی کے ایک حصہ کو جبری بیمہ پالیسی کے تحت جمع کرنے کا ضابطہ تیار ہوا کہ ان کے مستقبل کو محفوظ کیا جاسکے۔ ان تمام اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ ان اقوام کو محنت و مزدوری پر آمادہ کر کے انہیں جرائم سے دور رکھا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی فلاح و بہبود کو بھی ممکن بنایا جاسکے۔

آج کا دور بدامنی، قتل و غارت اور لوٹ مار کا دور ہے ذرائع آمد و رفت میں اس قدر سہولیات اور انتظامی آسائشات کے باوجود مجرم پکڑے نہیں جاتے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مجرموں کی یا تو پولیس سے از باز ہوتی ہے اور یا وہ اس قدر بارسوخ اور منظم ہوتے ہیں کہ قانون کی گرفت ممکن نہیں ہو سکتی۔ لیکن اج سے سو برس پہلے ریاستی انتظامیہ کسی طرح اپنے علاقے میں کسی بڑے جرم کے وقوع پذیر ہونے کے ہاتھ کیسے نیچے سے اوپر تک حرکت میں آکر مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا کر دم لیتی تھی اس کا اندازہ درج ذیل چند واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلا واقعہ اسی برس پہلے علاقہ بدلی میں پیش آیا جو تھانہ نوشہرہ کی حدود میں اقع تھا۔ تین اور چار اپریل 1916ء کی درمیانی شب کو ڈیرہ غازی خان کے علاقہ روجھان سے بندوقوں اور لواروں سے مسلح دس ڈاکوؤں نے بدلی کے قصبہ پر ڈاکہ ڈالا۔ ان کا شکار وہاں پر مقیم ہندو مہاجن تھے۔ ان میں سے چار مہاجنوں نے ڈنڈوں سے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ڈاکو ان لوگوں کو زخمی کر کے اپنا کام کر گئے۔ جونہی اس واقعہ کی اطلاع ضلعی انتظامیہ کو ہوئی تو پانچ اپریل کی صبح کو ڈسٹرکٹ جج شیخ محمد حسن وہاں پہنچے اور ڈاکوؤں کو پکڑنے کے لئے ہر ممکن کوشش شروع کر

دی۔ آخر نواب سر بھرام خان کے تعاون سے تمام ڈاکو گرفتار ہوئے جن میں سے ایک نے سزا کے خوف سے خودکشی کرلی۔

اگرچہ تمام ڈاکو پکڑے جاچکے تھے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کا انتظام ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود کونسل آف ریجنسی کے پریذیڈنٹ سر رحیم بخش بذات خود موضع بدلی کے لوگوں کی ڈھارس بندھانے پہنچے۔ اس واقع کے بعد تمام سرحدی مقامات جہاں سے ،ڈاکو نوشہرہ (رحیم یار خان) اور خان پور میں داخل ہو سکتے تھے کی ناکہ بندی اور پاسبانی کا انتظام کیا گیا تاکہ پولیس اور عوام کے باہمی رابطہ سے کڑی ان اور جرائم پیشہ افراد کے داخلہ کو ناممکن بنایا جاسکے۔ علاوہ ازیں اس واقعہ کے بعد زمینداروں کو اسلحہ کے لائنس جاری کئے گئے تاکہ وہ وقت پڑنے پ اپنے علاقے کی حفاظت کر سکیں مزید اس افسوسناک وقوعہ کے دوران موقع پر مہاجنوں کی مدد نہ کرنے پر قرب وجوار کے زمینداروں کو شرم دلائی گئی۔

بدلی کے سانحہ کے بعد اس واقعہ کو انتظامیہ اور صادق الخبار نے سانحہ قرار دیا تھا) دوسرا بڑا واقعہ رحیم یار خان میں حرڈاکوؤں کا پیش آیا۔ جولائی 1946ء میں چھ حرڈاکوؤں نے رحیم یار خان سے چند میل ور ایک مال گاڑی کو پٹڑی سے اتار دیا۔ حکومت بہاولپور نے اس واقعہ کے فورا بعد ڈاکوؤں کی سرکوبی کیلئے فوجیوں کا ایک دستہ روانہ کیاڈاکو فوری طور پر ہاتھ نہ آئے۔ البتہ تین جولائی 1946ء کو فتح پور قریشیاں کے نمبردار نے اطلاع دی کہ سندھی ڈاکوؤں کا ایک گروہ مشہور ڈاکو رحیم ہنگارو کی سرکردگی میں فتح پور سے سات گھوڑے اور ایک اونٹ لوٹ کر شاہ پور کی طرف ڈاکہ زنی کی خاطر روانہ ہو گیا ہے۔ پولیس کمشنر فورا" بارہ عدد فوجی جوانوں اور نصف درجن کے قریب پولیس افسران کے ساتھ خود بذریعہ جیپ وٹرک ان کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور تین جولائی کو دوپہر کے قریب ڈاکوؤں کو رکن پور کے قریب جالیا۔ طرفین میں تین گھنٹے تک زیردست فائرنگ کا تبادلہ جاری رہا

بالاخر ڈاکوؤں نے پسپا ہو کر لوٹ مار کا سامان کھیتوں میں چھوڑ دیا اور منجن بند کے پار دریائے سندھ کی طرف بھاگنے لگے لیکن ریاستی پولیس اور فوج نے ان کے گرد گھیر اتنگ کر دیا اور انجام کار تمام ڈاکو مارے گئے۔ ان سے دو عدد 303 رائفلیں دو Heny Muskets Marine جن میں سے ایک ریتی کے سندھ پولیس سے لوٹی ہوئی تھی مزید ایک دوضرب بندوق، ایک Mosker اور ایک ولی پستول کے علاوہ کافی اسلحہ اور بارود بر آمد ہو اڈاکوؤں کی فائرنگ سے چار فوجی بھی معمولی زخمی ہوئے البتہ ایک کانسٹیبل فائرنگ سے شدید زخمی ہوا جسے بہتر علاج معالجہ کیلئے فورا" میو اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ مرنے والے ڈاکوؤں کی شناخت ہوئی ان میں رحیم ہنگارو، مویزگارو اور پھل کھاؤنامی بدنام ترین ڈاکو تھے پولیس کمشنر نے اسلامی رسوم کے مطابق ان سب کی تجہیز و تکفین کرائی۔ مقامی مولوی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور لاشوں کو صندوقوں میں رکھ کر پورے مراسم کے ساتھ رحیم یار خان کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس طرح ڈاکو ریل کے واقعہ کے ایکن ماہ کے اندر اندر قرار واقعی سزا پاگئے۔ یہ وہ مشہور ڈاکو تھے جنہوں نے گزشتہ چار سال سے ہمسایہ صوبہ سندھ کی حکومت اور عوام کو خوف و ہر اس میں مبتلا کیا ہوا تھا یہی نہیں بلکہ آئندہ کیلئے بھی ان ڈاکوؤں کی کاروائیوں کو مسدود کر دیا گیا۔ اس مقصد کیلئے ریاست میں حر کنٹرول ایکٹ کا نفاذ عمل میں آیا جیسلمیر نے آنے والے حروں کے داخلے پر پابندی لگادی گئی علاوہ ازیں ڈیڑھ سو کے قریب اچھی بندوقیں مقامی زمینداروں اور عہدیداروں میں حفاظت خود اختیاری کیلئے تقسیم کی گئیں۔ مزید گشت کے انتظام کو بھی موثر بنایا گیا۔

اس نوع کا ایک اور واقعہ 8 دسمبر 1951ء کو بھارتی سرحد سے سات میل کے فاصلے پر موضع مڑ گھنانا میں پیش آیا جہاں آٹھ ڈاکو ریاست جیسلمیر سے گھس کر رائفلوں کی فائرنگ کے بل بوتے پر نوسو کمبریاں اور تیئس گائیں ہنکا کر لے گئے وہ اپنے ہمراہ چار افراد سومرا، ریمال، مبارک اور سرور کو بھی

پکڑ کر لے گئے صبح کے قریب بجنوٹ اور نواں کوٹ کی پولیس نے ان کا تعاقب کیا سرحد کے قریب مقابلہ ہوا ڈاکو ناچار موٹی اور اشخاص مذکورہ کو سرحد پر ہی چھوڑ کر فرار ہو گئے یہ تینوں واقعات شاہد ہیں کہ کسی ایک بھی واقعہ میں اس وقت کی پولیس یا انتظامیہ کو موقع پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی مزید ان وقوعہ جات میں ملوث ڈاکو کیفر کردار کو بھی پہنچے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوٹا ہو امال بھی واپس ہوا۔

ضلع رحیم یار خان کی حدود چونکہ ہندوستان سے متصل تھیں اس لئے سمگلنگ جیسے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے تھے خاص طور پر گندم کی خاص مقدار ہندوستان پار سمگل کی جاتی تھی۔ پچاس کی دہائی کے دوران خصوصا" پاکستان میں جو قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ضلع رحیم یار خان اور بہاولنگر سے وسیع پیمانے پر گندم بھارت کو سمگل ہوئی۔ جس میں بڑی سیاسی مچھلیاں ملوث ہوئیں جو کرسی اقتدار کو ہر روز میں اپنی مال منفعت کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتی آئیں ہیں (واضح ہو کہ اس دور میں امیر آف بہاولپور محض ایک آئینی سربراہ تھے اور زمام اقتدار مخدوم زادہ حسن محمود وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھی بعد ازاں سمگلنگ کی وجہ سے جو اس بڑے پیمانے پر ہوئی ملک میں گرانی اور حالات کی ابتری کی وجہ سے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل غلام محمد کی آمریت کا شکار ہونا پڑا۔

سابقہ دور میں ملازمین حکومت کو آجکل کے حالات کے برعکس بے لگام اونٹ کی طرح بے مہار نہیں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بلکہ ان سے اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے ضمن میں ذمہ دارانہ طرز عمل کی توقع رکھی جاتی تھی۔ بدعنوانی پر تو گرفت ہوتی ہی تھی اس کے ساتھ ساتھ غیر حاضری بھی ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ مثلا" 1872ء میں محمد بخش نامی چیراسی علاقہ شیدانی کو نہ صرف غیر حاضری پر

نوکری سے موقوف کر دیا گیا بلکہ شخص مذکورہ پر ریاست میں آئندہ کیلئے بھی ملازمت کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اس مقصد کیلئے اس کے ملنے کی اشاعت کچھ اس طرح سے کی گئی۔
کہ " محمد بخش ولد غوث بخش قوم ماچھی سکنہ شیدانی، گندمی رنگ، تنگ پیشانی، ریش سیاہ، ہر دو گوش سوراخ، عمر پینتیس برس قد پانچ فٹ چھ انچ رکھتا ہے آئندہ سے ریاست میں ملازمت نہ پائے"۔
پھر ریاست کا واحد سرکاری اخبار بھی ہر بے قاعدگی کا سختی سے نوٹس لیتا تھا خانپور میں چوری کی واردات ہوئی اور مال برآمد نہ ہو سکا وہاں کی نو تعمیر شدہ سرائے کی صفائی بھی درست نہ رہتی تھی ان بر بی بھی واقعات پر صادق الاخبار نے خبر لگا دی۔
ریاست میں دفتری اوقات موسم گرما کیلئے صبح چھ بجے سے بارہ بجے کے مقرر تھے ویسے بھی ٹی وی دی ی آر اور ڈش انٹینا کا زمانہ نہ تھا لوگ علی الصبح اٹھ کر نماز پڑھتے، تلاوت کرتے سادہ سا ناشتہ ہوتا اور پھر ہر شخص اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے کیا ہی بابرکت زمانہ تھا اور کیا ہی بابرکت لوگ تھے۔

پولیس

موجودہ دور میں پولیس کا محکمہ تشدد، حرام خوری بدعنوانی اور جرائم کا پروردہ ہونے کی حیثیت سے ایک مثال بن چکا ہے۔ تاہم ریاست بہاولپور میں اس محکمہ کی کارکردگی پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی اور عمدہ داران کو معمولی سی کوتاہی یا خلاف قانون حرکت پر مثالی سزا دی جاتی تھی۔ مثلا" جب 1872ء میں احمد علی محرر تھانہ خانپور ایک کیس کی تفتیش کے سلسلہ میں ایک علاقے میں گیا اور وہاں اس نے نمبر دار کے گھر سے کھانا کھایا تو حکام کو اس واقعے کی اطلاع ہو گئی۔ اس معمولی بات پر جسے فی زمانہ پولیس اپنا حق تصور کرتے شیر مادر کی طرح نوش کر جاتی ہے۔ محرر مذکورہ کی بازپرس ہوئی اور اس سے جواب طلبی کر لی گئی۔

ریاست بہاولپور میں پولیس کی طرف سے ملزمان پر تشدد کرنے کی روایت موجود تھی اس تشدد کے خاتمے کا سہرا 1866ء کی انگریز ایجنسی کے سر ہے۔ جنہوں نے سختی سے ملزمان پر تشدد کرنے کی ممانعت کر دی۔ اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں بڑے بڑے عہدیداروں کو بھی نہ چھوڑا گیا اور انہیں اپنے عہدوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔

پولیس کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے عہدیداران سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ جرائم کی تفتیش کے دوران ذرا سی بھی کوتاہی نہ کریں گے۔ مثلا "1942ء میں تھانہ کوٹ سمابہ کے سب انسپکٹر غلام محمد کو ایک قتل کے مقدمے کی ناقص کارکردگی پر پولیس کمشنر کی طرف سے ایک بلیک مارک اور پانچ روپے جرمانہ کی سزا دی گئی انگریزی علمداری کے قیام سے قبل اس علاقہ میں یقینا" تھانہ جات کم ہوں گے لیکن 1900ء کے لگ بھگ موجودہ رحیم یار خان میں پولیس اسٹیشنوں کی تعداد کچھ اس طرح سے نظر آتی ہے۔

تھانہ جات کارداری خانپور

خانپور، اللہ آباد' پکالاڑاں، خانبیلہ، اسلام گڑھ، غوث پور۔

تھانہ جات کارداری صادق آباد

صادق آباد' کوٹ کایہ نوشہرہ، آباد پور' بھونگ، فتح پور ماچکا، کوٹ سبزل

پولیس چوکیاں

چاچڑاں، صادق آباد سردار گڑھ، رکن پور، کمال ڈھنڈھی، ٹھل کافور، منڈی دان والا

خانپور جیل

درج بالا تھانہ جات اور چوکیوں کے علاوہ 1871ء کے بہت بعد تک خانپور جیل کا ذکر بھی ا ہے 1871ء میں اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ جگت سنگھ نامی تھا۔ بعدازاں یہ جیل سیلاب کی نظر ہوگئی اور اس کے بعد اسے تعمیر نہ کیا جاسکا اور اس علاقہ کے مجرموں کو بہاولپور جیل میں رکھا جانے لگا۔

عدلیہ

خانپور کی ڈسٹرکٹ ججی جو آٹھ افراد پر مشتمل تھی اس علاقہ میں انصاف کی سب سے بڑی عدالت تھی جو براہ راست بہاولپور کی صدر عدالت کے تابع تھی علاوہ ازیں اس علاقہ میں خانپور، نوشہرہ، احمد پور لمہ، اور اللہ آباد میں عدالت ہائے منصفی موجود تھیں جن میں سے ہر ایک میں تقریباً آٹھ افراد کا عملہ تعینات ہوتا تھا خانپور کی عدالت صدر منصفی کا سربراہ صدر منصف کہلاتا تھا اس عہدہ پر 1876ء کے لگ بھگ مولوی سید نجیب الدین تعینات تھے جن کی انصاف پروری کا بڑا اشہرہ تھا۔ 1900ء میں جب منصفی کی عمارت زیر تعمیر تھی تو منصف صاحب گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران اپنی عدالت خانپور مدرسہ کی عمارت میں لگاتے رہے۔ خانپور میں ایک سب جج اور ایک نائب منصف کی عدالت بھی تھی۔ مزید خانپور کمیٹی کو بھی پچاس روپے تک کی مالیت کے دیوانی مقدمات کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔ غالبا" کمیٹی ایک قسم کی پنچا کی عدالت ہو گی۔ سرحدی جرائم کی روک تھام کیلئے راجن پور کا اسٹنٹ کمشنر اور خانپور کا جج سال میں دوبار سرحدی جھگڑوں کو نپٹانے کیلئے آپس میں ملتے تھے۔ 1935ء کے لگ بھگ رحیم یار خان میں محمد عزیز الرحمن ڈسٹرکٹ جج تھے جنہوں نے ریاست بہاولپور کی تاریخ پر متعدد کتابیں سرکاری سرپرستی میں تصنیف کی ہیں۔

احمد پور لمہ کو 1916ء کے لگ بھگ تحصیل کا درجہ حاصل ہوا اس قصبہ میں 17 اپریل 1882ء سے نائب منصفی کی عدالت قائم تھی۔ 1905ء میں اس عدالت کو منصفی کے درجہ پر ترقی دی گئی۔ جہاں کے منصف کو منصف کے ساتھ ساتھ مجسٹریٹ کے اختیارات بھی حاصل تھے۔

صحت عامہ

شرح پیدائش و اموت -: ضلع رحیم یار خان میں شرح پیدائش و اموات کا باقاعدہ گوشوارہ صادق الاخبار گزٹ میں ہر ماہ پیش کیا جاتا تھا جس کا اندازہ ماہ اکتوبر 1874ء کے درج ذیل گوشوارہ سے ہو سکتا ہے۔

نظامت خانپور: 53 نفوس پیدا ہوئے جن میں سے 8 پیدائش کے فورا بعد فوت ہو گئے جبکہ اس نظامت میں ماہ اکتوبر 1874ء کے آخر تک کل 55 نفوس فوت ہوئے۔

نظامت نوشہرہ: -اس ماہ 35 افراد پیدا ہوئے جن میں سے 13 نفوس پیدائش کے فورا بعد فوت ہوئے ماہ مذکورہ کے دوران فوت ہونے والے افراد کی کل تعداد 29 تھی تقابلی نظامت جائزہ سے ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ شرح پیدائش خانپور نظامت میں تھی جب کہ سب سے اموات نوشہرہ شہر میں ہوئیں۔

امراض

ریاست کے تمام علاقوں کی طرح موجودہ ضلع رحیم یار خان میں مرض "اسکروی" میں مبتلا افراد کی تعداد سب سے زیادہ رہتی تھی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں پانی میں نمکیات کی ازحد زیادتی تھی اس مرض میں موڑھے سوچ کر خراب ہو جاتے تھے جو آخیر میں ملک صورت اختیار کر جاتے پانی میں نمکیات کی زیادتی مستلج ویلی پراجیکٹ کے اجراء تک جاری رہی جب نہریں جاری ہوئیں تو

آہستہ آہستہ پانی درست ہوتا گیا اس مرض اسکروی سے بچاؤ کیلئے حکومت کی طرف سے جو احتیاطی تدابیر بتائی گئیں ان میں کونوؤں کی بجائے نہری پانی کا استعمال تھا۔

چیچک کا مرض عام تھا جس کے تدارک کے طور پر حفاظتی انتظامات کی خاطر لوکل کمیٹی خانپور کی طرف سے چیچک کے مریضوں کی خاطر خانپور سے باہر جھونپڑے بنوانے کی درخواست کمیٹی بہاولپور نے اپنے اجلاس میں منظور کی ماکہ مریضوں کو شہر سے باہر رکھا جا سکے۔ اور دوسرے افراد کو یہ بیماری نہ لگ سکے اس علاقہ میں وقتاً فوقتاً طاعون اور ہیضہ جیسے امراض بھی کافی جانوں کے اتلاف کا باعث بنتے آرہتے تھے۔

1919ء میں ضلع رحیم یار خان میں انفلوانزاء کی بیماری اس قدر شدت اختیار کرگئی کہ کوٹ کا یہ اس طرح اکتوبر 1884ء میں موضع گدڑوالا میں جو علاقہ کارداری خانپور میں تھا ہیضہ کی وباء پھوٹ پڑی اس موقع پر حکیم امام بخش نیٹوڈاکٹر اسپتال خانپور نے موقع پر پہنچ کر علاج معالجہ شروع کیا دو تین روز میں ہی اس مرض کا انسداد ہوگیا۔ نواب صادق چہارم نے کونسل کی رائے پر ڈاکٹر مذکورہ کو مبلغ پندرہ روپے کا انعام دیا ڈاکٹر مذکور کی بہت اچھی شہرت تھی حالانکہ وہ نوعمر تھا اہل شہر اس کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ اس کی قابلیت و مستعدی کی وجہ تھی کہ ریاست بہاولپور محکمہ صحت کا افیسر اعلیٰ و میڈیکل آفیسر دلیپ سنگھ جب خانپور اسپتال کے معائنہ پر آیا تو ڈاکٹر امام بخش کی خدمات کا اعتراف کیا۔ لیکن اس کی تنخواہ بہت کم تھی صادق الاخبار نے اس موقع پر خانپور کے اس نیک سیرت ڈاکٹر کی تنخواہ میں اضافے کی سفارش کی۔

برصغیر میں ریاستی دور اگرچہ ہر طرح سے استحصالی واستبدادی رہا ہے لیکن ریاست بہاولپور کے عوام اس وجہ سے خوش نصیب تھے کہ ان تمام قباحتوں کے باوجود انہیں علاج معالجہ کی سہولیات مفت حاصل تھیں۔ 1894ء میں زنانہ ہسپتال بہاولپور کی بنیاد رکھی گئی۔ جہاں صرف خواتین کے علاج و

معالجہ کیلئے انگریز لیڈی ڈاکٹروں کی تعیناتی عمل میں لائی گئی۔ پھر 1906ء میں بہاول وکٹوریہ ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھا گیا جہاں مریضوں کو مفت علاج معالجہ اور داخل ہونے والے مریضوں کو طعام، قیام اور خوراک کے مفت سہولیات فراہم ہوتی تھیں۔ موجودہ ضلع رحیم یار خان کے بیشتر شہروں اور قصبات میں بھی ڈسپنسریاں اور ہسپتال قائم تھے جہاں عوام کو علاج معالجہ کی سہولیات حاصل تھیں۔ خانپور میں ڈسپنسری 1868ء میں قائم ہوئی جہاں ایلوپیتھک طریقہ علاج رائج ہوا یاد رہے کہ اس سال بہاولپور میں بھی ایلوپیتھک طریقہ علاج کیلئے ڈسپنسری کا قیام ہوا تھا لیکن واضح ہو کہ ان ڈسپنریوں حکیم بھی تعینات تھے تاکہ عوام اپنی مرضی سے کسی بھی ایک طریقہ علاج کے مطابق علاج کرا سکیں۔ میونسپل کمیٹی اللہ آباد نے اپنے علاقہ میں ایک ڈسپنسری قائم کی جس میں حکیم تعینات تھا۔ جبکہ نوشہرہ (رحیم یار خان) کی ڈسپنسری میں 1892ء میں ہاسپٹل اسٹنٹ کو تعینات کیا گیا بہاولپور اور خانپور میں ابتداء ہی سے ہر قسم کے چھوٹے اور بڑے آپریشن کیئے جاتے تھے۔ 1903ء میں خانپور اور رحیم یار خان کے شہروں میں ڈسپنسریوں کی بجائے ہسپتالوں کا ذکر ملتا ہے۔ 19 جولائی 1906ء کو جب مشیر مال نے صادق آباد کا دورہ کیا تو یہاں کے پرانے کوٹ قلعہ کو منہدم کرا کے یہاں پر اسی مٹی سے ہسپتال صادق آباد اور ڈاکٹر و حملہ کی رہائشی عمارات نی تعمیر کا حکم صادر کیا یہ ہسپتال جلد تعمیر ہو گیا۔ 1906ء سے قبل ہسپتال اللہ آباد کا بھی ذکر ملتا ہے ان تمام ہسپتالوں میں انڈور کی سہولیات ملتی ہیں جہاں پر مریضوں کو مفت خوراک بھی فراہم کی جاتی تھی۔ ضلع بھر میں ہونے الے آپریشنوں کی اوسط تعداد کا اندازہ درج ذیل معلومات سے لگایا جا سکتا ہے جو سال 1911ء ماہ مارچ متعلق ہیں۔

خانپور ہسپتال -: مارچ 1911ء میں یہاں ہڈیوں کے دو اور پیٹ کے پانچ آپریشن کئے گئے جبکہ نوشہرہ ہسپتال میں ہڈیوں کے دس موتیا بند کے 20 اور پتھری کے چار آپریشن ہوئے شہر فرید جیسے

قصبے میں 20 آپریشن اور احمد پورلمہ کے ہسپتال میں مختلف نوع کے اکتیس آپریشن ہوئے۔ 1919ء تک خانپور اور نوشہرہ ہسپتال کی عمارات جو غالبا" کچی اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھیں اب خستہ ہو چکیں تھیں ان کی مرمت کا حکم ہو چکا تھا جبکہ خانپور ہسپتال کی جدید عمارات کی تعمیر بھی جاری ہو گئی۔ نواب صادق خامس نے اختیارات کی پہلی قسط ملتے ہی 1922ء میں کونسل آف ریجنسی کے پریذیڈنٹ کی حیثیت سے مغربی علاقہ جات (موجودہ رحیم یار خان) کا دورہ کیا اس موقع پر ہسپتالوں اور صحت کے مراکز کا معائنہ کیا جنوری 1922ء میں وہ اچانک خانپور ہسپتال آئے انچارج کمپونڈر غیر حاضر تھا ہسپتال میں صفائی کا انتظام ابتر تھا حتی کہ وہ میز جس پر ادویات تیار کی جاتی تھیں وہ میلی تھی شیشیاں بے ترتیبی کے ساتھ پڑی تھیں۔ ان ڈور وارڈ کی حالت بھی خراب تھی مریضوں کے چارٹ نامکمل تھے تکیوں میں روئی کی بجائے گھاس بھری ہوئی تھی اس پر نواب صادق خامس نے کونسل آف ریجنسی کے مٹری ممبر کو جس کے زیر انتظام میڈیکل کا شعبہ بھی تھا صورتحال کی اصلاح کا حکم دیا اس کے بعد نواب صاحب نے اللہ آباد ہسپتال کا بھی دورہ کیا وہ 8 جنوری 1922ء کو وہاں پہنچے اس وقت یہاں لالہ موہن لعل سب اسٹنٹ سرجن انچارج تھا نواب صاحب نے معائنہ کے دوران ہسپتال کی کارکردگی پر اظہار اطمینان کیا کیونکہ یہاں پر ہر ایک چیز ترتیب سے رکھی تھی اور آؤٹ ڈور مریضوں کی تعداد 33 تھی جبکہ ان ڈور مریض صرف ایک تھا۔ اگرچہ نواب صاحب نے اپنے طویل عرصہ حکومت (1922 - 1955) تک اس علاقے کے عوام کی صحت کے مراکز کا کئی بار دورہ کیا ہو گا لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ اچانک بغیر اطلاع پہنچ جاتے اور ذراسی ابتری اور بے قاعدگی کا سختی سے نوٹس لیتے بعض اوقات گالیوں اور اپنی مشہور سٹک "فیض علی" کے استعمال سے بھی اجتناب نہ کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں پولیس، بیوروکریسی افسران، سرمایہ دار، منافع خور اور ونتری المکاران، راشی، حرام خور ہر وقت لرزاں وترساں رہتے اور ان کی غیر متوقع

آمد کے خوف سے تمام نظام حکومت درست رہتا۔ 1935 کے دوران ایک بار پھر نواب صادق خامس صبح تو دس بجے کے قریب جعہ سے ہوتے ہوئے اچانک ہسپتال خانپور کے معائنہ پر پہنچے تمام دواؤں کا بغور جائزہ لیا اور مریضوں کی دلجوئی کی۔

ریاست کے آخری دور میں اس ضلع میں آنکھوں کے کیمپ بھی مشہور اور قابل ڈاکٹروں کی خدا ترسی کی مثال تھے۔ خاص طور پر 1946ء سے 1950ء تک کے دوران رحیم یار خان اور صادق آباد میں کرنل ڈک اور لیڈی ڈک کے امراض چشم کے کیمپ کافی شہرت کے حامل تھے ان کیمپوں میں مفت رہائش اور خوراک کے علاوہ عینکیں اور ادویات بھی دی جاتی تھیں۔ موتیا بند کے آپریشنوں کیلئے بیکانیر سندھ اور لاہور تک سے لوگ آتے تھے اس موقع پر مریضوں کی دلجوئی اور آسائشات کی فراہمی مقامی مخیر افراد بھی کرتے تھے۔

رحیم یار خان کے مخدومان اور زمینداران حکومت کی خوشنودی کیلئے رفاعہ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے جب46 - 1945ء میں زنانہ ہسپتال احمد پور شرقیہ کی تعمیر افواج بہاولپور کے جنرل مارڈن اور لیڈی مارڈن کی تحریک پر شروع ہوئی تو اس ہسپتال کی تعمیر کیلئے بیگم صاحبہ غلام میران شاہ جمال الدین والی نے دو ہزار روپے دیئے بیگم میجر مخدوم محمد بخش آن رحیم یار خان کی طرف سے بھی مبلغ دو ہزار روپے پیش کئے گئے اس طرح بیگم رئیس غازی محمد آف بھونگ نے بھی مبلغ پانچ سو روپے بطور چندہ دیئے بعد ازاں تعمیر مکمل ہونے پر اس کا افتتاح وائسرائے ہند کی بیوی لیڈی دیول نے کیا حالانکہ ہسپتال صرف عورتوں اور بچوں سے متعلق تھا لیکن قیام پاکستان کے فورا بعد تحصیل ہسپتال کی عمارت نہ ہونے کی بناء پر اسے سول ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا اگرچہ عمارت کے لحاظ سے یہ اب بھی عالیشان ہے

تعلیم

بہاولپور کا خطہ شروع سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے خاص طور پر اچ کے علاقہ میں مدرسہ فیروزیہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اس وقت برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کیلئے ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا تھا یہ مدرسہ سلاطین کے دور میں قائم تھا جس کے مہتمم طبقات ناصری کے مشہور مصنف قاضی منہاج الدین سراج تھے ناصر الدین قباچہ کے دور میں اہل علم و دانش وسط ایشیاء اور اسلامی ممالک کے تاتاریں کے ہاتھوں تاراج ہونے کے بعد اس علاقے کی طرف ہی پناہ گزین ہوئے یہی وجہ ہے کہ ضلع رحیم یار خان میں بھی بعد ازاں انی اسلاف کی برکت سے علمی و دینی مراکز کا قیام عمل میں آیا۔ 1866ء تک اس خطے میں خالصتا" دینی تعلیم کا اہتمام مساجد میں کیا جاتا تھا قرآن، حدیث فقہ کی تعلیم دنیا و آخرت کا سرمایہ تصور ہوتی تھی جب سے انگریز بہادر کا عمل دخل بڑھا اور 1866ء میں ایجنسی کی حکومت قائم ہوئی دینی مدارس کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیمی ادارے بھی قائم ہونے شروع ہوئے اور حصول علم کا مقصد حصول روزگار بن گیا۔ پھر بھی اکثر مربی مواد کی اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ قائم رہے البتہ ان تمام تر خصوصیات کے ساتھ قائم رہے البتہ ان تمام پرانے مدارس کے اساتذہ کو بہاولپور کے نارمل سکول میں ٹریننگ کیلئے بلایا گیا۔ 1872ء میں انسپکٹر مدارس کی طرف سے نظامت خانپور اور نظامت نوشہرہ کی حدود میں واقع مدارس جن پور، پکالاڈاں، غوث پور اور محمد پور کے اساتذہ کو ٹریننگ کیلئے طلب کیا گیا۔

1883ء میں خانپور کے مدرسہ میں فارسی، عربی اور حساب وغیرہ کی تعلیم ساتویں جماعت تک دی جاتی تھی 6 دسمبر 1883ء کو مشیر مال منشی غلام نبی نے اپنے دورہ کے دوران اسی مدرسہ کا درجہ آٹھویں تک کرنے اور اس میں انگریزی تعلیم کے اجراء کی سفارش کی اس مدرسہ میں کل چون 54 طلباء داخل تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود دینی مدارس کی وقعت اپنی جگہ پر قائم رہی جس کا

اندازہ خانپور کے مدرسہ ترنڈہ مولویان سے لگایا جاسکتا ہے جسے تمبر 1889ء میں حضرت خواجہ غلام فرید صاحب کی سفارش پر عربی مدرسہ قرار دیا گیا اور اس کے معلم کی تنخواہ آٹھ روپے سے بڑھا کر دس روپے کر دی گئی اعلیٰ افسران و حکام کس قدر علم نواز اور علم پرور تھے کہ دسمبر 1919ء میں مدرسہ عربیہ چاچڑاں شریف کے طلباء کا امتحان لینے مولانا عبد المالک مشیر مال (جن کا عہدہ وزیر کے برابر تھا) خود گئے اس مدرسہ میں مدرس مولوی محمد ابراہیم متعین تھے۔

اسی علاقے کے ہندو تعلیمی میدان میں آگے نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ جب دسمبر 1892ء میں خانپور سکول میں سیکینڈ ماسٹری کی آسامی خالی ہوئی تو خیر پور سکول کے تھرڈ ماسٹر ہیرالعل کو ترقی دے کر یہاں تعینات کیا گیا اور اس کی خالی ہونے والی جگہ پر بھی ایک ہندو شانورام کو بطور تھرڈ ماسٹر خانپور سکول تعینات کیا گیا۔ 1906ء میں خانپور مڈل سکول سے امتحان مدل میں صرف دو طلباء علاؤ الدین اور سکھورام نے شرکت کی۔ یہ امتحان پنجاب یونیورسٹی لیتی تھی اسی سال خانپور سکول کے ہیڈ ماسٹر غلام صابر خان تھے جن کی تعلیمی قابلیت بی اے تھی اتنی تعلیم کا حامل ہونا یقینا" حیران کن معلوم ہوتا ہے اس وقت سیکینڈ ماسٹر البتہ عمل پاس تھا۔ خانپور سکول کا عملہ اس گئے گزرے وقت میں جب کہ طلباء کی تعداد انتہائی کم ہوتی تھی نو اساتذہ پر مشتمل تھا۔

ایک اسلامی ریاست ہونے کے باوجود یہاں کے عوام سے انگریزوں کی اطاعت کی توقع کی جاتی تھی اور طلباء کو شروع 1918ء میں جب جنگ عظیم اول میں انگریزوں کو فتح ہوئی قاضی علاؤ الدین ہیڈ ماسٹر خانپور سکول نے اس موقع پر انگریزوں کی خوشنودی کے حصول کیلئے ایک غزل لکھی جسے 29 نومبر 1918ء خانپور سکول میں منعقدہ ایک جلسہ میں جس کی صدارت کونسل آف ایجنسی کے صدر

سر رحیم بخش نے کی تھی بچوں نے انتہائی خوش الحانی سے پڑھا اور اس فتح یابی پر انتہائی مسرت و انبساط کا اظہار کیا گیا نظم کے الفاظ کچھ اس طرح سے تھے۔

جہاں میں سلامت رہے شاہ ہمارا — رعایا کا اپنے جو ہے ایک سہارا
لڑائی کا اب خاتمہ ہو گیا — ہوا امن جاری جہاں میں دوبارہ
تکبر کسی کا نہیں حق کو بھاتا — جو مغرور ظالم تھا آخر کو ہارا
سزا اپنے اپنے کی اس نے پائی — کہ اپنے کئے کا نہیں کوئی چارا
خبر جب ہزیمت کی قیصر نے پائی — تو حسرت سے سینے پر ہاتھ اس نے مارا
دکھایا ہے اہل بصیرت کو اس میں — خدا نے قدرت کا اپنے نظارا
سلامت رہیں اپنے سرکار عالی — کہ سردار ہے وہ ہمارا تمہارا

واضح ہو کہ انگریز دوستی کے ساتھ ساتھ ریاست کے مسلمان حکمران کے حق میں بھی دعایا کلمات ہیں ریاستی باشندوں کو اپنے نوابوں سے دلی عقیدت و احترام تھا اسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ خود حکمران بھی رعایا کو اپنی اولاد سمجھتے تھے اور انہیں بالخصوص انصاف مہیا کرنا اپنا فرض تصور کرتے تھے.

جنگ عظیم اول کے دوران اس ضلع سے رنگروٹ بھی بھرتی کئے گئے تھے۔1906ء میں خانپور مدرسہ کی عمارت جو خاص پرانی تھی منہدم ہو گئی اور مدرسہ اس دوران ایک سرائے کے اندر کام کرتا رہا تالیا" یہ سرائے مسجد حضرت مائی صاحب کے قریب تھی جس کی عمارت اس کے قرب وجوار میں آج بھی موجود ہے۔

انیسیویں صدی کے آخر تک نوشہرہ موجودہ رحیم یار خان کو اگرچہ ایک شہر کی حیثیت حاصل تھی لیکن یہ تعلیمی طور پر خانپور سے پیچھے تھا۔1893ء میں شیخ اللہ داد خان کاردار نوشہرہ نے تجویز کیا کہ کیونکہ قصبہ نوشہرہ میں تحصیل، منصفی، تھانہ، ہسپتال، ریلوے اسٹیشن موجود ہیں لہذا یہاں پرائمری

کی سطح کا انگریزی ادارہ بھی ضرور قائم ہونا چاہئے اس ضرورت کے پیش نظر 10 مئی 1894ء کو رحیم یار خان میں ایک پرائمری انگریزی سکول کا اجراء عمل میں آیا۔ منشی خان چند اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے ابتداء میں طلباء کی تعداد تمھیں تھی جو جنوری 1895ء میں بڑھ کر چونسٹھ ہو گئی ایک سال جلسہ تقسیم انعامات ہوا جس کی صدارت مرزا جندوڑہ خان مشیر مال نے کی اس موقع پر مبلغ تین روپے کے انعامات طلباء میں تقسیم ہوئے۔

غالبا" مدرسہ کی عمارت کچی تھی اس لئے اس کی مرمت کا بھی حکم ہوا مزید اتھلیٹ کا سامان خریدنے کا انتظام ہوا ابتدا اس پرائمری سکول میں صرف دو استاد تعینات تھے کچھ عرصہ بعد ایک انگریزی تعلیم کے استاد کا تقرر عمل میں آیا ڈیسک، کرکٹ کا سامان، تختہ سیاہ اور کلاک کی ضرورت کو بھی پورا کیا گیا ہندو اور مسلمان طلباء کے پینے کیلئے علیحدہ علیحدہ پانی کا انتظام ہوا اس مقصد کیلئے ایک بہشتی بھی رکھا گیا۔ 1906ء کے لگ بھگ رحیم یار خان میں سکول کا درجہ مڈل تک کا تھا جس کا ہیڈ ماسٹر دیو رام تھا جو انٹر پاس ہونے کے علاوہ ٹریننگ کالج کا بھی فارغ التحصیل تھا اور مزے کی بات ہے کہ اس گئے گزرے زمانے میں اس سکول میں تعینات ایک مسلمان استاد عزیز بخش بھی انٹر پاس تھے سکول کا عملہ سات افراد پر مشتمل تھا شاید یہ سکول اسی جگہ پر قائم ہو جہاں آج کالونی ہائی سکول رحیم یار خان ہے اس سے متصل بازار کا نام بھی سکول بازار عرصے سے مشہور ہے۔ اس سکول کی پرانی عمارت جو اب کرنے کے قریب ہے بہت شاندار اس کے آج بھی Long Live Our Noble Ruler کے الفاظ کندہ ہیں۔

اللہ آباد کا مدرسہ 1906ء سے قبل پرائمری درجے تک تھا واضح ہو کہ چوہدری موجودہ لیاقت پور کا نام ایک قصبہ اور اسٹیشن کے طور پر تو ملتا ہے لیکن اصل آبادی اللہ آباد میں مقیم تھی ویسے بھی اللہ آباد کو 1727ء میں ریاست بہاولپور کے پہلے دارالخلافہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ 1906ء میں اللہ

آباد کے پرائمری سکول کو درنیکولر مڈل کا درجہ دیا گیا اور اسی سال اسے انگریزی عمل کا درجہ ؟ حاصل ہوا اس وقت سو طلباء داخل تھے لیکن سکول کی عمارت صرف ایک برآمدے پر مشتمل تھی۔ 25 جولائی 1906ء کو مشیر صاحب تعمیرات نے اللہ آباد تحصیل کے جنوب مغرب میں مدرسہ کی تعمیر کا حکمایا اور خالی جگہ پر کرکٹ کھیلنے کا میدان بنانے کی تجویز ہوئی یاد رہے کہ کرکٹ کا کھیل بہاولپور ریاست کے اکثر بڑے مدارس میں نواب بہاول خان خامس نے شروع کرایا تھا جو خود اپنے قیام ایچی سن کالج میں اور اس کے بعد بھی کرکٹ کھیلتے تھے۔

1906ء کے لگ بھگ اللہ آباد سکول کا ہیڈ ماسٹر پرمانند نامی ایف اے تھا اس سکول کا عملہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ 1906ء میں ضلع رحیم یار خان کے دوسرے اہم قصبات خان بیلہ، پکالاڑاں، ترنڈہ، شیدانی، واگراں، چاچڑاں، غوث پور، تجہ، گڑھی اختیار خاں کوٹمابہ، تاجگڑھ، کوٹ سبزل، محمد پور لمہ ، احمد پور لمہ اور ترنڈہ محمد پناہ میں پرائمری سکولوں کے نام ملتے ہیں۔ جون 1924ء میں اس علاقے کے پرائمری درجہ جات واقع بنزور کوشمابہ، گڑھی اختیار خان وہ غوث پور اور پکالاڑاں میں انگریزی تعلیم کے اجراء کے احکامات صادر ہوئے ان تمام کوائف سے ظاہر ہے کہ ریاست بہاولپور کا یہ ضلع رحیم یار خان تعلیمی طور پر اس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے پسماندہ نہ تھا پھر اگر اس وقت کی آبادی کو سامنے رکھا جائے تو مدارس کی ایک خاصی تعداد سامنے نظر آتی ہے ریاست کے آخری جمہوری دور میں دینی مدارس کی تنظیم نو کی گئی مسجد کتب حکیم اس دور کی یادگار ہے جس کا آغاز 1954ء میں کیا گیا ائمہ کی گذر اوقات کا انتظام ہوا اس ضلع کے ہر قصبہ ودساتر میں بھی ان مدارس کو جاری کیا گیا اس سکیم کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے صدر ضیاء الحق کے دور میں مسجد کتب حکیم پاکستان بھر میں رائج کی گئی لیکن بعد ازاں حکومت کی تبدیلی سے یہ سکیم اپنی موت آپ مر گئی۔

ماخذ

1:صادق الاخبار 1867ء1955ء

2 ایڈ منسٹریشن رپورٹس از 1867ء تا 1950ء

3:بہاولپور ریویو 53-1952ء۔

4 : گزیر بہاولپور سٹیٹ 1906ء۔

رحیم یار خان میں ریاست کے دور میں 1951ء میں 100 5000X فٹ کا ہوائی اڈہ تھا جو 1957ء میں وفاقی حکومت کو ٹرانسفر کیا گیا۔ 1965ء میں اس میں 1500 فٹ کی توسیع کی گئی۔ کراچی سکھر۔ رحیم یار خان روٹ پر PTA کی ڈکوٹہ سروس یکم فروری تا یکم جولائی 1967ء کے درمیان چلائی گئی جبکہ خانپور میں 1920 میں برٹش انڈیا گورنمنٹ نے 165 5000 x فٹ کا سول ہوائی اڈہ تعمیر کیا۔۔ رحیم یار خان میں سب سے پہلا بنک عباسیہ کوآپریٹ بک لینڈ اپریل 1950 میں کھلا باقی بنکوں کے آغاز کردہ سال یوں ہیں.

)MC-B 1962 -1966 U-B-L(5) 1964 A-B-3) 1961 (2) 1955 (1)
L(4)

1952ء سے قبل یہاں بجلی نہیں تھی۔ مکینیکل اینڈ الیکٹریکل ڈیپارٹمنٹ ریاست بہاولپور کی طرف سے ڈیزل کے ذریعے 1952ء میں 648 کلوواٹ رحیم یار خان اور 1955ء میں 225 کلوواٹ خان پور میں دو بجلی گھروں سے بجلی فراہم کی گئی۔ ریاست کے ختم ہونے کے بعد پنجاب پی۔ڈبلیوڈی کے شعبہ بلی نے دونوں بجلی گھر اپنی تحویل میں لے لئے۔ 1959ء میں واپڈا کے قیام کے بعد 1964ء ان شہروں کو نیشنل گرڈ سلم (AS) سے منسلک کر دیا گیا۔

رحیم یار خان اور خان پور میں طبی سہولتوں کا آغاز ڈسپنسریوں کے قیام سے ہوا جو خان پور میں 1869ء اور رحیم یار خان میں 1892ء میں قائم کی گئیں۔

تحریک پاکستان کا ایک خاموش کارکن

(چوہدری فضل دین، ڈرائیور قائد اعظم)

چوہدری فضل دین ریاست کپور تھلہ کے مہارجہ کے بیٹے کنور صاحب کے پاس بطور ڈرائیور کام کرتے رہے ہیں ۔ چوہدری فضل دین کو قائد اعظم کے ساتھ بطور ڈرائیور کام کرنے کا موقع ملا چوہدری صاحب آج کل ریوالور میں اور کالونی میں مقیم ہیں۔ ان سے فروری 2003 میں پروفیسر محمد طاہر اور پروفیسر آفتاب گیلانی نے گراں ایک انٹرویو کیا جو قار ئمیں یاد چپسی کیلئے پیش خدمت ہے۔

چوہدری فضل دین صاحب، آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ میں1922ء میں جالندھر (بھارت) میں پیدا ہوا۔

میں نے 1941ء میں کپور حملہ کے نواب کے ہاں بطور ڈرائیور ملازمت اختیار کرلی۔ میں ان کے بیٹے کی گاڑی چلاتا تھا۔ اسی دوران 1941ء میں قائد اعظم کپور تھ ملہ ریاست آئے اور وہاں دو دن قیام فرمایا۔ آپ وہاں ٹھیکیدار تنظیم شش سے ملنے آئے تھے۔ ٹھیکیدار نے کنور صاحب سے گاڑی کی درخواست کی تو انہوں نے گاڑی سمیت میری ڈیوٹی لگادی اور میں دو دن تک حضرت قائد اعظم کی خدمت میں حاضر رہا۔ قائد اعظم کے ساتھ جہاں جہاں جانا ہوتا میں ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ قائد اعظم شہر کے اندر تین چار جگہوں پر تشریف لے گئے اکثر لوگ خود ہی قائد اعظم سے ملنے آجاتے تھے۔ ویسے بھی ریاست کپور تھلہ میں 75 فیصد آبادی مسلمانوں کی تھی۔ میں نے قائد اعظم کو انتہائی شفیق، ٭ ھربان اور کم گو پایا، وہ زیادہ باتیں کرنا پسند د کرتے تھے، مطلب کی بات کرتے اور خوصورت گفتگو کرتے تھے۔ جب قائد اعظم کو اسٹیشن پر چھوڑنے گیا تو انہوں نے جیب میں سے کچھ رقم نکالی جو وہ مجھے دینا چاہتے تھے مگر میں نے رقم لینے سے انکار کر دیا کہ مجھے تو آپ کی نظر کرم چاہیے، میں یہ رقم نہ لوں گا۔

میری ملاقات 1947ء میں اس وقت ہوئی جب قائد اعظم گورنر جنرل کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے میں ان سے گورنر جنرل ہاؤس ملنے گیاتو حضرت قائد اعظم مجھ سے انتہائی پاک سے انا وہ ملے، حال احوال پوچھا۔ قائد اعظم بلاکے ذہین اور اچھی یاداشت والے انسان تھے میں جب بھی ان سے ملنے کیلئے جاتا وہ فورا مجھے پہچان لیا اور بڑے جوش و خروش سے ملتے میری دوسری بار حضرت قائد اعظم سے ملاقات 1942ء میں کوئٹہ میں ہوئی کیونکہ میں برطانوی انڈین فوج میں بھرتی ہو کر ان دنوں کوئٹہ میں تعینات تھا، اچانک شہر گیاتو ایک جلوس نکلاہوا تھا، میں نے دیکھا قائد اعظم اور قاضی محمد عیسی بھی میں سوار ہیں۔ شام کو میں قاضی عیسی کے گھر قائد اعظم سے ملنے کیلئے گیا وہاں قائد اعظم نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور قاضی عیسیٰ سے کہا کہ یہ میرے خاص ڈرائیور ہیں ان کا خاص خیال رکھنا اور یہ جب بھی مجھ سے ملنے آئیں انہیں ملنے دینا۔ انہوں نے میری خیریت دریافت کی مجھے چائے پلائی اس کے بعد میں ان کی اجازت سے رخصت ہوا۔

کوئی اور خاص واقعہ بتامیں؟

جب ایک دفعہ کوئٹہ میں ہندوؤں کے گھر کو جلادیا گیاتو قائد اعظم اور ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح وہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ہماری قوم کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ یہ ہمارا ہی نقصان ہے اور اس کے اخراجات ہم نے ہی اپنے قومی خزانے سے ادا کرنے ہوں گئے ویسے بھی پاکستان میں رہنے والی تمام اقلیتوں کے حقوق و مفادات کا خیال رکھنا اور ان کو تحفظ دینا حکومت اور عوام کا قرض ہے۔

حضرت قائد اعظم جب کبھی گشت پر نکلــتے تھے تو ان سے عملے کے اَرکان کہتے کہ آپ کو سکیورٹی فورس کے ہمراہ نکلنا چاہیے لیکن آپ اس موقع پر فرماتے کہ "میں اپنی قوم کا لیڈر ہوں مجھے اپنی قوم سے کوئی ڈر نہیں ہے اگر آج وہ کہہ دیں کہ میں الگ ہو جاؤں تو میں فورا ریٹائر ہو جاؤں گا۔"

فضل دین صاحب 1960ء میں کوئٹہ سے بہاولپور تبدیل ہوئے۔ آپ 1979ء میں حیثیت ڈرائیور ہی ریٹائر ہوئے ساری عمر حلال کی روزی کھائی یہاں تک کہ، سرکاری گاڑی پر کبھی اپنے گھر کا راشن تک نہیں لائے۔ اُنہوں نے بتایا کہ ریاست بہاولپور کے قانون کے مطابق دوسوروپے سے کم تنخواہ والوں کے بچوں سے فیس نہ لی جاتی تھی لہذا اس قانون کا مجھے بھی فائدہ ہوا۔ ان کے چار بیٹے خاک عیاشی ہے اور ایک بیٹی جو تمام کے تمام یہیں سرکاری ملازم ہوئے۔

آخر میں چوہدری فضل دین نے قائد اعظم کی خوراک کے حوالے سے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے ان کے خانساماں سے پوچھا کہ قائد اعظم کے خانساماں ہونے کی وجہ سے تمہاری تو عیاشی ہو گی، قسم قسم کے ہیں کھانے کھاتے ہوگے تو اس نے کہا کہ قائد اعظم اور ان کی ہمشیرہ صرف ایک ایک چپاتی کھاتے ہیں زیادہ خوش خوراک نہیں ہیں۔ مختصر اور سادہ غذا کھاتے تھے۔ قائد اعظم اکثر اوقات اپنے کام میں مصروف رہتے تھے کم گو تھے اور مطلب کی بات کرتے تھے۔

تاریخ ریاست بہاول پور کی ابتدائی اردو کتب کا جائزہ

ریاست بہاول پور کے حکمرانوں کے آباؤ اجداد عرب سے ہندوستان اس وقت آئے جب ۱۲۴۸ء بغداد میں سلطنت عباسیہ تاتاریوں کے ہاتھوں نیست و نابود ہو گئی۔ سقوط بغداد کے بعد جب عباسی النسل افراد نے محفوظ مقامات کا رخ کیا تو ان کا ایک گروہ سندھ میں مقیم ہوا۔ انہی عباسیوں کی ایک شاخ داؤد پوتروں نے اپنے رشتہ دار کلہوڑوں سے باہمی چپقلش کی بناء پر اپنے سردار صادق محمد خان اول (۱۷۲۷-۱۷۲۶ء) کی سرکردگی میں بہاول پور کے موجودہ علاقہ کی طرف نقل مکانی کی اس وقت یہ خطہ ماسوائے اُچ، مومبارک شہر فرید، وبخروٹ اور پھولڑہ جیسی مشہور مقامات کے بے آب و گیاہ چولستان پر مشتمل تھا (۱)۔ داؤد پوترہ خاندان اور اس کی تمام بڑی اور ذیلی شاخوں عاربانی، پرجانی، ایسانی، کہرانی، ہلانی اور معروفانی نے اپنی عددی اکثریت کی بناء پر اس خطے کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان قبائل نے دیکھتے ہی دیکھتے بہاول گڑھ، حاصل پور، گوٹھ قائم، خیر پور، بہاول پور، احمد پور شرقیہ، خانپور، نوشہرہ (رحیم یار خان) اور احمد پور لمہ جیسے شہروں کو آباد کیا (۲)۔ اور یوں ۱۷۲۷ء میں ریاست بہاول پور کا قیام عمل میں آیا جس کا وجود اندرونی طور پر ایک خود مختار ریاست کی حیثیت سے ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء تک برقرار رہا۔

ابتدا ریاست بہاول پور کی داؤد پوترہ حکومت قبائلی جاگیردارانہ نظام پر قائم تھی۔ ریاست کے طول و عرض میں اس خاندان کی شاخیں اپنے اپنے علاقوں میں مقدر تھیں اور صحیح معنوں میں مرکزی اختیار اور حکومتی اداروں کا وجود مفقود تھا لیکن ظاہری اطاعت کا مربع بہاول پور کا پرجانی سردار ہوتا تھا۔ ان قبائلی جاگیرداروں کو ایک مرکزی حکومت شائی کے زیر انتظام لانے کا سہرا نواب بہاول خان ثانی (۱۷۷۲ء-۱۸۰۹ء) کے سر جاتا ہے جنہیں شاہ عالم ثانی نے "رُکن الدولہ" نصرت جنگ

حافظ الملک کا خطاب عطا کیا۔ انہیں شاہ محمود بادشاہ کابل کی طرف سے ۱۸۰۲ء میں سکہ ڈھالنے کی اجازت بھی حاصل ہوئی۔ اُردو مخلص الدولہ کا خطاب دیا گیا۔ (۳)

رفتہ رفتہ یہ صحرائی علاقہ ایک پر شکوہ ریاست کا درجہ اختیار کر گیا۔ جس کی تابناکیوں کی داستانیں مورمعین کے قلم کا حصہ بنیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ محققین اور مورخین کو اس گم گذشتہ تاریخی سرمایہ سے مستفید کرنے کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ جو زمانے کی دست برد کا شکار ہو کر معدوم ہونے کے قریب ہے۔ بہاول پور کے اس تاریخی ورثہ میں سے تاریخ مراد جلد چہارم و پنجم، صادق التواریخ اور صبح صادق خاص طور پر اہم ہیں۔ جنہیں درباری تاریخ نگاری کا درجہ حاصل ہے۔ ان پر تبصرہ حسب ذیل ہے:۔

تاریخ مراد (جلد چھارم)

تاریخ مراد کو اردو زبان میں تاریخ بہاول پور کے سب سے پہلے ماخذ ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ اس قلمی نے کے مصنف سید مراد شاہ گردیزی کا تعلق ملتان کے گردیزی خاندان سے تھا۔ اسے اکتوبر ۱۸۶۵ء میں پیر عباس خان کی پنشن یابی پر ریاست بہاول پور کا نیٹو پولیٹکل ایجنٹ مقرر کیا گیا۔

مراد شاہ کو بہاول پور میں پہلی صدر عدالت چیف کورٹ) کے قیام پر یہاں کا صدر منصف (چیف جسٹس) مقرر کیا گیا۔ اس عہدہ پر وہ اپنی وفات تک قائم رہے (۴)۔ ان کے منصفانہ فیصلے آج بھی زبان ذو عام و خواص ہیں اور ان کی انصاف پسندی سے وابستہ یہ کہاوت لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں اور سر دھنتے ہیں کہ مر جو گیا مراد شاہ (۵)۔

انہوں نے اپنے ہمعصر مورخین کی ڈگر سے ہٹ کر واقعات نویسی کا فریضہ سرانجام دیا ہے وہ طریقہ جو درباری مورخین اور قصیدہ گودوں کے انداز سے ہٹ کر تھا اور جس میں حقیقت نگاری کا عصر واضح ہے تاریخ مراد پانچ جلدوں پر مشتمل ہے جو ملتان کے گردیزی خاندان کی تحویل میں ہے۔ اس

کی جلد چہارم کے چار سو چھ صفحات خالصتاً ریاست بہاول پور پر تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ حصہ نواب بہاول خان ثالث کی تخت نشینی ۱۸۲۵ء سے لے کر نواب بہاول خان رابع کی وفات ۲۵ مارچ ۱۸۶۶ء تک کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہیں۔ ۴۰۶ صفحات پر مشتمل اس جلد کے ابتدائی چونسٹھ صفحات، صرف فہرست عنوانات کے لیے مختص کیے گئے ہیں یہ عنوانات تعداد میں ۲۸۹ ہیں تاریخ مراد میں واقعات کو سنین اور ماہ ایام کی ترتیب و تسلسل سے بیان کیا گیا ہے چوتھی جلد کے چند اہم واقعات کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

نواب بہاول خان ثالث نے اپنے عہد کا آغاز اپنے مستوفیان دفتر شیخ مقبول احمد اور شیخ نور محمد کے قتل سے کیا۔ اس قتل کے پس پشت وزیر محمد یعقوب خان کا ذاتی عناد اور بغض تھا کیونکہ مستوفیان مذکورہ نے یعقوب خان کو وزیر بننے سے قبل ایک بار اس کی مقبوضہ اراضی پر واجب الادا محصول کی وصولیابی کا تقاضا شدت سے کیا تھا۔ اس بناء پر وزیر بنتے ہی محمد یعقوب خان نے مستوفیان کے خلاف بہاول خان ثالث کو خوب بھڑکایا اور آخر کار ان دونوں کے قتل کا فرمان حاصل کر کے انہیں انتہائی سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس واقعہ سے اس دور کے درباری سازشانہ ماحول کی عکاسی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ نوابین کس طرح کانوں کے کچے ہوتے تھے جو محض قریبی امراء کے بہکاوے میں آکر کسی بھی شخص کے قتل جیسا انتہائی حکم دے ڈالتے تھے لیکن تاریخ خود کو دہراتی ہے اس نواب نے آخر کچھ عرصہ بعد اپنے چہیتے وزیر یعقوب خان اور اس کے رشتہ داروں دائم اور قائم کو قتل کرا دیا۔ تاریخ مراد کا درج ذیل اقتباس اصل واقعہ سے یوں پردہ اٹھاتا ہے:۔

ہر گاہ نواب محمد بہاول خان ثالث کو نسبت محمد یعقوب وزیر ریاست کے یہ شک ہوا کہ سرانجامی امورات ریاست میں متغافل اور ملازمان فوج وغیرہ کو عدم آدائی مشاہرہ سے تنگ کر رکھا ہے اور محد

قائم مامون اس کے نے مجملہ زر آمدنی ڈیرہ غازی خان میں تغلب کر کے داخل توشہ خانہ ریاست نہیں کیا تو نواب صاحب محروح در پی نقصان جان محمد یعقوب ہوئے محمد یعقوب اس منصوبے سے غافل ہو کر شادی ختنہ پسر ان خود بہ تمام تورک دشان کے واسطہ ظاہر کرنے رسوخ اپنے کے بخدمت نواب صاحب بہادر درخواست قدوم بخانہ خود کر کے زنان و دختران مندرجہ ہذا کو خدمتگاری میں پیش کیا۔ نواب صاحب بہادر دام محبت مسمات خیر قدم زوجہ و مسلمانان گامن خاتون حیات خاتون، صاحب خاتون، دختران محمد یعقوب میں آکر کینہ ویران تازہ فرمایا اور بروز دوشنبہ محرم ۱۳۵۲ھ میں مسمیان فرید حیدر شاہ وعبد القادر شاہ بازی گیر ان کو حکم دیا کہ محمد یعقوب کو معہ محمد دائم و محمد قائم مکان سے لا کر باغ مراد میں نظر بند کریں چنانچہ مسمیان مذکور دین نے محمد یعقوب کو گھر سے بولا کر حکم نواب صاحب بہادر سے آگاہ کیا۔ محمد یعقوب کو تسلیم ارشاد کر کے پاؤپیادہ روانہ باغ مراد ہوا کہ سائیں محمد یعقوب نے گھوڑا نجبہ تہ سواری پیش کیا۔ محمد یعقوب نے کہا کہ جب تک نواب صاحب نے گھوڑے پر چڑھایا تھا چڑھتا رہا اب چڑھنا مناسب نہیں جب نواب صاحب بہادر کے حضور میں رپورٹ ہوئی کہ محمد یعقوب معہ محمد دائم و محمد قائم باغ مراد میں لائے گئے ہیں تو حکم دیا کہ محمد یعقوب کو پلٹن کپتان پویم رام میں اور محمد دائم اور محمد قائم کو پلٹن کپتان میگرسن صاحب میں مقید اور تمام کمال اسباب ہر سہ ۳ رانسان ضبط کر کے داخل توشہ خانہ کریں چنانچہ تمام اثاث بیت خانگی منطبقہ داخل توشہ خانہ و اسپان داخل طویلہ ہوئی اور ایک ظرف طلاء مہمولہ اشرفی سید میر شاہ رشتہ دار محمد یعقوب سے برآمد ہو کر داخل منضبطی ہوا۔ منضبطی ہو ابعد اس کے شب چہارم شنبہ ۳ محرم ۱۲۵۲ ہجری کو شاہ محمد خاص خیلے برادر ملان جیون نے حسب الحکم نواب محمد بہاول خاں ثالث ایک پیالہ زہر آلودہ لا کر ظاہر کیا۔ مسمات جان بی بی بیگم جناب نواب محمد بہاول خان ثالث وحرم میں تمہاری سلام اور دعادے کر فرمایا ہے کہ اس شربت کو پی یویں محمد یعقوب نے شربت کو پیتے ہی سمجھ لیا کہ اس میں زہر کی ہوتی ہے۔

پیالہ کو زمین پر پھینک کر شاہ محمد کو گالی دے کر کہا صد حیف ایسے شربت پلاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد محمد یعقوب کو قے و اسہال جاری اور قلق نمودار ہوا تقریب صبح کے تمام بدن سرد ہوا لیکن نواب صاحب بہادر نے یہ خیال فرمایا کہ بموجب عادت مقہورہ کے محمد یعقوب نے جس دم کیا ہو گا اور مرا نہیں اس واسطہ ایک سپاہی پلٹن پریم رام نے سر اس کا کاٹ کر نواب صاحب کو ملاحظہ کرایا اور حکم ہوا کہ لاش محمد یعقوب کو لے کر دفن کر دیں اور محمد دائم کو پابجولان کر کے قلعہ اسلام گڑھ اور محمد قائم کو قلعہ دین گڑھ میں مقید کریں۔ ازاں بعد یکم صفر ۱۲۵۲ھ کو مسماۃ خیر قدم حاملہ زوجہ محمد یعقوب کو حرم سرا میں طلب فرما کے حکم دیا کہ یہ حرم سرائے میں رہے اور جب دفعہ حمل ہو جاوے تو اطلاع دیں چنانچہ پانچ ربیع الاول ۱۲۵۱ھ کو اللہ داد تیسرا پسر محمد یعقوب پیدا ہوا اور تفویض دائی کیا گیا اور مسماۃ خیر قدم بعد غسل ولادت بستر آرائی نواب ممدوح ہوئی اور بعد ازاں مسلمانان گامن خاتون، نعمت خاتون حیات خاتون صاحب خاتون دختران محمد یعقوب داخل حرم سراء ہو کے مشرف اندوز ہم بستری جناب نواب ختم ہوئیں۔(۶)

درج بالا عبارت سے واضح ہے کہ یعقوب خان کے قتل کا اصل محرک وزیر محمد یعقوب کی خوبرو اہلیہ اور اس کی بیٹیاں تھیں جنہیں اپنے حرم میں ڈالنے کی فوری خواہش رزمیہ مذکورہ کے قتل کا باعث ہوئی۔ مراد شاہ کا یہ دنیا کانہ انداز تحریر ظاہر کرتا ہے کہ مؤلف اپنے فن تاریخ نویسی میں بغیر لگی لپٹی کے حقیقت کو آشکارہ کرنے کا خوگر ہے اور اس کا یہی انداز اسے اپنے ہمعصروں، پیشروؤں اور متاخرین سے ریاستی تاریخ نویسی کے فن میں ممتاز کرتا ہے۔

تاریخ مراد کو اگر حکمرانوں کے ذاتی حالات کی سرگشت کے علاوہ ریاست کی سیاسی تاریخ بھی کہا جائے تو یہ بے جا نہ ہو گا۔

مزید بر آں اسے ایسٹ انڈیا کمپنی اور امیر ان بہاول پور کے تعلقات پر ایک مستند دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔ اس میں ان تمام معاہدات کو شامل کیا گیا ہے جو انگریزوں اور ریاست بہاول پور کے مابین طے پائے۔ ۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ طے پائے جانے والے پہلے معاہدے کا مقصد رنجیت سنگھ حاکم پنجاب کے ریاست بہاول پور کے خلاف جارحانہ اقدامات سے بچاؤ کے لیے کسی طاقتور حلیف کی تلاش تھا۔ اس معاہدہ کی دفعات نمبر دو اور چار کے تحت امیر ان بہاول پور کی داخلی و خارجی خود مختاری کو تسلیم کیا گیا اور ہر قسم کی مداخلت سے باز رہنے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ یہ معاہدہ ایک طرف تو ریاست کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ باہمی سیاسی روابط پر روشنی ڈالتا ہے اور دوسری طرف اپنی حدود میں بہنے والے دریائے سندھ اور ستلج پر ریاست کے اقتدار اعلیٰ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ اسی معاہدے کے تحت حکومت بہاول پور کو متذکرہ بالا دریاؤں سے گزرنے والی تجارتی کشتیوں پر محصول عائد کرنے کا اختیار تفویض کیا گیا تھا۔ اس معاہدہ کا ایک اور تمہ ۲۹ دسمبر ۱۸۳۴ء کو تکمیل پذیر ہوا جس کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دریائے سندھ و ستلج سے گزرنے والی تجارتی کشتیوں پر محصول کے بارے میں بعض مراعات حاصل ہوئیں۔ تاریخ مراد میں آگے چل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۸۳۸ء کی اسی جبری مسلط کردہ معاہدہ کا ذکر ہے جسے کمپنی کے مدبروں کی طرف سے ریاست کو مکمل طور پر اپنے زیر اثر کرنے کی شاطرانہ چال قرار دیا جاسکتا ہے (۷)۔ یہ زبردگی کا وہ معاہدہ تھا جسے ریاست کی ماتحتی کی دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔ مثلاً اس کی شرط دوئم کی رو سے سرکار انگریزی کو بہاول پور کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا (۸)۔ شرط سوئم کے تحت نواب بہاول خان اور اس کے ورثاء کمپنی بہادر کے مطیع قرار دیئے گئے۔ اسی طرح شرط چہارم کی رو سے اسے کمپنی بہادر کا مطیع قرار دیا گیا۔ ۵ اگست ۱۸۴۰ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دریائے ستلج و سندھ سے گزرنے والی تجارتی کشتیوں کے محصول پر مزید تخفیف کے لیے ریاست بہاول پور سے ایک اور

معاہدہ پر دستخط کرائے۔ چھ دفعات پر مشتمل ایک اور معاہدہ تجارت استمبر ۱۸۴۳ء کو طے پایا جس کی رو سے دریائی راستے سے گزرنے والی کشتیوں سے نصف محصول لینے اور خشکی کے راستے تاجروں سے محدود محصول عائد کرنے کی دستاویز تیار ہوئی۔ علاوہ ازیں ریاست کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ بہاول پور سے سرسہ تک سڑک کی تعمیر اور اس کے کناروں پر پختہ کنویں اور سرائیں تیار کرائے۔ اگر درج بالا تمام معاہدات کی تفصیل و نوعیت پر غور کیا جائے تو ماسوائے ۱۸۳۲ء کے اولین معاہدے کی معقولیت کے باقی تمام معاہدات کا مقصد بہاول پور کے مفادات سے قطع نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بالادستی، اجارہ داری اور مراعات کا حصول تھا۔

تاریخ مراد کے مطابق مشہور سیاح الیگزینڈر برنس سندھ اور کابل کی سیاحت کے دوران جب دریائی راستے وارد بہاول پور ہوا تو اس موقع پر وہ احمد پور شرقیہ میں نواب بہاول خان ثالث کا مہمان ہوا (۹)۔ وہ اپنے سیاحت نامے میں خود تحریر کرتا ہے کہ ۲۲ اپریل ۱۸۳۸ء کو جب میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مٹھن کوٹ پہنچا تو یہاں سے بہاول پور تک ہر گھاٹ پر ہمارا زبردست استقبال کیا گیا۔ راستے میں ہر پڑاؤ پر خوب مدارت کی گئی۔ اس موقع پر ایک انتہائی مضحکہ خیز صورت اس وقت پیش آئی جب ہماری آمد سے قبل نواب بہاول خان کو کسی نے بتایا کہ ہم لوگ مینڈک کھانے کے بڑے شائق ہوتے ہیں تو اس نے ہماری خاطر بہت سے جوہڑوں اور تالابوں میں مینڈک جمع کرائے تاکہ ہماری ضیافت کا سامان ہو۔ مراد شاہ لیفٹیننٹ میگرسن دربار بہاول پور آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ نومبر ۱۸۳۸ء میں یہاں پہنچا تاکہ مہم کامل کے دوران بہاول پور کی راہ سے گزرنے والے لشکر کے لیے رسد کی فراہمی کو ممکن بنایا جاسکے۔ اسی طرح جب تسخیر افغانستان کے لیے شاہ شجاع الملک کے ہمراہ ولیم میکنائن اور جنرل ناٹ انگریزی افواج کے ہمرکاب دریائے ستلج کے راستے ریاست بہاول پور کی حدود میں داخل ہوئے تو اسی موقع پر حاصل پور، گوٹھ قائم اور خیر پور کے

دریائی گھاٹوں سے گزرنے کے دوران ان کا استقبال کیا گیا اور جب یہ قافلہ بہاول پور کے نزدیک جھانگی والی پہنچا تو نواب بہاول خان نے بذات خود بڑے تزک واحتشام سے اس کی پذیرائی کی اور اس موقع پر بطور نذرا ایک سو پچیس اشرفیاں پیش کی مزید ازاں شاہ اور اسی کے مصاحبین کے استعمال کے لیے بڑی مقدار میں بادام مصری مٹھائی، عرق بید مشک وگلاب، میوہ جات اور دیسی پھل مہیا کیے گئے۔ جب شاہ بہاول پور سے رخصت ہوا تو بہاول خان نے دوبارہ ایک سو پچیس اشرفیاں نذرانہ کے علاوہ مبلغ پانچ ہزار روپے، اکادن تھان نفیس پارچات، ایک باز، دو گھوڑے اور دوانت مع طلائی و نقرہ کی سازوں کے پیش کیے۔ اس طرح جب ۷ اگست ۱۸۳۹ کو تسخیر کابل کی اطلاع پہنچی تو احمد پور اور بہاول پور میں چراغ بندی کرائی گئی (۱۰)۔

تاریخ مراد کے مطالعہ سے نواب بہاول خان ثالث کے مذہب سے عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نے دو اشخاص سید احمد شاہ اور حکیم قمر الدین کو اپنی طرف سے حج کی ادائیگی کے لیے روانہ کیا، انہیں بطور سفر خرچ دو ہزار روپے عطا کیے۔ مزید ازاں روضہ مطہرہ

حضور ﷺ کی نذر کے لیے مبلغ پانچ ہزار روپے ادا کیے۔ جب سید احمد شاہ حج سے واپس ہوا اور اپنے ہمراہ تبرکات مقدسہ از قسم آب زمزم، خاکِ شفاء پارچہ غلاف روضہ، پارچہ غلاف بیت اللہ شریف اور نقشہ بیت اللہ شریف وروضتہ الرسول ﷺ اور پارچہ غلاف روضہ خدیجہ الکبری پیش کیا تو نواب مذکورہ نے سید محمدوح کے ہاتھوں اور پیروں پر اپنی آنکھیں ملیں۔ اسے فاخرہ سے نوازا اور ایک چاہ بطور انعام دینے کے علاوہ خیرات دامداد کی تقسیم کا کام سید احمد شاہ کے سپرد کر دیا۔

ہمیں یہ کتاب پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بہاول خان ثالث حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کا مرید تھا (۱۱)۔ وہ ۲۴ جنوری ۱۸۵۱ء کو مزارات دہلی و اجمیر کی زیارت کے لیے سفر پر روانہ ہوا اور بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دینے کے بعد واپس ہوا۔ ریاست بہاول پور کو چونکہ ایک اسلامی

ریاست سمجھا جاتا تھا اس لیے افغانستان کے انگریز دشمن پٹھان اسے اپنا دوست گردانتے تھے۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی کہ امیر ان بہاول پور انگریزوں کے زبردست حلیف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سر الیگزینڈر برنس کے قاتل امیر شکار خان نے اس کا کام تمام کرنے کے بعد اس کا تمام سامان رمضان نامی افغان کے ذریعے نواب بہاول خان ثالث کے پاس روانہ کر کے مواخات اسلامی کے نام پر دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہاتو نواب مذکورہ نے نا صرف وہ سامان اُسے واپس کر دیا بلکہ رمضان نامی افغان کو انتہائی ذلت سے اپنے علاقے سے نکال باہر کیا اور اسی واقعے کی اطلاع فوراً انگریزی حکومت کو دے کر ان کی اشیر باد حاصل کی۔(۱۲)

اس مخطوطہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب بہاول خان ثالث سیر و شکار کا انتہائی شائق تھا۔ اس میں بہاول گڑھ علاقہ شرقی ریاست میں شکار کا وہ واقعہ درج کیا گیا ہے جس کے دوران نواب مذکورہ کی گولی سے ایک ملاز سرور شاہ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی(۱۳)۔ یہ پہلا نواب تھا جس نے اپنے بیٹے محمد خان کو انگریزی تعلیم دلانے کے لیے ہندوستان سے ایک استاد لالہ رکھن لعل کو بلوا کے تعینات کیا۔(۱۴)

چونکہ یہ تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی اور دربار بہاول پور کے تعلقات پر ایک مستند ماخذ کا درجہ رکھتی ہے اس لیے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہاول پور میں کمپنی کی جانب سے کون کون سے پولیٹیکل ایجنٹ اس دور میں متعین ہوئے اور ان کا کیا کردار رہا۔ جیسا کہ ۱۳ اپریل ۱۸۴۵ء کو پیر ابراہیم کی جگہ لیفٹیننٹ کننگھم اسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کی گیا(۱۵)۔ اسے خصوصا ریاست بہاول پور اور ریاست بریکانیر کے مابین سرحدی جھگڑے کو نپٹانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن غالباً اس کی ناکامی پر اسے بہت جلد واپس بلا کر اس کی بجائے ۲۱ دسمبر ۱۸۴۵ء کو پیر ابراہیم خان کو دوبار تعینات کیا گیا(۱۶)۔ جس پر وہ اپنی وفات تک قائم رہا۔ لیفٹیننٹ کننگھم نے بعد ازاں اپنے وقائع ہندوستان کے عنوان سے

سندھ، راجھستان اور بہاول پور کے خصوصی حوالے سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی۔ دوبارہ تعیناتی کے بعد پیر ابراہیم کو کچھ عرصہ کے لیے ولایت روانگی کا حکم دیا گیا اور اس کی جگہ پیر احمد خان کو تعینات کیا گیا۔ تاریخ اس ضمن میں خاموش ہے کہ پیر ابراہیم کی انگلینڈ سے واپسی کب ہوئی البتہ ۱۸۵۶ء اس کی وفات کا تذکرہ ملتا ہے جس کی جگہ پیر عباس خان نیٹڈ ایجنٹ مقرر ہوا۔ پیر ابراہیم نے کم و بیش تین نوابوں کا دور دیکھا تھا۔ اس کا عرصہ تعیناتی خاصا طویل ہے اس نے فاری زبان میں "سیر ستان" کے نام سے ایک کتاب شائع کرائی جس کا ایک حصہ بہاول پور کے تہذیب و تمدن پر بحث کرتا ہے۔ مولوی عزیز الرحمن نے اسی حصہ کا اردو ترجمہ "تمدن بہاول پور کے نام سے شائع کیا تھا۔ پیر ابراہیم نے اپنی تصنیف سیر ستان اور بہاول پور کے قدیم ماخذات مراق دولت عباسیہ وغیرہ مولوی شہامت علی کو مطالعہ کے لیے دیے جس نے ان کو پڑھ کر اور دیگر کتب کے مطالعہ کے بعد بہاول پور کی تاریخ پر انگریزی زبان میں پہلی کتاب " The History of Bahawalpur " سن ۱۸۴۸ء میں انگلینڈ سے شائع کرائی۔ پیر عباس جو پیر ابراہیم کے بعد اسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا (۱۷) کی پنشن یابی کا ذکر مراد شاہ ضرور کرتا ہے کیونکہ اکتوبر ۱۸۲۵ء میں وہ خود اس کی جگہ بطور نیٹو ایجنٹ متعین ہوا تھا۔

تاریخ مراد کے صفحات ۲۸ تا ۳۰ ہنگامہ ملتان کے اسباب، واقعات اور نتائج پر بحث کرتے ہیں۔ انہی صفحات میں ہنگامہ ملتان جو اینڈرسن کے قتل سے شروع ہوا اور مولراج کی شکست پر فتح ہوا کے فرد میں ریاست بہاول پور کی گراں قدر خدمات کا ذکر تفصیلا ملتا ہے۔ اس ہنگامہ کے ابتدائی ایام میں موراج کے آدمیوں نے ریاست کے شہر خیر پور سے لوگوں کو بھاری معاوضہ کی ادائیگی کا لالچ دے کر بھرتی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نواب بہاول پور کو بروقت علم ہو جانے پر ان کا یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔

اس تمام عرصہ کے دوران پیر ابراہیم نیٹو ایجنٹ کی تمام کوششیں ریاست بہاول پور سے انگریزوں کو ہر ممکن امداد کی فراہمی میں لگی رہیں۔ حتی کہ وہ بہاول پور کے فوج کے ہمراہ ملتان روانہ ہوا اور اس ہنگامہ کے خاتمہ تک وہیں رہا۔ معرکہ شجاع آباد اور ملتان کے دوران بہاول پور کے تقریباً ایک سو کے قریب سپاہی کام آئے ان میں ایک انگریز کپتان میگرسن بھی شامل تھے (۱۸) تسخیر ملتان کی خدمات کے صلے میں بہاول پوری افواج کے ہر سپاہی اور آفیسر کو خلعتیں اور انعامات دیئے گئے یہی نہیں بلکہ نواب بہاول خان ثالث کو گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کی طرف سے ایک لاکھ روپے کی سالانہ پنشن تا حیات مقرر ہوئی۔ علاوہ ازیں گورنر جنرل جب ملتان آیا تو اس نے خصوصی طور پر نواب بہاول خان سے ملاقات کی اور اسی موقع پر تحائف کا تبادلہ کیا گیا۔(۱۹)

تاریخ مراد نواب بہاول خان ثالث کی وفات اور اس کے بعد کے حالات پر بھی روشن ڈالتی ہے۔ نواب بہاول خان ثالث کے پانچ بیٹے تھے لیکن اس نے تخت نشینی کے لیے اپنے تیسرے بیٹے سعادت یار خان کو منتخب کیا۔ یہ صاحبزادہ ۱۸۳۲ء میں ایک جلدی عارضی کا شکار ہوا تھا جس کی بناء پر اس کی بائیں آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ تاہم اس شہزادہ کی جانشینی کے لیے نواب مذکورہ نے پیشگی گورنر جنرل سے منظوری حاصل کرلی تھی ۔ جس کی خواہش پر ۱۵ جنوری ۱۸۵۱ء کو خلعت منظوری بھی ارسال کر دی گئی تھی (۲۰) ۔ لیکن نواب بہاول خان ثالث کا یہ فیصلہ جذباتی تھا جس کی قیمت اس کے چہیتے بیٹے کو اپنی وفات تک ریاست بدری اور قید و بند کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۲ء کو بہاول خان ثالث نے مرض بخار و اسہال میں قلعہ ڈیراور میں وفات پائی۔ فوری طور پر وصیت کے مطابق سعادت یار خان نواب محمد صادق خان کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا (۲۱)۔ کیونکہ ایک تو وہ بلا استحقاق سابقہ اصول جانشینی کے تخت نشین ہوا تھا دوسرا اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے عزیز و اقارب اور ملازمین سے انتہائی نارواکا سلوک روا رکھا۔ اس نے اپنے بڑے

بھائی اور مستقبل کے نواب صاحبزادہ حاجی خان کو قلعہ شقی گڑھ میں قید کر دیا اور اخراجات میں حد درجہ کی کر دی۔ کئی ملازمین کو موقوف کر دیا گیا، علاوہ ازیں خواتین وارد پوترہ کی عزت و تکریم میں بھی کمی کر دی گئی۔ اس بناء پر اکثر لوگ اس کے مخالف ہو گئے۔ انہوں نے اس کی تخت نشینی کے صرف چار ماہ پانچ یوم بعد اس کے بڑے بھائی حاجی خان کو قید سے رہا کر کے سعادت یار خان کا تختہ الٹ دیا۔ صاحبزادہ حاجی خان ۲۲ فروری ۱۸۵۳ء، کو محمد فتح خان کے لقب سے تخت نشین ہوا (۲۲)۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی اور سابق نواب سعادت یار خان عرف صادق محمد خان کو قلعہ ڈیرا اور کے اندر اور پھر قلعہ سے باہر ایک مکان میں نظر بند کر دیا لیکن اس سے ہر ممکنہ حسن سلوک روا رکھا۔ آخر چیف کمشنر جان لارنس کی ہدایت پر اسے کمشنر ملتان کی تحویل میں دے دیا گیا اور اس کا وظیفہ سولہ سو روپے مقرر کر کے اسے لاہور مستقل قیام کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ لاہور پہنچ کر سعادت یار خان اپنے حق سے دست بردار نہ ہوا بلکہ آمادہ شورش ہوا اس پر اسے ۲۳ مارچ ۱۸۵۴ء کو قلعہ لاہور کے برج میں محبوس کر دیا گیا۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۵۴ء کو عبد اللہ خان جو نواب بہاول خان کا بیٹا تھا کہ نواب حکم فتح خان کے مقابلے میں تخت نشین کرنے کی سازش کی گئی۔ اس سازش میں سعادت یار خان (معزول نواب صادق محمد خان) کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ داؤد پوترے اسے قلعہ لاہور میں ملنے جایا کرتے تھے۔ سعادت یار خان مثمن برج لاہور میں ۱۸۷۸ء تک قید رہا جہاں کہ وہ مرض ہیضہ سے فوت ہوا۔ تاریخ مراد اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں نوابین کے ذاتی حالات کے علاوہ ان کے نظم و نسق مملکت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً ایک جگہ رقم ہے کہ نواب بہاول خان ثالث کے دور میں فوج کا خرچ صرف دو لاکھ روپے تھا جبکہ نواب فتح خان کے دور میں یہ اخراجات پانچ لاکھ تک جا پہنچے۔ اس کے دور میں تین سو چوروں کو علاقہ خان پور سے گرفتار کر کے ریاست میں آبپاشی کے لیے کھودی جانے والی نہروں کے کام پر لگا دیا گیا۔ اس نواب کے زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے کچھ

اور بھی معاہدات ہوئے مثلاً ۴ ار نومبر ۱۸۵۴ء کو آدم واہن میں ڈپٹی کمشنر ملتان اور ریاست کے نیٹو پولیٹیکل ایجنٹ پیر ابراہیم کے مابین مجرمان کی حوالگی کا معاہدہ طے پایا(۲۳) ۔ اس طرح ۸ جنوری ۱۸۵۶ء کو چیف کمشنر پنجاب کی تجویز پر ریاست کے بحری و بری راستوں سے گزرنے والے سامان تجارت پر عائد شد محصول کی شرح میں مزید تخفیف کی گئی۔ شروع سے ریاست میں انتہائی اعلیٰ قسم کی مصنوعات تیار کی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً مئی ۱۸۵۵ء میں فرانس میں منعقدہ مصنوعات کی نمائش کے لیے بہاول پور سے برتن، چاقو، مرصع زیورات، قیمتی لونگیاں، ریشمی کپڑا، قالین بلوار میں، بندوقیں اور ان کے میناکاری شدہ ساز روانہ کیے گئے۔

تاریخ مرادلاہور کے مشہور فقیر خاندان کے سراج الدین اور اس کے بھائی شاہنواز الدین کے دربار بہاول پور میں رسائی پانے اور پھر ان کے خلاف اختیار کیے جانے والے انتہائی اقدام پر روشنی ڈالتی ہے۔ نواب فتح خان کے دور میں فقیر سراج الدین کو وزیر اور فقیر شاہنوار الدین کو قلعہ ڈیراور میں متعین افواج کا جرنیل مقرر کیا گیا تھا۔ اتنے اہم عہدوں پر ان بیرونی افراد کی تعیناتی نے داؤد پوترہ سرداروں کے دل میں بغض و عناد کے جذبات پیدا کر دیئے اور وہ اس ٹوہ میں لگ گئے کہ کسی طریقے سے نواب کے سامنے ان کی قدر و منزلت کو کم کیا جائے۔ بشری کمزوریوں سے یہ دونوں برادران بھی میری نہ تھے، انہیں عورتیں رکھنے اور سرکاری مال میں تصرف کی عادت تھی۔ ان کی یہ سرشت داؤد پوترہ سرداروں کے لیے کارگر ہتھیار ثابت ہوئی۔ نواب فتح خان نے شکایت ہونے پر فقیر شاہنواز الدین کو قلعہ ڈیراور کے منصب سے بطرف کر دیا اور رفتہ رفتہ سراج الدین کی وقعت بھی کم کرنا شروع کر دی۔ آخر گیارہ مئی ۱۸۵۳ء کو فقیر سراج الدین کو بھی اپنے عہدہ سے موقوف کر کے اسے تقریباً نظر بند کر دیا گیا۔(۲۴)

داؤد پوتروں نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے فقیر سراج الدین کے پاس جاکر اس سے تو تکار کی اور پھر اسے شدید زخمی کر دیا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس کے فوراً بعد معزول شدہ جرنیل فقیر شاہنواز الدین کو بھی نواب نے گرفتار کر لیا اور ان کے خیر خواہوں کی برطرفیاں عمل میں لائی گئیں۔ اس دوران نواب فتح خان کو انکشاف ہوا کہ فقیر سراج الدین نے اپنے عہد وزارت کے دوران ریاستی خزانے سے کم و بیش دو لاکھ روپے اور قیمتی جواہرات خرد برد کر کے اپنے والد فقیر چراغ الدین کو لاہور بھجوا دیے ہیں۔ اس نے اس واقعہ کے فوراً بعد لاہور کے انگریز افسران کے توسط سے نواب فتح خان پر دباؤ ڈلوایا کہ وہ نہ صرف اس کے گرفتار شدہ بیٹے کی زندگی کی یقین دہانی کرائے بلکہ اس کی فوری رہائی بھی عمل میں لائی جائے۔ جس کے جواب میں نواب مذکورہ نے تحریر کرایا کہ اگر اس کے خزانے سے غبن شدہ تمام روپیہ اور ہیرے جواہرات جو فقیر چراغ الدین کو اس کے بیٹے نے ارسال کیے تھے واپس کر دیئے جائیں تو اس کے بیٹے کو فی الفور رہا کیا جا سکتا ہے۔ فقیر الدین اس پر آمادہ نہ تھا کہ وہ نواب کے غبن شدہ مال کو واپس کرے لیکن اس ساتھ ساتھ وہ اپنے بیٹے کی رہائی کا بھی متمنی تھا۔ لہٰذا وہ گفت و شنید کے لیے آدم واہن پہنچا جہاں پر اس نے تقریباً گیارہ ہزار روپے کے قیمتی جواہرات پیش کیے اور اس طرح اس کے بیٹے کی رہائی عمل میں آئی بعد ازاں نواب فتح خان نے فقیر چراغ الدین کے لیے خلعت بھی روانہ کی لیکن اس وقت تک وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر لاہور کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ تاریخ مراد سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب فتح خان کے دور میں نظم و نسق کی حالت اچھی نہ تھی۔ داؤد پوتروں کی سورش انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ پہلے تو انہوں نے فقیر سراج الدین کو عہدہ وزارت سے علیحدہ کرایا اور پھر اسے قتل کر دیا۔ اب اس کی جگہ احمد خان مدار المہام مقرر ہوا تو داؤد پوترے اس کے بھی مخالف ہو گئے (۲۵)۔ اسی دوران سرکاری خزانے کی حالت بھی ابتر تھی۔ سپاہیوں کو جب مسلسل پانچ ماہ تک تنخواہیں نہ ملیں تو انہوں نے تنگ آکر کپتان جان ہول کو یرغمال

بنالیا اور اپنے سابقہ واجبات کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ تاریخ مراد کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب فتح خان کو کتوں اور ریچھوں کی لڑائی کرانے اور اس قسم کے دیگر مشاغل سے زیادہ شوقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جملہ نظم ونسق وزیر اعظم اور دیگر اہلکاران کے سپرد رہا جس کی بناء پر اس کے دور میں معاملات ریاست کی حالت دگرگوں رہی۔

ہندوستان کے تمام والیان ریاست انگریزوں کی بالادستی کی وجہ سے ان کے ہمیشہ فرمانبردار رہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے انگریز استعمار کے قیام و استحکام میں ان سے ہر ممکن تعاون کیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب حریت پسندوں کے مقابلہ میں ان سے امداد طلب کی گئی تو اپنے ہی ہم وطنوں کو کچلنے کے لیے ہندوستانی ریاستوں کی افواج نے جوق در جوق حصہ لیا۔ ریاست بہاول پور سے پانچ سو سواروں کی امداد کے لیے تار بھیجا گیا۔ جس پر ریاست نے اڑھائی سو سوار اور دو توپیں روانہ کیں۔ جب ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی تسخیر ہوا تو اس فتح کی خوشی میں بہاولپور اور احمد پور شرقیہ میں سرکاری طور پر چراغ بندی کی گئی اور توپیں داغی گئیں۔ یہ تمام واقعات تاریخ مراد کا حصہ ہیں (۲۶)۔ نواب فتح خان تین اکتوبر ۱۸۵۸ء کو فوت ہوا۔ اس کی موت کا سبب ایک غریب ماشکی بنا جو تھک کر محل کے باغیچہ میں سویا ہوا تھا۔ اتفاق سے نواب مذکورہ اپنے حرم کے ساتھ سیر کرتے ہوئے اس کونے میں جا پہنچا۔ ماشکی ڈر کر۔ وہاں سے بھاگا جس پر نواب نے اسے پٹوا پٹوا کر مرواڈالا۔ لیکن اس غریب کی موت خود نواب کی قضا ثابت ہوئی۔ نواب کے دل پر خود اپنے اس ظالمانہ فعل کا اس قدر اثر ثابت ہوا کہ وہ بخار میں مبتلا ہو گیا اور ہذیان میں ماشکی آتا ہے، ماشکی آتا ہے کے الفاظ پکارتے پکارتے جان دے دی۔

نواب فتح خان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا رحیم یار خان، نواب محمد بہاول خان رابع کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اگر اس نواب کو بہاول پور کی تاریخ میں قاتل نواب کے نام سے موسوم کیا جائے تو بے

جانہ ہو گا۔ اس دور کا سب سے خون آشام واقعہ وزیر خان ملے زئی سے اس کی چپقلش سے متعلق تھا۔ تاریخ مراد کے مطابق طرفین کے آدمیوں میں ڈیرہ نواب کے مقام پر زبردست لڑائی ہوئی جس میں نواب کی فوج کے بائیس افراد اور وزیر اور اس بھائیوں سمیت اٹھارہ آدمی ہلاک ہوئے۔ کئی روز تک وزیر احمد خان اور اس کے دو بھائیوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی رہیں۔ آخر انہیں گھسیٹتے ہوئے ڈیرہ نواب صاحب کے مغربی جانب ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی گئی۔ یہ مقام بعد ازاں قبرستان شہیداں کے نام سے معنون ہوا۔ خود گورنر پنجاب کی طرف سے اس واقعہ پر باز پرس کی گئی اور شدید ناگواری کا اظہار کیا گیا۔ چیف سیکریٹری کی ہدایت پر مقتول وزیر کے اہل خانہ کے انتیس باقی ماندہ افراد کی رہائی عمل میں آئی اور انہیں ریاست سے ڈیرہ اسماعیل خان کے لیے روانہ کیا گیا۔ نواب کا ظلم و تعدی اس حد تک بڑھا کہ پہلے تو اس نے اپنے تین بچاؤں کو قلعہ ڈیراور کے اندر قید کر دیا اور بعد ازاں انہیں موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اور انگریز حکام کی باز پرس سے بچنے کے لیے ایک ہزار مہر طلائی ان تک پہنچائیں (۲۷)۔ ان شہداء کے مقبرے قلعہ ڈیراور کی جنوبی فصیل کے اندرونی طرف موجود ہیں۔ نواب بہاول خان رابع کی خونریزی اور سختی کی وجہ سے داؤد پوترے مسلسل سورش کرتے رہے اور ان کی یہ سورش نواب کے اپنے چچاؤں اور دیگر رشتہ داروں کے قتل کے بعد ہنگامہ آرائی پر منتج ہوئی جس کے اثرات اس کی موت کے بعد تک قائم رہے۔ اس کے دور میں غلام محمد چاکی ۲۷ ستمبر ۱۸۶۵ء میں مدار المہام مقرر ہوا۔ تاریخ مراد کے مطابق نواب بہاول خان رابع کو شیروں کے شکار کا شوق تھا اور اس زمانہ میں ریاست کے اندر شیروں کا شکار بھی مل جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۶۴ء میں نواب مذکورہ نے شہر بہاول پور کے قریب سمہ سٹہ اور پھر شہر فرید میں شیروں کا شکار کیا جس کی تاریخ مورخین نے خدیو شیر انگن نکالی۔" (۲۸)

۲۵ مارچ ۱۸۶۶ء کو نواب محمد بہاول خان رابع کا انتقال ہوا۔ تاریخ مراد اس کے بعد واقعات پر خاموش ہے حالانکہ مراد شاہ اس کے بعد نواب صادق چہارم (۱۸۶۶، ۱۸۹۹۲ء) کی عدم بلوغت کے باعث ریاست تاریخ ریاست بہاول پور کی ابتدائی اردو کتب کا جائزہ بہاول پور میں قائم ہونے والی انگریز ریجنسی کے زیر انتظام چلنے والی عبوری حکومت میں بطور نیٹو ایجنٹ اور بعد ازاں نئی قائم شدہ صدر عدالت کا چیف جسٹس رہا۔ تاریخ مراد ریاست بہاول پور پر ایک مستند ماخذ ہونے کے ناطے سے آج بھی مصنفین و محققین کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ یاد رہے کہ مولوی دین محمد نے ریاست بہاول پور کا گزیٹر ۱۹۰۴ء مرتب کرتے ہوئے مراد شاہ کے اکلوتے لڑکے حسن بخش گردیزی سے تاریخ مراد حاصل کی تھی اور اس سے استفادہ کیا تھا۔(۲۹)

تاریخ مراد (جلد پنجم):

تاریخ مراد کو ریاست بہاول پور کی ایک مستند انتظامی تاریخ کہا جائے تو یہ بات بے جا نہ ہو گی کیونکہ انہوں نے اپنی تاریخ میں ریاست بہاول پور کے تمام محکمہ جات اور ترقیاتی کاموں کا ذکر کیا ہے۔ جن کی تنظیم نو ۱۸۶۶ء کے بعد انگریزی سرپرستی میں کی گئی۔ اس تاریخ کا آغاز نواب صادق محمد خان رابع کی مسند نشینی سے ہوتا ہے۔ مراد شاہ کی اپنی تحریر کے مطابق:

بروز دوشنبہ ماہ ذیقعد ۱۲۸۲ ہجری بمطابق ۱۷ مارچ ۱۸۶۶ء میں صاحبزادہ محمد صادق خان صاحب صغیر سن کو جن کی عمر چار سال سات ماہ چار یوم تھی۔ مسند نشین ریاست کر کے ملقب بہ نواب محمد صادق خان کر کے حسب دستور نواب صاحبان مرحومین کی ضلع تہائے معمولہ ہر ایک کو دربار سے عطا ہوئی۔" (۳۰)

اس تاریخی دستاویز میں انگریزوں کے ساتھ تعلقات کا بارہا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً نواب صادق محمد رابع کی کمسنی کی وجہ سے اس کے قریبی عزیز صاحبزادہ جعفر خان نے بغاوت کر دی اور اس بغاوت کو خود

انگریزوں کی مدد سے سرکار انگریزی کے نیٹو ایجنٹ سید مراد شاہ گردیزی نے فرو کیا۔ تاریخ مذکورہ سے دربار بہاول پور میں منعقد ہونے والی متعدد رسوم کا بھی پتہ چلتا ہے ایک ایسی رسم غسل شفاء کے نام سے ہے جس کا ذکر مراد شاہ نے اس انداز سے کیا ہے:

" بروز شنبہ نواب صاحب عارضہ جدری سے شفایاب ہو کر غسل شفا فرمایا۔ خیرات وغیرہ حسب معمول اور دائی بختاں کو زیور پانصد روپیہ و پارچات خلعت عطا ہوئی۔" (۳۱)

کمسن نواب کی بلوغت تک خود نواب کی والدہ کی درخواست پر ریاست میں پولیٹکل ایجنٹ کی سرکردگی میں عبوری حکومت قائم کی گئی۔ اس کا ذکر اس انداز میں کیا گیا:

" ۶ راگست ۱۸۶۶ء میں خریطہ منقولہ ذیل بابت مداخلت پیش گاہ حضور نواب لیفٹینٹ گورنر سے وارد ہوا اور جناب کمشنر صاحب خریطہ موصوفہ تحویل اہالیان دربار فرمایا اور اہالیان دربار نے شلق اتو اپ کرائی۔" (۳۲)

اس کے بعد یہ حکم جاری ہوا:

"ناب نواب مستطاب معلیٰ القاب وائسرائے گورنر جنرل بہادر کشور ہند نے مداخلت سرکار انگریزی انتظام امورات ریاست بہاول پور میں۔ اور کرنا انتظام امورات کا بذریعہ ایک صاحب عہدہ دار انگریزی تاسن ان مشفق منظور فرمایا ہے جو انتظام کیا جاوے گا۔ بنام آن مشفق اور آپ کی فائدہ کے واسطہ کیا جاوے گا سب لوگوں کے واجب حقوق اور دعوؤں کا لحاظ کیا جاوے گا جہاں تک ممکن ہو گا۔ قدیم متوسل ریاست جو نمک حلال اور مطیع رہے گی بدستور ملازم رکھے جاویں گے درنہ حتی الامکان سب لوگوں کی حقوق ری کے بارے میں حکم مناسب دیا جاوے گا جہاں تک ممکن ہو گا۔ اہلکاران اور سپاہیان ریاست بدستور نوکر رہیں گے۔ اور ان کی مواجب قاعدہ کی ساتھہ برابر ملتی رہے گی۔ ریاست کی آمدنی کا قاعدہ کے ساتھ ٹھیک حساب رکھا جاوے گا اور جس وقت انمشفق عمر

اٹھارہ سال کی ہو گی کل انتظام ریاست ان مشفق کے سپرد کیا جاوے گا۔ چنانچہ ولیم فورڈ صاحب کمشنر ملتان پولیٹکل ایجنٹ یا سپرنٹنڈنٹ ریاست بہاول پور مقرر ہوئے ہیں۔ صاحب ممدوح انتظام امورات ریاست باحسن وجوہ فرمادے گی اور جو خرچ اوس انتظام میں ہو گا۔ وہ ریاست سے ہو گا' (۳۳)

ریاست کے انتظامی معاملات میں پولیٹیکل ایجنٹ کی سی منچین کو بڑا عمل دخل حاصل رہا۔ ان کے بطور پولیٹیکل ایجنٹ تعیناتی کے بارے میں سید مراد شاہ تحریر کرتے ہیں:۔

۲ نومبر ۱۸۶۶ء میں جناب مسٹر ولیم فورڈ صاحب تشریف فرما ملتان ہوئے اور بجائے جناب علی القاب کی کی نچن صاحب اسٹنٹ کمشنر درجہ اول ضلع ڈیرہ غازی خان سپرنٹنڈنٹ ریاست بہاول پور مقرر ہوئے۔ (۳۴)

تاریخ مراد کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس دور میں یہ تاریخ لکھی گئی دربار بہاول پور عملی طور پر نواب کی والدہ کی نگرانی میں تھا اور اس میں عورتوں کا بڑا عمل دخل تھا۔ مثلاً خود نواب صاحب کی والدہ نے متعدد خواتین کو اہاکاران ریاست اور حکام سے پیغام رسانی کے لیے متعین کیا ہوا تھا۔ جس کا ذکر مراد شاہ نے اس طرح سے کیا ہے:۔

مسمات مائی شریف خاتون باشندہ اللہ آباد بیوہ کی اللہ جوایا، میر دہہ جو اتفاق سے جناب مائی صاحبہ والدہ نواب صاحب کو تعلیم قرآن کیا کرتی تھی۔ مائی صاحبہ والدہ نواب صاحب نے اوسکو متعین کاروبار ڈیوڈھی و پیغام وہی کاروبار مامورہ مشیران سرفراز فرمایا۔ (۳۵) ریاست بہاول پور میں ایجنسی کے قیام کے بعد تعمیر وترقی کے جو کام ہوئے ان میں خصوصیت سے نہروں کی تعمیر شامل ہے جس کی وجہ سے بعد میں ریاست بہاول پور نہ صرف آباد کاروں کا گھر بن گئی بلکہ اس کی زرعی معیشت بھی بہت ترقی کر گئی۔ اس دور میں تعمیر ہونے والی تمام چھوٹی بڑی نہروں کی تعمیر کا ذکر اس میں کیا گیا۔

نواب صادق محمد خان رابع (۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۵ء) وہ پہلا نواب ہے جسے باقاعدہ طور پر انگریزی تعلیم دلوائی گئی۔ اس کے لیے ایک اتالیق مقرر کیا گیا جس کا ذکر تاریخ مراد میں درج ہے۔ اس کے بعد ان کی انگریزی تعلیم کے لیے مسٹر کلارک اور اردو کی تعلیم کے لیے مولوی فرزند علی کا ذکر بھی موجود ہے:

جولائی ۱۸۷۱ء میں مسٹر کلارک صاحب بہادر اتالیق جناب نواب صاحب بہادر مقرر اور تعلیم نواب صاحب ان کی زیر نگرانی میں ہوئی۔(۳۶)

۱۸۶۸ء میں پنڈت جے نرائن صاحب اتالیق مقرر ہوئے اور سبق انگریزی شروع ہوا۔(۳۷)

اگرچہ تاریخ مراد ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۵ء کے حالات و واقعات پر اردو زبان کی ریاست بہاول پور کی پہلی مستند تاریخ ہے۔ اردو طرز تحریر میں زیادہ تر الفاظ فارسی کے بھی شامل ہیں۔ مزید بر آں تحریر میں کئی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ بعض جگہوں پر بعض الفاظ اور اصلاحات پر سرائیکی کا رنگ غالب ہے۔ جس کا اندازہ کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ مثلاً ڈیوڑھی لکھا گیا ہے۔ اس طرح انتظامی اور پولیس کے افسران کو بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ بعض اوقات وہ ان اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے تھے۔ مثلاً علی گوہر خاں مشیر ریاست نے اپنے ایک ذاتی ملازم کے قتل کے شعبہ میں ایک خاتون حیاتاں اور تین آدمیوں پیرا ہونا اور مصری پر بے جا تشدد کیا۔ اور ان پر قتل کا مقدمہ بنا کر انہیں صدر عدالت میں پیش کیا۔ مگر اس دوران کا لونڈ کور جو روپوش ہو گیا تھا، زندہ پایا گیا۔ اس پر پولیٹیکل ایجنٹ نے علی گوہر خاں اور دیگر افراد کے خلاف سخت اقدام کرتے ہوئے انہیں برطرف کر دیا اور انہیں قید کی سزا دی۔ اس کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے:

اور مسمیان مذکورین بحضور صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بہادر ملتجی ہوئے اور پیش گاہ صاحب ممدوح سے نفاذ حکم بنام صدر عدالت کے تحقیق مقدمہ صادر اور تحقیق سے علی گوہر خان، کالا خان، منصف

علی شاہ، رمضان خان ، مسلم ، بہادر خان، ہاشم خان، عبد الرحمن، اللہ بخش خان، محمد بخش، جائن، غلامون، ملزم ثابت اور بپاداش اس جرم کی علی گوہر خان جرمانہ قید ۴ سال۔ منصف علی شاہ جرمانہ قید دو سال کالا خان قید ۶ ماہ جرمانہ ۲۵ روپے۔ رمضان خان قید ایک سال جرمانہ ۵۰ روپے۔ مسلم قید دو سال جرمانہ ۵۰ روپے۔ بہادر خان قید ایک سال جرمانہ ۲۵ روپے۔ ہاشم خان قید ایک سال جرمانہ ۲۵ روپے۔ عبد الرحمن قید ایک سال جرمانہ ۲۵ روپے۔ اللہ بخش قید ایک سال جرمانہ ۲۵ روپے محمد بخش قید ۳۴ ماہ جرمانہ ۲۵ روپے۔ جائن قید ایک سال جرمانہ ۲۰ روپے۔ غلامون قید ایک سال جرمانہ ۲۰ روپے کی سزایاب ہوئی۔(۳۸)

سید مراد شاہ گردیزی نے تاریخ مراد میں مختلف محکموں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ڈاک کے محلے کا بھی بالخصوص ذکر کیا ہے کہ ڈاک کی ترسیل کا نظام کیا تھا۔ اس کا ذکر پوسٹ ماسٹر ماتا کی چھٹی کا اردو ترجمہ اس طرح کر دیا گیا:

"یکم اکتوبر سے از بہاول پور تا کوٹ سبزل ڈاک سرکاری جاری ہو گا اور تمام ریاست میں مشتہر کرا یا جائے کہ یہ سب کو واضح ہو جائے کہ بہاول پور سے فاضل کا تک بھی۔ اس طرح عملدرآمد ہو گا جیسا اب ہے ڈپٹی پوسٹ ماسٹر بہاول پور پختہ بندوبست کروائے گا جس قدر چوکیات مطلوب ہیں لیکن جو اوقات مقرر ہیں۔ سب تحصیلداران کو اطلاع دیں کہ جس وقت ڈاک آئے اس کو فوراً لے لیں اور دوسری ڈاک دے دیں اور ہم نے درخواست کیا کہ پوسٹ آفس اس جگہ مقرر ہو جائے۔" (۳۹)

تاریخ مرادنواب صادق محمد خان رابع کی ذاتی زندگی پر بھی خاص معلومات بہم پہنچاتی ہے خصوصاً اس کی سیر و تفریح اور ریاست کے دوروں کا کئی مقامات پر ذکر ہے

"بدین مرادنواب صاحب اپنے علاقہ ریاست میں واقف ہوں اور حال رعایا کو بخوبی ملاحظہ فرمادیں۔ واسطی تکمیل اس منشاء کی نواب صاحب کو اکثر اوقات ماہ جون، ماہ جولائی، اگست اور اکتوبر مقامات

سمہ سٹہ و خیر پور منگریجہ و اوچ و کوٹ سبزل سیر فرمائی اور اب موسم سرما دورہ کل علاقہ ریاست میں بطریق سیر و تماشا بلکہ اکثر قصبات کلان مشہور و معروف مین دربار کر کے صرف فرمادیں گے۔ (۴۰)

اسی نواب کے دور میں تعلیم کے میدان میں خاصی ترقی ہوئی۔ درج ہے کہ صیغہ تعلیم میں جواب زیر اہتمام مسٹر کلارک صاحب ہی بہتر ہے اور اجراء مدرسہ تعلیم المعلمین جو حال میں مقرر ہوا، اور طریقہ تعلیم میں جو فی الحال مدرسہ دیہاتی میں جارہے ہیں، عنقریب ترقی ہو گی ۔ (۴۱)
تاریخ مراد میں ریاست کی آمدنی وخرچ کے بھی گوشوارے موجود ہیں۔ خصوصا سالانہ بجٹ کو تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن اعدو شمار فارسی میں دیئے گئے ہیں۔
تاریخ مراد ریاست بہاول پور اور اس کی ہمسایہ ریاستوں کے مابین خارجہ تعلقات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اس موقعہ پر دوریاستوں کے مابین جو رسوم ادا ہوتی تھیں۔ ان کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ ایک ایسی ہی ملاقات مہاراجہ پٹیالہ اور نواب بہاول پور کے مابین ہوئی:
۲۴ تاریخ کو چار مصاحبان منجانب مہاراجہ صاحب بہادر والی پٹیالہ موافق معمول کی واسطہ پہونچانی نواب صاحب کی آئی اور خود نواب صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بہادر و آٹھ مصاحبان کے بوقت دس بجے دیکھنے تشریف لے گئے۔"(۴۲)
تاریخ مراد میں عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے بارے میں لکھا گیا ہے:
" ۱۸۷۰ء میں ایک انتظام جدید کا کرنا ریاست میں ملحوظ ہوا کہ حاکمان مال و منتظم نالجات کو کام جوڈیشنل سے فراغت دی جائے اور محکمہ جوڈیشنل کا علیحدہ کیا جائے تاکہ دونوں کام کمال درستی سے انجام پذیر ہوہیں۔ چنانچہ ایک محکمہ صدر عدالت کا تین جوں کی تقرری سے بنایا گیا اور اس میں سید مراد شاہ کو جج اول قرار دیا گیا اور اس نے ایسی ہوشیاری سے یہ کام انجام دیا کہ انسداد جرائم فوجداری

اور تحقیقات حقوق دیوانی میں بہت اچھے اچھے نتیجے نکلے اور اس انتظام سے کچھ بڑا بھاری خرچ بھی ریاست پر نہ پڑا اور سال بسال وقوع جرائم سنگین میں کئی ہونے لگی جیسا کہ رپورٹ ہائے سالانہ سے تصدیق اس امر کی ہو گئی ہے۔(۴۳)

صادق التواریخ:

صادق التواریخ ریاست بہاول پور کی تاریخ پر اردو زبان میں تحریر شدہ پہلی کتاب ہے جسے باقاعدہ طور پر بہاول پور کے سرکاری مطبع صادق الانوار سے شائع کیا گیا۔ اس سے پیشتر اردو ہی میں ریاست بہاول پور کی صدر عدالت کے پہلے چیف جج مراد شاہ نے تاریخ مراد کے نام سے ایک قلمی مخطوطہ چھوڑا ہے جس کی زبان انتہائی مبہم ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مراد شاہ اردو دان نہ تھا جبکہ تاریخ مراد کے مقابلے میں صادق التواریخ کی زبان انتہائی شستہ اور آسان فہم ہے اور کیوں نہ ہو کہ اس کے مؤلفین صادق ایجرٹن کالج کے دو فاضل پروفیسر مرزا محمد اشرف گورکانی دہلوی اور مولوی محمد دین ہیں۔(۴۴)

یہ کتاب دو سو چوالیس صفحات پر مشتمل ہے اس کے آخری صفحہ کی آخری سطر پر کاتب کا نام سید محمد ہاشم اور تاریخ اشاعت ۱۵ نومبر ۱۸۹۹ء درج ہے۔(۴۵)

تین صفحات پر مشتمل دیباچہ میں مصنفین نے تاریخ نگاری کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ دیباچہ کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ تمام کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ حصہ اول صفحہ ایک تا صفحہ ایک سو ایک پر محیط ہے جس میں بنو عباس کی تاریخ سقوط بغداد تک رقم ہے۔ اس حصہ کی تحریر کا مقصد غالباً نوابین بہاول پور کے عباسی نژاد ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

کتاب کا حصہ دوم سندھ میں داؤد پوترہ خاندان کی آبادی، افزائش اور عروج سے لے کر ان کی علاقہ چوہدری میں آمد اور پھر ریاست بہاول پور کے ارتقاء یعنی نواب صادق محمد خان اول ۱۷۲۷ تا نواب

بہاول خان رابع کی وفات ۲۵ مارچ ۱۸۶۶ء تک کے حالات اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں یہ کتب نواب مذکورہ کے حکم پر اس کے دور میں مرتب ہوئی لیکن اس کی اشاعت نواب مذکورہ کی وفات ۱۴ فروری ۱۸۹۹ء میں نو ماہ بعد ۱۵ نومبر ۱۸۹۹ء کو ممکن ہو سکی(۴۶)۔ یوں تو صادق التواریخ کے مؤلفین نے اسے مرتب کرنے کے لیے اپنے دور کے تمام ماخذات سے استفادہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس کتاب کے حصہ دوم کو تحریر کرتے ہوئے جن اہم کتب کے حوالے دیئے گئے ہیں ان میں مولوی شہامت علی کی انگریزی کتاب ہسٹری آف بہاول پور کا کوئی ذکر نہیں جو ۱۸۴۸ء میں صادق التواریخ سے کم و بیش اکاون (۵۱) برس پہلے لندن سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا حوالہ نہ دے کر مؤرخین سے ایک علمی کوتاہی ہوئی جو ہر درباری مؤرخ سے ہوتی ہے۔ یہ بات ممکن ہیں کہ ایجرٹن کالج کے ان فاضل پروفیسر صاحبان کے مطالعہ سے شہامت علی کی کتاب نہ گزری ہو جبکہ وہ تاریخ اور انگریزی کے مضامین سے وابستہ تھے۔ لیکن محض اس لیے کہ اس کتاب میں بہاول پور کے داؤد پوترہ امیر ان کے جد امجد کی عباسیت سے اختلاف کیا گیا(۴۷)۔ اس لیے مؤرخین نے سرے سے اس کا تذکرہ کرنا بھی گناہ سمجھا۔ یا شاید اس لیے کہ اس دور کوئی اختلافی بات لکھنا ناممکن تھا۔ غالباً اس لیے بھی کہ اگر اس کتاب سے استفادہ کیا جاتا تو پھر ان کی اس تصنیف کا سبب تالیف بے وقعت ہو جاتا جس کے تحریری ثبوت کی فراہمی کے لیے انہیں تاریخ خانمائے بنو عباس پر مشتمل اپنی کتاب میں ایک سو ایک صفحات تحریر کرنے پڑے۔

صادق التواریخ کے حصہ دوم کے آغاز سے پہلے صفحہ نمبر ۱۰۲ پر اس کی سن اشاعت کی مناسبت سے فارسی زبان کا وہ قطعہ تاریخ درج ہے جسے مولانا عزیز الدین نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے وقت وہ صادق الاخبار کے ایڈیٹر اور صادق الانوار پریس کے قائم مقام سپرنٹنڈنٹ تھے۔ جبکہ اصل ناظم عطا اللہ تھے جن کا نام صفحہ نمبر دو پر تحریر ہے۔ مولانا عزیز الدین نواب صادق

چہارم (۱۸۶۶ء تا ۱۸۹۹ء) کے دور میں شاہی خطاط اور خوش نویس تھے جنہیں نواب صاحب نے نیا قوت قلم' کے خطاب سے نوازا تھا۔ (۴۸) ریاست کی تمام بڑی مساجد بشمول صادق گڑھ پیلس، جامع مسجد احمد پور شرقیہ، جامع مسجد دولت خانہ اور محلات شاہی میں خطاطی و نقاشی کے جو نمونے ملتے ہیں وہ سب انہی کے ہاتھ سے مزین ہوئے۔ خطاط ہونے کے علاوہ وہ تاریخ گو، اعلیٰ پائے کے مترجم و مصنف اور حمد و نعت گو شاعر تھے۔ ان کی متعدد تصنیفات حکمی صورت میں خطاطی کے اعلیٰ نمونے کی یادگار کے طور پر شاہی لائبریری کی زینت بنیں۔ ریاست کی تمام بڑی مساجد کی تعمیر کا مادہ تاریخ انہی کا نکالا ہوا ہے۔ جب مولانا حالی نے نور محل کی تعمیر پر مادہ تاریخ نکال کر نواب صاحب کو بھجوایا تو مولانا عزیز الدین کے مشورے پر اسے تحریر نہ کیا گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے غلطی سے نور کل کی بجائے شیش محل کی مناسبت سے مادہ تاریخ نکالا جسے فنی نقص کی بنا پر قبول نہ کیا جا گا۔ (۴۹)

صادق التواریخ کے صفحہ ایک سو اٹھائیس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس خاندان کے جد امجد جس نے مسرت براستہ بلوچستان، سندھ ہجرت کی وہ عربی النسل امیر سلطان احمد ثانی تھا۔ اس نے سندھ کے علاقے کوٹ کانجی کو اپنا ابتدائی مسکن بنایا۔ اس جگہ کے حکمران رائے دھورنگ نے ابتداسلطان احمد ثانی سے مخاصمت روا رکھی لیکن بعد ازاں اس کی جنگجویانہ طاقت سے مرعوب ہو کر نہ صرف اپنی سلطنت کا ایک تہائی حصہ اس کو دے دیا بلکہ اپنی بیٹی کا رشتہ بھی سلطان سے طے کر دیا۔ اس مختلف النوع اور بین المذہبی اختلاط سے جو لڑکا پیدا ہوا اس کا نام قاہر خان رکھا گیا۔ اور یوں ان عرب نژاد عباسیوں کے ہندو خاندان سے ازدواجی تعلقات کا نتیجہ سندھی ناموں کی شکل میں سامنے آیا۔

امیر سلطان احمد ثانی کی نسل میں چوتھی پشت پر امیر بھاء اللہ المعروف بھلاخان" ہے۔ جس کے نام کی ارج مطابقت پر غالبا داؤد پوترہ امیر ان بہاول خان اول سے بہاول خان خامس تک کے نام رکھے

گئے۔ صادق التواریخ کے مطابق سندھ کے اولین عباسی نژاد سرداروں میں امیر چینی خان کا نام زیادہ مشہور ہے۔ جسے مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے فرزند شہزادہ مراد کی ملتان آمد کے موقع پر پنج ہزاری کا منصب عطا ہوا اور ساتھ ہی اسے اوبادرہ سے لاہوری بندر تک کے محلات کی مالگزاری وصول کرنے کا اختیار بھی شہزادہ کی طرف سے تفویض ہوا۔ امیر محمد مہدی کی اولاد سے یہ خاندان دو شاخوں یعنی خاندان کلہوڑو اور خاندان داؤد پوترہ میں منقسم ہوتا ہے۔(۵۰) صادق التواریخ کے صفحہ نمبر ایک سو انچاس کے مطابق اگرچہ صادق محمد خان اول کو ریاست بہاول پور کا اولین والا نواب نواب لکھا گیا ہے لیکن تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نواب محمد بہاول خاں ثانی کی جس کے دور میں ریاست بی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ کیونکہ اسی نواب کو خاشہنشاہ شاہ عالم ثانی نے دربار دہلی سے خطاب نصرت جنگ حافظ الملک فرمایا بلکہ کائیل کئے شاہ محمود کی اجازت سے دار السرور بہاول پور سے سکے کا اجراء بھی عمل میں آیا۔ اس طرح خارجہ امور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مسٹر انسٹن کی آمد پر خیر سگالی کے جذبات کا اظہار ہوا۔

نواب صادق محمد خان ثانی (۱۸۰۹ تا ۱۸۲۵ء) کے دور سے شاہی خاندان کے قریبی رشتہ داروں خصوصاً بھائیوں، بھتیجوں اور چچاؤں کو قتل کرنے کا آغاز ہوا۔ ساتھ ہی وزراء اور مشیران کو بھی یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتارا جانے لگا اس قبیح رسم کا آغاز نواب صادق ثانی نے کیا جسے قاتل نواب کی حیثیت سے یاد کیا جانے لگا۔ صادق التواریخ کے مطابق اپنے خلاف سازشی ہونے پر اس نے اپنے تین حقیقی بھائیوں اور دو بھتیجوں کو قتل کرا دیا (۵۱)۔ ان بھائیوں میں سے ایک بھائی مبارک خان اس سے بڑا تھا اور جسے اس کے والد نواب محمد بہاول خان ثالث نے محض غلط فہمی کی بناء پر نظر بند کر رکھا تھا۔(۵۲)

صادق التواریخ کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست بہاول پور کے درمیان تعلقات پر ایک مستند دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں دونوں حکومتوں کے مابین طے پانے والے ۱۸۳۳ء اور ۱۸۳۸ء کے دو بڑے معاہدہ جات شامل ہیں۔ جو نواب بہاول خان ثالث (۱۸۲۵ء تا ۱۸۵۲ء) کے دور میں طے پائے۔ ان میں سے ۱۸۳۳ء کا معاہدہ سولہ دفعات پر مشتمل ہے جو کہ باہم دوستی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اس معاہدہ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ریاست کو خود مختاری کی بھرپور انداز میں ضمانت فراہم کی گئی ہے۔ اسی معاہدہ کی آخری گیارہ دفعات تجارتی نوعیت کی ہیں جس میں ریاست کو اپنی حدود میں دریائے ستلج سے گزرنے والے کمپنی کے سامان انبارت پر مفصول عائد کرنے اور دو مقامات پر تلاشی لینے کی اجازت حاصل تھی۔ اسی معاہدہ پر گورنر جنرل ڈریڈنگ کے دستخط ثبت ہیں۔(۵۳)

ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ریاست سے دوسرا معاہدہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۳۸ کو کیا گیا۔ جسے اگر "زبردستی کا معاہدہ" یا "جبری حکم نامہ قرار دیا جائے تو بے جانہ ہو گا۔ کیونکہ اس معاہدہ کے تحت امیر ان بہاول پور کو ہمیشہ کے لیے کمپنی کا تابع فرمان اور حکم بردار بنا دیا گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے نہ صرف کمپنی کو ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی بلکہ ریاست کو اپنے خان بہ امور میں یا امینی کی منظوری کے کسی دوسری ریاست سے تعلقات استوار کرنے پر پابندی ماند کر دی گئی۔ میں... وبد ہے جس کے تے تے ۱۸۶۶ء میں انگریزوں نے نواب صادق چہارم کی عدم بلوغت تے فائدہ نے اُٹھاتے ہوئے ریاست کی کلی زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ عاہدہ سات دفعات پر محیط ہے جس کی توثیق گورنر جنرل آکلینڈ کی (۵۴) ۔خوش قسمتی سے کتاب کے مصنفین نے یہ دونوں معاہدات اپنے اصل فالری متن فارسی سے اردو ترجمہ کر سکے تو کیے ہیں وگرنہ باقی تمام اہم درست ومیزات اور خیر ، کفایت فارسی میں قلم بند ہے، جو غیر فارسی دان متقین کے لیے مشکل کم باعث ہے۔ مثلاً کتاب

مذکوراہ میں، رج تیمور شاہ کیا نواب بہاول خان ثانی کو تر میگر وخط کی۔ فارسی متن میں شامل کیا گیا ہے۔ اس نواب فی طرف سے امیر ان سندھ وراجہ جیسا میر کو لکھے جانے والے خریطہ جات بھی فارسی میں، ایسے ہوئے ہیں۔ نواب مذکورہ کا ایک اور خط از مر افعیہ خنان کور تیج کے نام سے بھی فارسی میں ہے۔ پھر؟ نواب بہاول خان عمارت کا فارسی زبان میں اپنے از میر یعقوب خان کے نام مخ ملط ہے جس میں ات بڑے مال یہ انکو فلسفیانہ انداز میں انتظام سلامت سے نہیں رکھنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ میں نہیں جبکہ ایسٹ انڈیا ان کے طریقوں سے تری شدہ تمام خط وکتابت بھی فارسی میں، جوں کی توں لکھ دی گئی جس میں سر چاس نیپر اور جارت مرسل کار کانے دریچہ بات کی نقول شامل ہیں جن کے تحت نواب حمد بہاول خان ہات کو جنگ افغانستان ۱۸۳۸ء میں امداد دیتے پھر سابقہ جات جو تک بھارا اور منزل کو طے عطا کیے گئے (دہ)۔ نواب بہاول خان ثالث کا ایک شیر بظاہر فارن نہ بات میں ریذیڈنٹ لاہور کے نام سے بھی ملتا ہے جس میں میر اج کی ملتان میں بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بہاول پوری فوج و امداد کی روانگی کی اطلاع ہی گئی ہے۔ اس کا جواب ریذیڈنٹ لاہور کی جانب سے ۲۲ مئی ۱۸۴۸ء کو دیا گیا ہے جس میں ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ افواج اس مقصد کے لیے مامور کرنے کی درخواست کی گی ہے (۵۶) ۱۸۴۴ء میں گورنہ قلو نزل کی طرف سے ریاست کا علاقہ ونواں انگریزی علاقے کے ساتھ شامل کر دیا گیا جس پر نواب بہاول نفان ثالث نے اپنے کارای مر اسا۔ میں گورنر جنزل کے اس اقدام پر اظہار رضامندی کیا۔ علاوہ ازیں ۱۸۴۹ء کے گورنر جنزل کے کیا۔ فارسی خریطہ کے ڈر ایسے راکام۔ متان میں انگریزوں کی امداد کرنے پر ابطور انعام ایک لاکھ روپے پنشن کی ادائیگی کی اطلاع ہی گئی ہے۔

گورنر جنزل کی طرف سے پیر ابراہیم کے نام فارسی کے پہلے میں بہاول پور سے کوٹ سبزل تک سڑک کی تیاری کا حکم دیا گیا ہے۔ اس تمام فاری زردو کتابت اور دستاویزات سے البتہ ایک بات کا

ضرور انکشاف ہوتا ہے کہ دربار بہاول پور کی سرکاری زبان فارسی رای مزید یہ کہ امیر ان بہاول پور اور ان کے انشاء پرداز فارسی زبان دانی میں اپنے دور کی نابغہ روز گار تھے۔ صادق التواریخ سکھوں، درانیوں اور والیان سندھ کے علاوہ قریبی ہمسایہ ریاستوں سے تعلقات، آویزش و پر پقلش پر بھی سیر حاصل بحث کرتی ہے۔

مختصراً یہ کتاب ریاستی تاریخ نگاری پر اردو میں پہلا مطبوعہ ماخذ ہے جس کی وقعت کو مابعد کے تقریباً تمام مورنین نے تسلیم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ریاست بہاول پور کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہے۔ صادق التواریخ کی ترتیب اور انداز کو بعد ازاں مولوی عزیز الرحمن نے اپنایا اور من و عن انہی خطوط پر ۱۹۰۰ء میں صبح صادق تحریر کی۔(۵۷)

صبح صادق:

مولوی محمد عزیز الرحمن عزیز بہاول پوری کا شمار بہاول پور کے اول درجہ کے درباری مؤرخین کی صف میں سر فہرست ہے۔ صبح صادق اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی جو کہ اب لائبریریوں سے مفقود ہوتی جارہی ہے۔ یہ کتاب غالباً مصنف کی تصنیف اول ہے جو کہ دو سو چونتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ بہاول پور کی قدیم تواریخ کی طرز پر مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے اس کتاب کے عنوان کی وضاحت درج ذیل انداز میں کی ہے:

"وہ وجہ جس کی بنیاد پر ناچیز نے اس کتاب کا نام صبح صادق رکھا ہے یہ ہے کہ جس فرمانروا کے عہد حکومت کی تصویر ہم دکھانا چاہتے ہیں اس کو اس کی عزیز رعایا اس نام سے پکارتی تھی۔"(۵۸)

کتاب صبح صادق کے مقدمہ میں مصنف نے جو اہم چیز شامل کی ہے وہ ریاست بہاول پور کا جغرافیہ ہے۔ بہاول پور کے موضوع پر تحریر کی جانے والی اس سے پیشتر کی تصانیف کے برعکس یہ کتاب اس لحاظ سے بھی قابل وقعت ہے کہ اس میں ریاست کے جغرافیہ کے علاوہ اس کی آبادی، انتظامی

اکائیوں کی تفصیل، پیداوار اور قابل کاشت رقبہ دیہاتوں اور تھانوں تک کے اعداد و شمار گوشواروں کی صورت میں درج کیے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں اشیائے تجارت درآمدہ اور برآمدہ کی مکمل فہرست شامل کی گئی ہے، اس طرح ریاست کے اہم قلعہ جات اور دار حکومت کی تفصیل نیز ریاستی افراد کی بود و باش اور رہن سہن کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مزید برآں سرکاری عمارات اور شاہی مثلات خصوصاً نور محل اور صادق گڑھ پیلس جیسی شاہانہ تاریخی عمارات کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عام خوراک و پوشاک کے علاوہ ریاستی باشندوں کی تفریکی مشاغل کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے پھر ریاست کے باشندوں کے پیشوں اور صنعت و حرفت کے بارے میں خاصی معلومات ملتی ہیں۔ کتاب مذکورہ میں ریاست بہاول پور کے حکم ان خاندان کی قدیم تاریخ" کے عنوان سے چند صفحات مختص کیے گئے ہیں جس میں سابق امیر ان بہاول پور اور ان کے جد اجد عباسیوں اور سندھ میں داؤد پوتروں کی مختصر مگر جامع تاریخ قلم بند کی گئی ہے(۵۹)۔

باب اول نواب صادق محمد خان چہارم (۱۸٦٦ تا۱۸۹۹) کی ولادت، تعلیم و تربیت اور ازدواج کی تفصیل پر مبنی ہے۔ لیکن اس مصنف نے تاریخ اور سنین لکھنے میں غلطی کی ہے مثلاً مصنف لکھتا ہے کہ نواب محمد بہادول خان رابع کی شادی سن ۱۲۷٦ھ میں ہوئی اور نواب صادق محمد خان رابع کی پیدائش ۱۳۷۱ھ میں ہوئی یعنی اپنے والد کی شادی سے چار سال قبل ہی پیدا ہو گئے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صادق چہارم وہ پہلے نواب تھے جن کو فارسی اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی دلوائی اور اس مقصد کے لیے وہ انگریزوں مسنہ آر کا بارک اور مسٹر ز ور ان کو متعین کیا گیا۔ شہزادہ کو تعلیم دلانے کے لیے ملتانی دروازہ بہاول پور ے باہر ایک عمارت مختص کی گئی ہو اب تک پرانی کوٹھی کے نام سے معنون ہے۔(٦٠)

مصنف نے صبح صادق کے باب دوم کو "ایجنسی کا زمانہ" کے عنوان سے معنون کیا ہے۔ یہ عرصہ ۱۸۶۶ء سے ۱۸۷۸ء تک کا ہے۔ یاد رہے کہ جب ۱۸۶۶ء میں نواب بہاول خان رابع کی وفات ہوئی تو اس وقت ولی عہد نواب صادق محمد خان رابع کی عمر صرف چار سال، سات ماہ اور چار یوم کی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متفقہ صاحبزادہ جعفر خان نے جو شاہی خاندان کا قریبی فرد تھا تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر نواب کی والدہ نے کیا۔ فوری طور پر لیفٹینٹ گورنر پنجاب سے مداخلت کی درخواست کی جس پر برطانوی حکومت نے کمشنر ملتان میں و نیم نور (۱۸۶۶ تا ۱۸۶۷ء) کو ریاست بہاول پور کا پوبٹیہ کل ایجنٹ مقرر کر کے صورت حال کو کنٹرول کیا (۶۱)۔ نواب صادق چہارم کی بلوغت تک، ایجنسی کا عرصہ حکومت تقریباً تیرہ سالوں پر محیط ہے۔ اس دوران ریاست کا نظم و نسق ملا پولیٹیکل انتان ایجنٹ کی سربراہی میں قائم شدہ انگریز افسران پر مشتمل ایجنسی کے ہاتھ میں رہا اور وہی تمام سیاہ و سپید کے مالک رہے۔

مورخ مصنف نے برطانوی ایجنسی کے اس دور کے تمام نظم و نسق پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ یہ دور صیح معنوں میں تقر تعمیر و ترقی کا دور تھا اس دوران ریاست میں برطانوی طرز پر دفاتر کی تنظیم نو ہوئی اور ریاست بہاول پور انصاف تعلیم صحت اور تعمیرات، فوج کی تشکیل پریس جیل خانہ جات اور رسل در سائل کے لحاظت از منہ رفتہ سے جدید ترقی پذیر جنگ دور میں داخل ہوئی۔ ریاست میں پہلی بار ۱۸۷۰ء کے دوران مردم شماری کرائی گئی جس کے مطابق کل آبادی جدول ۱۰۹۱ ۲۰ ۷ ۴۰ نکلی۔ (۶۲)

کتاب صبح صادق کا باب سوئم نواب صادق محمد خان رابع کے دور کی بغاوتوں، اجلاس اور پولیٹکل وفات کارناموں کے عنوان پر محیط ہے۔ اس میں صاحبزادہ محمد جعفر خان عباسی جو نواب محمد بہاول خان ثالث کا بھائی تھا کے کیا۔ تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کا ذکر ہے جس نے نواب محمد بہاول خاں رابع

کی وفات کے فورا بعد نواب صادق محمد خاں رابع کی کمسنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تخت سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔(جعفر خان کو بعد ازاں مسٹر فورڈ کی ہدایت پر ملتان جلاوطن کیا گیا کیونکہ وہ داؤپوتر خاندان کی ایک نمایاں شخصیت تھی اس لیے ان کے طویل احتجاج کے بعد بہاول پور آکر بسنے کی اجازت مل گئی جہاں وہ فتح خان بازار میں مقیم ہوا لیکن جلد ہی نواب صادق رائع کے:واخواہوں نے موقع پاکر اسے زہر دے کر ہلاک کرڈالا۔ آج بھی قبرستان ملوک شاہ میں چھوٹی اینٹوں کی خستہ قبر پر سنگ مرمر کا ایک کتبہ "نواب جعفر خاں" کے نام کے ساتھ موجود ہے۔(۶۳)

اس باب میں نواب صادق رابع کے زمانے میں منعقد ہونے والی اہم شاہی تقاریب اور درباروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کے مطابق ایک اہم تقریب ۲۷ مارچ ۱۸۶٦ء کو ڈیرہ نواب صاحب کے نور سل میں منعقد ہوئی اور سید مراد شاہ نیٹو ایجنٹ ریاست بہاول پور نے کمسن نواب کو اس کے والد کی مسند پر بٹھایا۔ پھر جون ۱۹۶٦ کی مرفور نے دربار منعقد کر کے نواب صادق چہارم کو برطانوی حکومت کی طرف سے تحائف پیش کیے غالبا اس یادگار تقر:کے موقع پر نیٹو پولیٹیکل ایجنٹ مراد شاہ اور نواب کے قریبی عزیزوں کے علاوہ چند اراکین سلطنت بھی شامل ہیں۔(۶۴)

اس طرح ۲۸ نومبر ۱۸۷۹ء کو نوتعمیر شدہ نور محل بہاول پور میں نواب مذکورہ کے بالغ ہونے پر ریاست کے تمام اختیارت گورنر پنجاب سر رابرٹ ایجرٹن نے تفویض کیسے باب سوم میں ہی پولیٹیکل امدادوں کے نام سے نواب صادق چہارم کے دور میں ریاست کی طرف سے حکومت برطانیہ کو پیش کی جانے والی ان تمام امدادوں کا ذکر ہے جو مختلف اوقات میں حکومت برھا:یہ کو دی گئیں ان میں خاص طور پر جنگ افغانستان ۱۸۷۸ء میں افوان بہاول پور کی واد شیر فہرست ہے کتاب صبح سابق ۱۹۰۰، کا سب سے اہم باب، نواب صادق چہارم کے انتظام ریاست پر ریویو سے متعلق ہے۔ جس میں نواب صادق چہارم کے نظم مملکت پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ کسی بھی

نواب کے دور میں انتظامی امور سے متعلق ایک جامع تبرہ نہ تو اس سے ماقبل کی تحریر کردہ کسی کتاب میں پایا گیا ہے ورنہ ہی مابعد کے مورخین نے اس کو محسوس کیا۔ مؤرخ نے نواب صادق چہارم کے دور سے متعلق ہر ایک شعبہ حکومت پر بھرپور انداز میں تبصرہ کیا ہے اور میونسپل بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں، انتظام صفائی صحت عامہ، صیغہ پولیس، ریاستی افواج، قلعہ جات کے انتظام،نظام عدلیہ مع دیوانی اور فوجداری صیغہ جات، محکمہ مال، جیل خانہ جات، صیغہ جات، صیغہ تعمیرات وانہار، محکمہ جنگلات کو علیحدہ علیحدہ تعمیر وترقی کے اعداد و شمار کی شکل میں پیش کیا ہے۔ آخر میں ریاست کی جملہ آمدن وخرچ کے جدول بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس باب کا آخری حصہ نواب صادق چہارم کے وزراء اور ان کے عرصہ وزارت پر معلومات فراہم کرتا ہے(٦٦)۔ کتاب مذکورہ کا باب پنجم نواب صادق چہارم کے اخلاق وعادات شکل و شمائل اور وفات تک کے حالات پر مبنی ہے۔ اس باب کی تحریر میں مورخ نے بڑی چابکدستی سے ایک درباری مورخ کا کردار ادا کیا ہے جس کے مطالعہ سے نواب صادق چہارم کی زندگی کا ایک خاکہ اس کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے روزمرہ کے معمولات، سیر اور شکار کی تقاریب، نشانہ بازی میں مہارت کے واقعات، کتب بینی کا شوق اور اس کے بطور ایک منصف مزاج حکمران ہونے کے شواہد دیئے گئے ہیں۔ مزید ازاں اس کی رعایا پروری اور دور اندیشی کے ثبوت ملتے ہیں اس کتاب میں نواب صادق چہارم کی وفات ١٣ فروری ١٨٩٩ء تک کے تمام واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گویا مصنف کہیں قریب بیٹھا ان سب کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ کتاب کے آخر میں نواب مذکورہ کی وفات پر مصنف کی طرف سے تحریر شدہ نو صفحات پر مشتمل مرثیہ ہے دیگر کتب کے انداز سے برعکس اس کتب کا اختتامیہ بھی لکھا گیا ہے۔ جس میں مؤرخ نے مستقبل میں مزید کتب کی تصنیف کا عزم کیا ہے جس جگہ کتاب کی تاریخ وتکمیل یکم مارچ

۱۹۰۰، درج ہے اور تحریر ہے اسے کتاب محمد ہاشم سے تحریر کرا کے نواب محمد بہاول خاں خامس کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔(٦٧)

صبح صادق کا دوسرا ایڈیشن مصنف نے ۱۹۴۳ء میں عزیز المطابع بہاول پور سے شائع کرایا یہ ایڈیشن اپنے موضوع اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے ایڈیشن ۱۹۰۰ء سے بالکل مختلف خطوط پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کا انتساب نواب صادق نمد خال خامس (۱۹۰۷ تا ۱۹۵۵ :) کے نام سے معنون ہے۔ کیونکہ یہ ایڈیشن اسی نواب کے دور میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے باب اول میں ریاست بہاول پور کے حکمران خاندان کی قدیم تاریخ حضرت عباس سے لے کر سندھ میں عباسیوں کے درد اور امیر محمد مبارک خان کے دور ۱۷۲۷ء کے عرصہ تک تحریر ہے۔ یہ حصہ جو طویل ہے صادق التواریخ کا تمہ معلوم ہوتا ہے البتہ اس حصہ میں جو نئی بات شامل ہے وہ عباسی داؤد پوترہ امیر ان کے فوٹو ہیں جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

باب دوم امیر صادق محمد خال اول ۱۷۲۷ء سے لے کر نواب محمد بہاول خاں رابع (۱۸۶۶ تا ۱۸۹۹ء) کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس باب کو مرتب کرنے کے لیے مصنف نے کتاب مذکورہ کے طبع اول ۱۹۰۰ء سے بھرپور استفادہ کیا ہے لیکن تفصیل کو حذف کر دیا ہے۔

باب سوم میں ہی نواب محمد بہاول خان خامس عباسی (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۷ء) کے واقعات بھی شامل ہیں اور اسی حصہ سے بہاول پور کی وہ نئی تاریخ لکھی گئی ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں میں درج نہیں۔ مصنف چونکہ اب نواب صادق محمد خان خامس کا درباری تھا لہذا مصنف نے درباری ہونے کے ناطے باب چہارم نواب صادق محمد خان خامس کے دور کے لیے وقف کر دیا ہے۔ کتاب کے اختتام میں مؤلف نے اپنے خاندان کے حالات تحریر کیے ہیں اور اپنا مکمل تعارف پیش کیا ہے۔

صبح صادق طبع ثانی بھی موجودہ دور میں لائبریریوں سے مفقود تھی۔لہذا اس ضرورت کے پیش نظر اردو اکیڈمی بہاول پور نے اسے تیسری بار شائع کرایا۔

حوالہ جات

گزیٹر ریاست بہاول پور ۱۹۰۶ء	ص ۳۷۶۔
تاریخ خاندان داد: پوترہ - سردار محمد خان داؤد پوترہ	ص ۳۰۸ تا ۳۲۲۔
گزیٹر بہاول پور	ص ۵۷
سید حسن بخش گردیزی اوراق پریشان، لاہور، ۱۹۰۷ء (مراد شاہ کے حالات زندگی دیکھیے)	
بشیر احمد ظامی مضمون مرگیا مراد شاہ، الزبیر بہاول پور	ص ۱۰۰ تا ۱۰۶
سید مراد شاہ گردیزی، تاریخ مراد (جلد چھارم)	ص ۱۵ تا ۱۸
ایضاً	ص ۱۹ تا ۲۰
ایضاً	ص ۳۲ تا ۳۳۔
ایضاً	ص ۳۴۔
Alecamider Burnes, Personal Naratión of a Jorney.	
تاریخ مراد	ص ۲۰۴۔
ایضاً	ص ۲۰۴ تا ۲۱۰۔
ایضاً	ص ۵۰۔
ایضاً	ص ۵۱۔
ایضاً	ص ۴۹۔
ایضاً	

سیرستان پیر ابراہیم نیٹو پولیٹیکل ایجنٹ بہاول پور نے تحریر کی فارسی زبان کا یہ مخطوطہ شائع ہوا جو بہاول پور کی تمام لائبریریوں سے مفقود ہے۔

تاریخ مراد ص۲۳۔

ایضاً ص۳۱۱تا۳۱۳۔

ایضاً ص۲۱۷۔

ایضاً ص۲۲۲۔

ایضاً ص۳۰۲۔

ایضاً ص۳۰۰۔

ایضاً ص۳۵۱۔

ایضاً ص۲۴۹۔

ایضاً ص۳۹۳۔

ایضاً ص۳۹۶،۴۰۴،۴۰۵۔

ایضاً ص۴۰۷۔

سید مراد شاہ گردیزی، تاریخ مراد (جلد پنجم) ص۲۔

ایضاً ص۲۔

ایضاً ص۲۔

ایضاً ص۱۰تا۱۱۔

ایضاً ص۲۹۔

ایضاً ص۴۴۔

ایضاً	ص۹۵۔
ایضاً	ص۴۰۷۔
سید مراد شاہ گردیزی، تاریخ مراد (جلد پنجم)	ص۲۔
ایضاً	ص۲۔
ایضاً	ص۲۔
ایضاً	ص۱تا۱۱۔
ایضاً	ص۲۹۔
ایضاً	ص۴۴۔
ایضاً	ص۹۵۔
ایضاً	ص۵۰۔
ایضاً	ص۶۳۔
ایضاً	ص۸۵۔
ایضاً	ص۱۰۰۔
ایضاً	ص۱۰۰۔

پروفیسر ڈاکٹر آفتاب حُسین گیلانی

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر

Designed & Printed by: **The University Printing Press, IUB** Ph: +92 62 9255598